اِیمان، یقین اور اِستقامت

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

اِیمان، یقین

اور

اِستقامت

اِیمان، یقین
اور
اِستقامت

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

تصنیف: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ترتیب و تخریج : سبطِ جمال پٹیالوی

نظرِ ثانی : محمد یوسف منہاجین

معاونت : محمد خلیق عامر

زیرِ اہتمام : فریدِ ملّتؒ رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ Research.com.pk

مطبع : منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور

اِشاعت نمبر 1 : دسمبر 2016ء [1,100 - پاکستان]

اِشاعت نمبر 2 : جنوری 2017ء [1,000 - اِنڈیا]

قیمت :

fmri@research.com.pk

بسم الله الرحمن الرحيم

مولاي صل وسلم دائما أبدا

على حبيبك خير الخلق كلهم

محمد سيد الكونين والثقلين

والفريقين من عرب ومن عجم

اللهم صل على سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وصحبه وبارك وسلم

فہرس

باب پنجم:

تجلیاتِ یقین ۲۷۳

پیش لفظ

ایمان کسی بات کو صدقِ دل سے ماننے اور جاننے کا نام ہے۔ جب تسلیم و قبولیت اپنے درجۂ کمال کو پہنچتی ہے تو یقین کی منزل حاصل ہوتی ہے۔ درحقیقت اَہلِ یقین ہی 'حقیقی ایمان والے' کہلانے کے حق دار ہوتے ہیں۔ یقین کے درجے پر فائز شخص کو اس مقام کی حفاظت کے لیے بہت سی مشکلات، مصائب اور امتحانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان لرزا دینے والے حالات میں ڈٹے رہنا ہی اِستقامت کہلاتا ہے۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ حق کا راستہ بہت کٹھن ہوتا ہے اور قدم قدم پر اَہلِ حق کو دل میں اتر جانے والے کانٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ خار ہی اَہلِ حق کا امتحان ہوا کرتے ہیں۔

تاریخِ انسانی بتاتی ہے کہ حق کے راستے پر چلنے والوں نے اپنے اپنے انداز میں کڑے امتحان سے گزر کے منزلِ مقصود کو حاصل کیا ہے۔ اس روش پر چلنے والوں میں کوئی مردِ قلندر آگ کے دریا میں اترتا ہے تو کبھی وہ شیر خوار فرزند اور رفیقۂ حیات کو بے آب و گیاہ دشت میں بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے۔ پھر وہی پسرِ باکمال جب دورِ شباب کو پہنچتا ہے تو اس کے حلقوم پر اپنے ہی ہاتھ سے چھری بھی چلاتا ہے۔ کوئی اَہلِ حق فرعون کے دربار میں ببانگِ دہل پیغامِ حق کہہ سناتا ہے۔ کوئی حق پرست آرے سے کاٹا جاتا ہے تو کوئی حق گوئی کی پاداش میں مصلوب ہونے کی سزا سنتا ہے۔ کوئی صاحبِ نبوت طائف کے میدان میں پتھروں کی بارش میں بھی ستم گروں کو دعاء خیر سے نوازتا ہے تو کوئی صاحبِ اِستقامت غریب الوطنی کے عالم میں تین دن کی بھوک پیاس سے نڈھال صبح سے شام تک اپنے پیاروں کے بہتر (72) لاشے اٹھانے، عفت مآب خواتین کے دائرۂ خطر میں آجانے اور ہزاروں سفاک دشمنوں کے نرغے میں گھر جانے کے بعد بھی سجدہ ریز ہو کر **سُبْحَانَ رَبِّیَ**

الْأَعْلٰی کا نعرۂ مستانہ بلند کرتا ہے۔ یہ صاحبِ یقین افراد کی چند مثالیں ہیں۔ دراصل ایمان، یقین اور استقامت کی تکون ہی دونوں جہانوں میں کامیابی و کامرانی اور سرفرازی کا زینہ ہوتی ہے۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ روزِ اَوّل ہی سے حق، باطل کے سامنے ڈٹا رہا ہے جب کہ باطل مصلحت کی چادر اوڑھ کر آئے روز نئے نئے روپ بدلتا رہتا ہے۔ اس باطلانہ روش کی ابتدا ابلیس سے ہوئی۔ اس لعین نے دنیا میں آکر مختلف بھیس بدلے۔ وہ کبھی قابیل بنا تو کبھی نمرود، کبھی شداد کا روپ دھارا تو کبھی فرعون کا، کبھی ابولہب اور ابوجہل کے لبادے میں دکھائی دیا تو کبھی یزید، ابنِ زیاد اور شمرلعین کی صورت میں دکھائی دیا۔ باطل تو وقت کے ساتھ ساتھ مختلف بھیس بدلتا رہا ہے، مگر حق ہمیشہ سے ایک تھا، ایک ہے اور ایک ہی رہے گا۔ حکیم الامت کہتے ہیں:

حقیقتِ اَبدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

ماضی کی طرح آج بھی فرعونیت اور یزیدیت اپنا سلسلہ پورے زور و شور سے جاری رکھے ہوئے ہے اور دوسری جانب اَہلِ حق اپنے مشن پر کاربند ہوکر حق کا علم بلند کیے ہوئے ہیں۔ آج بھی طاغوت کا دور دورہ ہے اور عصرِ حاضر کے فرعون، نمرود اور یزید مسندِ اقتدار پر براجمان ہوکر اَہلِ حق کو تختۂ مشق بنا رہے ہیں۔

آج اسی عظیم سلسلے کی وارث تحریکِ منہاج القرآن بھی حق گوئی کا علم بلند کیے ہوئے ہے۔ اس تحریک نے اپنے شہداء کے مقدس لہو سے حق کے چراغوں کو روشن کیا ہے۔ اس تاریخی اور آفاقی تحریک نے 23 دسمبر 2012ء سے مرحلۂ انقلاب کا آغاز کیا۔ مینارِ پاکستان کی آغوش میں تاریخِ پاکستان کا یہ سب سے بڑا جلسہ حق کی للکار بن کر باطل کے ایوانوں میں سراسیمگی پھیلا گیا۔ جنوری 2013ء کے دوسرے ہفتے میں شدید سردی میں اسلام

آباد میں دیا گیا پانچ روزہ دھرنا وطنِ عزیز کے ظالمانہ سیاسی نظام کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑا گیا۔ آئین و قانون کا دیا گیا سیاسی شعور ہو یا مئی 2013ء کے ملک گیر دھرنے ہوں یا ٹھیک ایک سال بعد ملک بھر کے 60 سے زائد شہروں میں دیے گئے انقلابی دھرنے؛ ان سب کاوشوں کو دیکھتے ہوئے یزیدِ وقت کو اپنا دھڑن تختہ ہوتا دکھائی دیا تو اس نے ماڈل ٹاؤن لاہور کو کربلاے ثانی بنا ڈالا۔ دھرتی کو 14 بے گناہ افراد کے خون سے سرخ کر ڈالا، 90 سے زائد اَہلِ حق کے جسموں کو گولیوں سے بھون ڈالا اور ہزاروں افراد کو پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ ظلم و استبداد کا یہ سلسلہ یہیں نہ رکا بلکہ 10 اگست 2014ء کو یومِ شہداء اور بعد ازاں پنجاب بھر میں شہادتوں، گرفتاریوں، محاصروں اور اشیاء خورد و نوش کی بندش کے باوجود لاکھوں انقلابیوں کا اسلام آباد پہنچنا اور وہاں انتہائی تنگی، بنیادی ضرورتوں کے فقدان، اندھا دھند فائرنگ، زائد المیعاد آنسو گیس کی شیلنگ نے ان کے حوصلوں کو آزمایا۔ ظلم و استبداد کا وہ کون سا حربہ تھا جو طاغوت نے اِستعمال نہیں کیا؟ لیکن انقلابیوں نے کسی بھی مشکل کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایمان، یقین اور استقامت کی قوت سے آزمائشوں کو اس شان سے عبور کیا کہ اپنا ہو یا پرایا یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ ان جیسے استقامت کے پیکر کارکن کسی بھی جماعت کو میسر نہیں ہیں۔ ان عظیم انقلابیوں کی آفاقی استقامت کو دیکھ کر بدعنوان سیاسی نظام کے ہر مفادی کو اپنی بساط لپٹتی دکھائی دی تو سب ایک ہوگئے اور ظالمانہ نظام کو بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

مادی حقائق اَہلِ حق کے حق میں نہ نکلے۔ اَہلِ حق نے زمینی حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حکمتِ عملی تبدیل کی اور اپنی منزل کا سفر جاری رکھا۔ اَہلِ دل بخوبی جانتے ہیں کہ حکمتِ عملی کی تبدیلی مقصد سے انحراف نہیں ہوتی۔ ان کا قافلہ کبھی رُکتا نہیں، وہ زیر و بم کے ساتھ اپنی منزل کی جانب بڑھتا رہتا ہے۔ بالآخر اَہلِ حق ایمان، یقین اور استقامت کے نسخۂ کیمیا کے ذریعے اپنی منزلِ مقصود کو پا لیتے ہیں۔ یہی پیغام اس تصنیف کا ہے کہ حالات جیسے بھی ہوں، انقلابیوں کو مایوسی کا شکار ہو کر اپنی قوت کو بکھرنے نہیں دینا چاہیے بلکہ ایمان،

یقین اور استقامت کی مدد سے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔ بالآخر فتح حق کی ہوتی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب سرزمینِ پاک پر مصطفوی پھریرا لہرائے گا اور چار دانگِ عالم اِس مشن کا آفتاب جگمگا رہا ہوگا۔ (اِن شاء اللہ عزوجل۔)

خادم العلم والسنۃ

(محمد طاہر القادری)

یکم دسمبر 2016ء

بابِ اوّل

اِیمان، یقین اور صبر کا باہمی تعلق

اَہلِ ایمان کے لیے لازم ہے کہ ایمان، استقامت اور توکل و یقین کو اپنے دل و دماغ میں مکمل طور پر جاگزیں کرتے ہوئے قرآن مجید، سیرتِ نبوی، سیرتِ صحابہ، سیرتِ ائمہ اَطہار اور سیرتِ اَولیاء و صالحین سے رہنمائی حاصل کریں۔ ان کے کردار سے روشنی لیتے ہوئے اپنے تصورات اور خیالات کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ اِصلاحِ اَحوال و کردار کے اس عمل کے دوران ایک معیار ذہن میں رکھ لیں کہ درست وہ نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں بلکہ درست وہ ہے جو قرآن حکیم ہمیں بتلاتا ہے۔ انسان کا گمان سچائی جانچنے کا پیمانہ نہیں ہے۔ اگر حقیقت کو جانچنے کا یہ پیمانہ بن جائے کہ بندہ جو سوچتا ہے وہی درست ہے تو ایسے ہزارہا سچ منظر عام پر آجائیں گے جو ایک دوسرے سے متصادم دکھائی دیں گے۔

ہر آدمی کی سوچ الگ ہوتی ہے لہٰذا وہ اپنے مطابق ہی ہر چیز کو غلط اور درست قرار دیتا ہے۔ جب ہر شخص کسی چیز کو اپنے اپنے انداز سے سوچے گا تو یقیناً دوسروں کے ساتھ کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور کرے گا۔ کسی کی سمجھ میں یہ آدھا درست ہوگا اور آدھا غلط، کوئی اسے مکمل طور پر غلط قرار دے گا۔ تیسرے بندے نے جب اسی چیز کے بارے میں سوچا تو اس کے ہاں درستگی اور نادرستگی، صحیح اور غلط کوئی اور چیز ہو گی جبکہ چوتھے شخص کے ہاں صحیح اور غلط کا کوئی اور پیمانہ ہو گا۔ الغرض اگر اسی روش کو جاری رکھیں تو universal truth یعنی آفاقی اور کائناتی سچائی بھی حقیقت نہ رہے گی۔ گویا اگر ہم ہر بندے کو اس کی سوچ پر چھوڑ دیں تو پھر ہم کبھی کامل سچ تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔

سچ کیا ہے؟ جھوٹ کیا ہے؟ حق کیا اور باطل کیا ہے؟ ہزارہا سال پہلے سے فلسفی یہ سوچتے چلے آئے ہیں اور اپنی اپنی تعریف بیان کرتے چلے گئے۔ ہر مفکر کا اپنا فلسفہ اور اپنی سوچ تھی۔ ہر دوسرا عاقل پہلے کی کہی ہوئی بات سے اختلاف کرتا تھا۔ اس کے بعد اگلا فلسفی کچھ اور

سوچتا اور اپنے پیش رو سے اختلاف کرتا۔ دنیا بھر کی کتابیں ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ سقراط، بقراط، افلاطون اور ارسطو الغرض بڑے بڑے فلسفی، حکماء، عقلا، زعماء اور علماء آئے۔ ایسے دانش وَر اور فلاسفر کسی ایک طبقہ یا مذہب کے نہ تھے، بلکہ ایسے لوگ یہود و نصاریٰ، دیگر انبیاء کے پیروکاروں، کفار اور مشرکین اور سرے سے مذہب کا انکار کرنے والوں میں سے بھی آئے۔ گویا ہر دور میں مختلف اقوام اور ملل میں دانا وعقلمند آتے رہے اور اپنے اپنے نظریے کے مطابق حق و سچ کی پہچان کراتے رہے۔ ہر کوئی اپنا پیمانہ دیتا رہا اور ہر بعد کے زمانے کے حکماء اس سے اختلاف کرتے رہے۔

۱۔ کلامِ ربانی حق اور سچ کا پیمانہ ہے

اس صورتِ حال میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بالآخر سچ کا فیصلہ کیسے ہو؟ سچ جاننے کے لیے سب سے پہلے ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہماری ساری سوچیں محدود ہیں، کیونکہ ہم خود ایک محدود وجود رکھتے ہیں۔ محدود دماغ اور اس کی محدود سوچ جس نتیجے پر بھی پہنچے گی وہ بھی محدود ہی ہوگا۔ انسان محدود چیز کو دیکھتا ہے اور لامحدود پر اس کی نظر نہیں ہوتی لہٰذا وہ جو نتیجہ نکالتا اور فیصلہ کرتا ہے وہ بھی محدود ہی ہوتا ہے۔ سچائی ہمیشہ لامحدود ہوتی ہے۔ جب انسان کی سوچیں اصل سچ تک پہنچنے سے عاجز ہیں تو اللہ رب العزت نے خاص کرم فرماتے ہوئے انسانوں کو اصل سچ تک رسائی عطا فرمائی۔ اصل سچ وہ ہے جو وحی کی صورت میں اس نے اپنے پیغمبروں پر اُتارا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں وحی بھیجی جس سے لوگوں کی محدود سوچوں کے بت پاش پاش ہو گئے اور انہیں وحی سے ہدایت ملی، تاآنکہ حضور نبی اکرم ﷺ اس دنیا میں تشریف لے آئے اور قرآن مجید نازل ہوا، جسے اللہ تعالیٰ نے **الحق المبین** قرار دیا کہ یہ اصل اور روشن حق ہے۔ اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے قرآنِ مجید کے آغاز ہی میں فرما دیا گیا:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ج فِیْهِ ج هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ○[۱]

(۱) البقرة، ۲:۲

(یہ) وہ عظیم کتاب ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، (یہ) پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے○

کلامِ الٰہی نے واضح فرما دیا: اے انسان! جو کچھ تم سوچتے تھے اس میں شک کی گنجائش اور غلطی کے امکانات تھے۔ اب اُم الکتاب قرآن کی صورت میں جو تم پر اتارا ہے، اس کے حق ہونے میں کسی شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ قرآن مجید کے اس اعلان کی قبولیت و عدمِ قبولیت کے لحاظ سے انسانوں کے تین طبقات وجود میں آ گئے:

۱۔ مومن

۲۔ منافق

۳۔ کافر

جنہوں نے قرآن مجید کے اس دعویٰ کو قبول کر لیا کہ اصل سچ وہ ہے جو قرآن بتاتا ہے اور قرآن کے حق و سچ ہونے میں شک کی سرے سے گنجائش ہی نہیں ہے، وہ مومن ہوگئے۔ انہوں نے اپنے دماغوں، سوچوں، فیصلوں، فکر اور نتائجِ فکر کو جب قرآن سے متصادم پایا تو ذہنی استعداد سے دستبردار (surrender) ہوگئے اور کہا کہ قرآن سچ ہے۔ قرآن جو بات کہتا ہے بھلے ہماری طبیعتیں اسے قبول کرتی تھیں یا نہیں، ہماری سوچ وہ تھی یا نہیں، ہمارے اندازے وہ تھے یا نہیں مگر جو قرآن نے کہہ دیا وہی حق اور سچ ہے۔ لہٰذا اپنی ہر سوچ کو قرآن مجید کے بیان اور اللہ کے نبی ﷺ کے فرمان کے سامنے ختم (surrender) کر دینے والے مومن کہلائے۔

ایک طبقہ وہ تھا جو متشکک ہوا کہ شاید اس قرآن میں کچھ سچائی ہے اور اس کے برعکس کچھ سچائی ہماری سوچوں میں بھی ہے۔ لہٰذا کچھ باتیں قرآن کی مانیں اور کچھ اپنی سوچ کی مانیں۔ ایسی سوچ رکھنے والے تمام لوگ منافق ہو گئے۔ یہ لوگ اپنی سوچ اور قرآن کے بیان، اپنے زعم و فکر اور اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان کے درمیان شک و شبہ کا شکار ہوگئے۔ وہ ایک جگہ جم نہ سکے، کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر متزلزل رہے۔

ان دونوں طبقات کے متضاد کچھ لوگ اس بات پر بضد رہے کہ قرآن کی بات کو ہم مطلق سچائی نہیں مانتے بلکہ جو ہماری سوچوں میں آتا ہے وہی درست ہے، ایسا کرنے والے کافر ٹھہرے۔ یہ لوگ اپنی بات پر ڈٹ گئے اور قرآن کے صریحاً منکر ہو گئے۔

گویا ماننے، متزلزل رہنے اور نہ ماننے کے لحاظ سے ایمان، نفاق اور کفر تین حالتیں سامنے آئیں۔ مسلمان کی عافیت نہ انکار میں ہے اور نہ شک و تردد میں ہے، بلکہ ایمان میں پورے کے پورے داخل ہو جانے میں ہے۔ انکار اور شک و تردّد تو شیطانی و نفسانی اَعمال میں سے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو یہ حکم فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ط اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝[1]

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے راستوں پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے ۝

لہٰذا قرآن مجید کی بات پر جم جانا، اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان پر ڈٹ جانا اور اس قدر مستحکم ہو جانا کہ بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر طبیعت کہے کہ حق یہی ہے؛ اسی کیفیت کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲۔ حق تک رسائی کی شرائط

قرآن مجید میں سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات دراصل وہ شرائط ہیں جو مالکِ لوح وقلم نے اپنی بات بتانے سے پہلے بیان فرمائیں کہ اگر میری تعلیمات پر کماحقہٗ عمل پیرا ہونا چاہتے ہو تو اِن شرائط اور تقاضوں کو بجا لاؤ۔ اِسی صورتِ حال میں حق، سچ اور ہدایت تک تمہاری رسائی ممکن ہو سکے گی۔

(۱) البقرة، ۲:۲۰۸

(۱) قرآن حکیم کو شک سے پاک گردانا

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ج فِیْہِ.(۱)

(یہ) وہ عظیم کتاب ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔

آیتِ مبارکہ کے اس حصے میں حق تک رسائی کی پہلی شرط کو بیان کیا جا رہا ہے کہ مومن اس بات پر لازمی ایمان رکھے کہ قرآن کی بتائی کسی بات میں کوئی شک نہیں ہے۔ ہر شخص کی کہی ہوئی بات میں کمی بیشی ہوسکتی ہے، اس لیے کہ وہ حالات کے تناظر میں اپنی عقل، شعور، فہم، بصیرت اور حکمت کی روشنی میں اپنے اندازے مرتب کرے گا، پیشین گوئی کرے گا اور اللہ کی دی ہوئی صلاحیت سے جائزہ (assess) لے کر کوئی بات کہے گا، مگر قرآن وہ کتاب ہے جو اندازے اور تجزیے (assessment) نہیں دیتی۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ بھی اپنے اندازے اور تجزیے (assessment) سے بات نہیں کرتے بلکہ وہ صرف وحی سے بات کرتے ہیں۔ ان کا ہر حکم اور ہر بات وحی الٰہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰیo اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰیo(۲)

اور وہ (اپنی) خواہش سے کلام نہیں کرتےo اُن کا ارشاد سَراسَر وحی ہوتا ہے جو انہیں کی جاتی ہےo

جب یہ بات دل و جان سے مان لی جائے کہ قرآن کی بتائی کسی بات میں کوئی شک نہیں تو پھر قرآن سے ہدایت کا نور ہر ایک مومن کا مقدر بن جاتا ہے۔

(۱) البقرۃ، ۲:۲

(۲) النجم، ۵۳: ۳-۴

(۲) قرآن حکیم کو کتابِ ہدایت ماننا

مذکورہ آیتِ مبارکہ میں ہی آگے ارشاد ہوتا ہے:

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ○[1]

(یہ) پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے○

حق و سچ تک رسائی کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ ہر مومن کا اس پر کامل ایمان ہونا چاہیے کہ کلامِ الٰہی کتابِ ہدایت ہے۔ ہدایت سے مراد روشنی دینا ہے۔ اگر کوئی شخص جہالت کے اندھیرے میں بھٹک رہا ہے تو یہ قرآن اسے ہدایت کی روشنی دیتا ہے۔ کوئی متذبذب ہے تو اسے بے چینی سے نکال کر واضح منزل، حق کے شعور اور سچائی کی طرف لے جاتا ہے۔ تردد و شک سے نکال کر یقین کی طرف گامزن کرتا ہے۔ اگر کوئی غیر مطمئن ہے تو یہ قرآن اُسے اطمینان کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر ذہن میں اُلجھن ہے، دل میں مایوسی ہے تو یہ قرآن اُسے اُلجھن و مایوسی سے نکال کر واضح نتیجے تک پہنچاتا ہے۔ قنوطیت کے اندھیرے سے نکال کر یہ قرآن اُسے امید و یقین کے اُجالوں میں لے جاتا ہے۔

ہدایت کا معنیٰ یہ نہیں ہے کہ یہ قرآن صرف نماز پڑھنا، زکوٰۃ ادا کرنا، روزہ رکھنا اور حج کرنا بتاتا ہے۔ نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن بندے کو تذبذب کی کیفیت سے نکال کر یقین کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ بندے کی سمجھ میں بات نہیں آرہی تھی کہ 'یہ کیا ہے؟'، 'یہ کیا ہوا؟'، 'یہ کیسے ہوگا؟'، 'میں کیا کروں؟'، 'یہ میرے ساتھ کیا بنا؟'۔ المختصر انسان زندگی کے ہزارہا مسائل میں پریشان ہو جاتا ہے، اُسے سمجھ نہیں آتی کہ کیا کروں؟ اس بے بسی و عاجزی کی کیفیت میں قرآن اُسے ایک طرف تذبذب، تردد اور اندھیرے سے نکال کر یقین کی منزل تک پہنچاتا ہے اور دوسری طرف اُسے مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوبنے کی کیفیت سے نکال کر فولاد کی طرح طاقت ور کر دیتا ہے۔

---

(۱) البقرة، ۲:۲

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص متقی بن کر قرآن کی بات پر یقین کر لے کہ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو اسے اپنی سوچوں اور شعور کو خیر باد کہنا ہوگا، یہ بات دل و دماغ میں راسخ کرنا ہوگی کہ ہماری انفرادی و اجتماعی سوچ میں غلطی ہوسکتی ہے، مگر قرآن اور اللہ کے پیغمبر ﷺ سے قطعاً غلطی نہیں ہوسکتی۔ صحابہ کرام ﷺ سے لے کر نیچے تک کوئی بھی غلطی سے پاک نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں نہ کوئی صحابی غلطی سے مبرا ہے اور نہ ہی کوئی ولی، غوث، قطب اور ابدال غلطی سے پاک ہے۔ اسی طرح عام آدمی، فلسفی اور ڈاکٹر کوئی بھی غلطی سے پاک نہیں ہے۔ ہر ایک شخص کی سوچ اور عمل میں غلطی کا امکان پایا جاتا ہے۔

کائنات میں صرف ایک ہستی ہے جو غلطی سے پاک ہیں اور وہ نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے۔ اسی طرح غلطی سے مبرا ایک ہی کتاب ہے اور وہ قرآنِ مجید ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی بات میں غلطی نہیں تو اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، وہ عین حق ہے۔

کلامِ رسول ﷺ وحیِ الٰہی ہے

ایک عام ذہن میں سوال اُبھرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بات میں غلطی کیوں نہیں ہوتی؟ اللہ تعالیٰ نے اس 'کیوں' کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى○(۱)

اور وہ (اپنی) خواہش سے کلام نہیں کرتے○ اُن کا ارشاد سَراسَر وحی ہوتا ہے جو انہیں کی جاتی ہے○

رسول اللہ ﷺ اپنی دانست اور اپنی خواہشِ نفس سے کلام نہیں فرماتے جبکہ بندے کی ذاتی عقل، دماغ کی تخلیق، خواہشِ نفس اور ذاتی فہم و سوچ سب کچھ ھَوٰی میں آتا ہے اور یہ تمام تخلیقِ عقل ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں سوالات کی بجائے خاموش بیٹھ کر ان

---

(۱) النجم، ۵۳: ۳-۴

کی زیارت کرنے کا حکم دیا گیا کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ کے لب ہلیں، سمجھو کہ اب وحی آ رہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ جو ارشاد فرمائیں، سمجھو کہ یہ ارشادِ الٰہی ہے کیونکہ خاتم المرسلین ﷺ، اللہ کے اذن کے بغیر کلام ہی نہیں کرتے۔ ہادیِ برحق ﷺ اللہ کی ہدایت کے بغیر اُمت کو کچھ نہیں سمجھاتے۔ امام الانبیا ﷺ جب کلام کرتے ہیں تو وہ اللہ کا بیان ہوتا ہے۔ انہی خصوصیات کی بدولت رسولِ مکرم ﷺ کے کسی کلام میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ اہلِ یقین لوگوں کو ہی قرآن ہدایت دیتا ہے۔ اگر تردد اور شک و شبہ رہ گیا تو یقیناً وہ ہدایت سے محروم ہو جائیں گے۔ اسی لیے جب تک یقین کی دولت نصیب نہیں ہو جاتی اُس وقت تک جدوجہد جاری رکھنے کا حکم ہے۔ یہ یقین اور پختہ ہدایت صرف اور صرف اللہ کے نبی ﷺ کے فرمان اور قرآن ہی سے میسر آتی ہے۔

(۳) بِن دیکھے ایمان لانا

اللہ رب العزت نے ایمان کی صحیح کیفیات سے بہرہ مند ہونے اور حق و سچ تک رسائی کے لیے تیسری شرط **یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ** کے ذریعے واضح فرمائی کہ متقین وہ ہیں جو خالقِ دو جہاں کی کہی ہوئی بات کو بغیر دیکھے مان لیتے ہیں۔

الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ. (۱)

جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

یعنی خواہ ان کی سمجھ میں نہ بھی آئے تب بھی وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں کیونکہ **بِالْغَیْبِ** کا مطلب بغیر دیکھے، بغیر سوچے اور بغیر سمجھے بھی ہے۔ ایسی کیفیت کے حاملین کو متقین کہا گیا ہے۔

قرآن مجید نے اِن تین شرائط کو بیان کرنے کے بعد احکامات یعنی نماز کا قیام، انفاق فی سبیل اللہ اور آخرت پر ایمان کا مضمون شروع کیا ہے۔ قرآن مجید میں تعلیم سے پہلے یقین قائم کروایا گیا ہے۔ نماز اور دیگر عبادات کی بات شروع کرنے سے پہلے واضح فرما دیا کہ

---

(۱) البقرة، ۲:۳

جب تک مذکورہ تین باتیں پیدا نہ ہوں، اس وقت تک تمہیں نماز کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی۔ گویا قرآن مجید نے دوٹوک واضح انداز میں ہمارے ساتھ ایک سودا کیا ہے کہ اگر تم یقین قائم کرتے ہو تو مجھ سے تعلیم حاصل کر سکو گے۔ شک کی جڑ کاٹ کر اس بات کا یقین جما لو کہ ہدایت اسی قرآن سے ہے۔ یہ قرآن یقین کرنے اور ماننے والوں کو ہدایت دیتا ہے خواہ وہ معاملہ اُن کی سمجھ میں نہ آئے اور نہ ہی اُنہیں دکھائی دے۔ یقین کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ارشادِ نبوی ہے:

تَعَلَّمُوا الْيَقِيْنَ كَمَا تَعَلَّمُوا الْقُرْآنَ. (۱)

یقین کو اسی طرح سیکھا کرو جس طرح قرآن سیکھتے ہو۔

اگر یقینِ کامل ہوگا تو پھر اس قرآن سے تعلیم میسر آئے گی، بصورتِ دیگر شک میں رہنے سے نماز کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم جس پاک ذات کے حضور سجدہ ریز ہو کر نماز پڑھ رہے ہیں، اسے تو نہ ہم نے دیکھا، نہ ہمارے ماں باپ نے دیکھا، اور نہ ہی ہمارے آباؤ اجداد میں سے کسی نے دیکھا۔ حتیٰ کہ اللہ رب العزت کو صحابہ کرام ﷺ میں سے بھی کسی نے نہیں دیکھا، نہ ہی ان کے اگلوں نے دیکھا اور نہ ہی ان کے بعد والوں نے دیکھا، مگر ہر کوئی 'حق، حق' کا نعرۂ مستانہ بلند کرتا رہا۔ جب ہم یقینِ کامل کی اس روش اور معیار کو اپنائیں گے تو پھر قرآن کی ہدایت اور رحمت ہمارا مقدر قرار پائے گی۔

۳۔ ایمان و یقین کی دولت کا حصول کیوں کر ممکن ہے؟

گزشتہ بحث سے معلوم ہوا کہ جب شک کی جڑ کٹ جائے اور یقین کا درخت توانا ہو کر ایسا مضبوط و مستحکم ہو جائے کہ اسے کوئی ہلا نہ سکے تو ایمان کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ ہمیں صحابہ کرام ﷺ کی زندگیوں میں جا بجا ایسے واقعات ملتے ہیں جو اُن کے صاحبِ یقین

(۱) ۱۔ أبو نعيم، حلية الأولياء وطبقات الأصفياء، ۶:۹۵
۲۔ ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۱۶:۱۹۸
۳۔ هندي، كنز العمال، ۳:۱۷۷، رقم:۷۳۳۷

ہونے کا مظہر ہیں۔

۱۔ امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ معراج سے واپس آئے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سفرِ معراج کی روداد معلوم ہوئی کہ آپ ﷺ آج رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ اور پھر مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ اور آگے مقامِ قاب قوسین تک تشریف لے گئے ہیں۔ کفار و مشرکین کو سدرۃ المنتہیٰ اور قاب قوسین کی بات تو سمجھ میں نہ آئی البتہ وہ فلسطین، القدس اور مسجد اقصیٰ کو جانتے تھے۔ اُنہوں نے اس ایک بات کو لے کر طوفان کھڑا کر دیا کہ (معاذ اللہ) محمد ﷺ کا دعویٰ جھوٹا ہے، اس لیے کہ ایک ہی رات میں فلسطین القدس تک جانا اور پھر واپس آنا ممکن ہی نہیں۔ ابو جہل، ابو لہب، ابو سفیان اور دیگر کفار و مشرکین نے علی الصبح سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ باہر نکلے، پوچھا: علی الصبح یہ کیا ہنگامہ برپا ہے؟ مشرکینِ مکہ نے کہا: تمہارے صاحب جن پر تم ایمان لائے ہو، انہوں نے کہا ہے کہ میں رات کے قلیل حصے میں مسجدِ حرام سے مسجد اقصیٰ گیا ہوں اور وہاں سے ہو کر واپس بھی آ گیا ہوں۔ کیا تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو؟

سیدنا صدیق اکبر چونکہ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کی عملی تصویر تھے۔ لٰہذا کفار و مشرکین مکہ کے اس سوال نے انہیں تعجب میں مبتلا نہ کیا۔ وہ مسکرائے اور فرمایا: تم تو بہت چھوٹی بات لائے ہو۔ کہتے ہو کہ کیا عقل مانتی ہے کہ رات کے چند لمحوں میں کوئی مکہ سے مسجد اقصیٰ جائے اور واپس آ جائے۔ تم اتنی سی بات پر تعجب کرتے ہو؟ میں تو بن دیکھے اور بغیر عقل کے قبول کیے اس رسولِ مکرم ﷺ کی زبان سے سن کر اس سے بھی بڑی بات مان چکا ہوں۔ وہ یہ کہ صبح و شام وہ کہتے ہیں کہ میرے رب نے میرے پاس وحی بھیجی ہے، میں نے آج تک نہ وحی لانے والے کو دیکھا ہے اور نہ وحی بھیجنے والے کو دیکھا ہے۔ میں بن دیکھے وحی بھیجنے والے کو اپنا رب مان گیا ہوں۔ اس حقیقت کے سامنے تو مسجد اقصیٰ چار قدم پر کھڑی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ اتنی بڑی حقیقت کے ماننے والے کے سامنے تم کیسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا سوال کرتے ہو؟ وہ سب واپس چلے گئے اور کہنے لگے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے یقین کو کوئی متزلزل نہیں کر سکتا۔

اس دن تک تو ان کا نام عبد اللہ بن ابی قحافہ اور کنیت ابوبکر ﷺ تھی۔ یہ خبر جب ہادیِ برحق ﷺ کے گوش گزار ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ابوبکر! آج سے تم صدیق ہو۔ یعنی بن دیکھے بڑی بات کی تصدیق کرنے والے۔

امام حاکم اور امام بیہقی نے اُم المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ ﷺ سے اس روایت کو یوں بیان ہے:

لَمَّا أُسْرِیَ بِالنَّبِيِّ ﷺ إِلَی الْمَسْجِدِ الْأَقْصٰی أَصْبَحَ یَتَحَدَّثُ النَّاسُ بِذٰلِکَ، فَارْتَدَّ نَاسٌ فَمَنْ کَانَ آمَنُوا بِهِ وَصَدَّقُوهُ، وَسَمِعُوا بِذٰلِکَ إِلٰی أَبِي بَکْرٍ ﷺ، فَقَالُوا: هَلْ لَکَ إِلٰی صَاحِبِکَ یَزْعُمُ أَنَّهُ أُسْرِيَ بِهِ اللَّیْلَةَ إِلٰی بَیْتِ الْمَقْدِسِ؟ قَالَ: أَوَ قَالَ ذٰلِکَ؟ قَالُوا: نَعَمْ. قَالَ: لَئِنْ کَانَ قَالَ ذٰلِکَ لَقَدْ صَدَقَ. قَالُوا: أَوَ تُصَدِّقُهُ أَنَّهُ ذَهَبَ اللَّیْلَةَ إِلٰی بَیْتِ الْمَقْدِسِ وَجَاءَ قَبْلَ أَنْ یُصْبِحَ؟ قَالَ: نَعَمْ، إِنِّی لَأُصَدِّقُهُ فِیْمَا هُوَ أَبْعَدُ مِنْ ذٰلِکَ، أُصَدِّقُهُ بِخَبَرِ السَّمَاءِ فِي غَدْوَةٍ أَوْ رَوْحَةٍ. فَلِذٰلِکَ سُمِيَّ أَبُو بَکْرٍ الصِّدِّیْقُ. (۱)

جس رات حضور نبی اکرم ﷺ کو مسجد اقصی سے ہوتے ہوئے سفرِ معراج کرایا گیا، اُس دن صبح سویرے ہی لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کردیں۔ کفار و مشرکین نے اس واقعہ کا انکار کیا اور جن لوگوں نے اس واقعہ کو سچا مان لیا ان کا بھی انکار کیا۔ مشرکین اس واقعہ کو سن کر سیدنا ابوبکر صدیق ﷺ کے پاس گئے اور ان سے کہا: تمہارا اپنے نبی کے بارے میں کیا خیال ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ انہیں ایک رات کے

---

(۱) ۱۔ حاکم، المستدرک علی الصحیحین، ۳: ۶۵، ۸۱، رقم: ۴۴۰۷، ۴۴۵۸

۲۔ بیہقي، دلائل النبوۃ، ۲: ۳۶۱

۳۔ طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، ۱۵: ۶

قلیل عرصہ میں بیت المقدس تک لے جایا گیا۔ حضرت ابوبکر ﷛ نے ان سے استفسار کیا کہ کیا واقعی آپ ﷺ نے ایسا فرمایا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! اس پر سیدنا صدیق اکبر ﷛ گویا ہوئے: اگر انہوں نے ایسا فرمایا ہے تو بالکل سچ ہے۔ مشرکین نے متعجب ہوکر پوچھا: کیا اس بات کی تصدیق کرتے ہو کہ وہ ایک رات میں بیت المقدس تک گئے اور پھر طلوعِ صبح سے پہلے واپس آ گئے؟ حضرت ابوبکر صدیق ﷛ نے تصدیق کی کہ ہاں! میں نے تو اس سے بھی بڑی حقیقت کی تصدیق کی ہے کہ وہ صبح وشام (ہمارے پاس) آسمان کی خبریں لاتے ہیں۔ اِسی وجہ سے ابوبکر اس دن سے صدیق ﷛ بن گئے۔

اس روایت سے یہ حقیقت مترشح ہوئی کہ جو لوگ بن دیکھے مانتے ہیں، شک کی جڑ کو کاٹتے ہیں اور سمجھ میں نہ آئے تب بھی یقین رکھتے ہیں، وہی کامل ایمان والے کہلاتے ہیں۔

شک کی گرد سے اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے والوں کو قرآن نے بھی ’صادقین‘ کی صف میں شامل کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَo[1]

ایمان والے تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لائے، پھر شک میں نہ پڑے اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کرتے رہے، یہی وہ لوگ ہیں جو (دعوائے ایمان میں) سچّے ہیںo

۲۔ اسی یقینِ محکم کی بدولت صحابہ کرام ﷡ اپنے قریبی رشتہ داروں سے ٹکرا گئے اور انہیں بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت ابوعبیدہ بن جراح ﷛ نے اپنے باپ کو قتل کیا۔ حضرت مصعب بن عمیر ﷛ نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا۔ حضرت عمر ﷛ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام بن مغیرہ کو قتل کیا۔ حضرت ابوبکر ﷛ اپنے بیٹے عبد

(۱) الحجرات، ۴۹:۱۵

الرحمٰن سے براہِ راست لڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔ حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن الحارث ﷡ نے اپنے قریبی رشتہ داروں عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ کو قتل کیا۔ [1]

۳۔ سیدنا صدیق اکبر ﷛ کے بیٹے عبد الرحمٰن مسلمان ہونے سے قبل غزوۂ بدر میں کفار کی جانب سے شریک تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ایک روز اپنے والد گرامی سے عرض کیا:

لَقَدْ أَهْدَفْتَ لِي يَوْمَ بَدْرٍ، فَصَرَفْتُ عَنْکَ وَلَمْ أَقْتُلْکَ.

ابا جان! بدر کی جنگ کے دن آپ میری تلوار کی زد میں تھے، لیکن میں نے باپ سمجھ کر آپ کو قتل کرنے سے گریز کیا۔

اس پر سیدنا صدیق اکبر ﷛ نے فرمایا:

لٰکِنَّکَ لَوْ أَهْدَفْتَ لِي، لَمْ أَنْصَرِفْ عَنْکَ. [2]

(بیٹے وہ تم تھے کہ تمہیں موقع بھی ملا مگر میرا سر نہیں اڑایا۔) اگر تمہاری گردن میری تلوار کی زد میں آتی تو میں بیٹا سمجھ کر تمہیں ہرگز نہ چھوڑتا (بلکہ تمہاری گردن اڑا دیتا)۔

گویا صحابہ کرام ﷡ نے ظلم و بربریت کے خاتمے، تکریم اِنسانیت اور قیامِ اَمن کی خاطر اپنی اولاد تک کو اللہ رب العزت کی رضا اور اَحکامات کے لیے قربان کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

(۱) ابن كثير، تفسير القرآن العظيم، ۴: ۳۳۰

(۲) ۱۔ حكيم ترمذي، نوادر الأصول في أحاديث الرسول، ۲: ۹۵

۲۔ الدينوري، المجالسة وجواهر العلم: ۱۸۹

۳۔ ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۳۰: ۱۲۸

۴۔ سيوطي، تاريخ الخلفاء: ۳۶

۴۔ اِنقلاب پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جاوداں اِستقامت

تاریخِ اِسلام گواہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم 'کب'، 'کیوں' اور 'کیسے' جیسے الفاظ اپنی زبان پر نہ لاتے تھے۔ وہ کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ منزل نظر آ رہی ہے یا نظروں سے اُوجھل ہے، وہ جلد ملے گی یا بدیر، ملے گی بھی کہ نہیں؟ اگر ملے گی تو کب اور کیسے ملے گی؟ ہم اب تک منزل کی جد و جہد میں کہاں تک پہنچے ہیں اور ہمارا کتنا سفر باقی رہ گیا ہے؟ اَصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کے ہاں ایسا کوئی معاملہ نہ تھا کہ وہ 'کب'، 'کیوں' اور 'کیسے' جیسے الفاظ اپنی زبان پر لاتے۔ اس لیے کہ وہ ایمان کے باب میں یقین کے مقام کو جانتے تھے کہ ایمان کی وادی میں ایسے سوال کرنے والوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں ایمان بالغیب اور یقین ہی کی دولت کام آتی ہے۔ ایسے سوال کرنے والے شک کی گرد سے آلودہ ہوتے ہیں، قرآن ان کے لیے منزل پر پہنچنے کی ضمانت نہیں دیتا۔ میں نے پوری زندگی میں جتنا بھی قرآن و حدیث اور سنت و سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کیا ہے، اس پورے مطالعہ کے دوران آقا علیہ السلام کی جد و جہد میں کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے منسوب یہ جملہ مجھے کہیں نہیں ملا کہ وہ سوال کرتے ہوں کہ انقلاب کب آئے گا اور فتح کب نصیب ہوگی؟ ہم کفار پر غالب کب آئیں گے؟ کب؟ کیوں؟ کیسے؟ اُن کے اذہان میں جنم ہی نہ لیتے، اس لیے کہ عزم و استقامت کے یہ کوہِ گراں ایمان بالغیب کا سودا کر کے چلے تھے۔

یہ امر غور طلب ہے کہ ہماری اور اُن کی حالت میں کتنا فرق ہے؟ دینِ اسلام کے لیے آئے روز قربانیاں دینے کے باوجود اس طرح کے سوالات ان کی زبان پر نہ آتے تھے۔ اُن کا مقام یہ تھا کہ اللہ کے لیے گھر کے گھر لٹا دیتے تھے، اور جب پوچھا جاتا کہ گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ تو عرض کرتے: أَبْقَيْتُ لَهُمُ اللهَ وَرَسُوْلَهُ۔ میں ان کے لیے اللہ اور اُس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھوڑ کر آیا ہوں (باقی سب کچھ اپنے ساتھ لے آیا ہوں)۔[1]

(۱) ۱۔ ترمذی، السنن، كتاب المناقب، باب فی مناقب أبی بكر وعمر رضی اللہ عنہما كليهما، ۶: ۵۲، رقم: ۳۶۷۵

۲۔ أبو داؤد، السنن، كتاب الزكاة، باب الرخصة فی ذلك، ۲: ۱۲۹، رقم: ۱۶۷۸

وہ کانٹوں کے ساتھ لباس جوڑ کر آ جاتے تھے مگر زبان پر شکوہ تک نہ لاتے تھے۔ جب مالک کی طرف سے پیغام آتا کہ ابو بکر! کیا اس فقر میں اپنے رب سے راضی ہو یا ناراض؟ تو صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ آبدیدہ ہو کر عرض کرتے:

أَعَلٰی رَبِّي أَغْضِبُ؟ أَنَا عَنْ رَبِّي رَاضٍ، أَنَا عَنْ رَبِّي رَاضٍ.[1]

کیا میں اپنے رب سے ناراض ہوں گا؟ میں اپنے رب سے راضی ہوں، میں اپنے رب سے راضی ہوں۔

یہ تاریخِ انسانیت کی بے نظیر و بے مثال قربانیاں تھیں۔ اس حد تک قربانیاں دینے اور آزمائش برداشت کرنے کے باوجود ان کا یقین کبھی متزلزل نہ ہوا۔

سیدنا علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کے پاس اتنا مال نہیں تھا کہ ان پر زکوٰۃ فرض ہوتی۔[2] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خوشی خوشی کبھی مال و جان کی قربانیاں، کبھی وطن کی قربانیاں اور کبھی سکھ چین، آرام کی قربانیاں دیتے رہتے تھے مگر کبھی تھک کر یہ سوال نہ پوچھتے تھے: یارسول اللہ! ارشاد فرمائیں کہ اب کتنا سفر باقی رہ گیا ہے اور غلبۂ اسلام کب ہو گا؟ اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا[3] کی نوید کی عملی تعبیر کب ہوگی؟ وہ فتح کب آئے گی؟ غلبۂ حق کب ہوگا؟ مصطفوی انقلاب کب آئے گا؟ آپ نے فرمایا ہے کہ شرق سے غرب تک توحید پرستوں کی حکومت دیکھ رہا ہوں تو تمام سرزمین پر اسلام کا جھنڈا کب لہرائے گا؟ عقلی طور پر دیکھا جائے تو یہ اُن کا حق بنتا تھا کہ وہ پوچھتے: ایسا کب ہوگا؟ اس لیے کہ انہوں نے قربانیوں اور وفاؤں کی انمٹ اور بے مثال داستانیں رقم کی تھیں۔ مگر انہوں نے ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایسے سوال نہ کرنے کا سبب ان کی جاوداں استقامت تھی۔ وہ یہ

---

(۱) ۱۔ أبو نعیم، حلیة الأولیاء، ۷: ۱۰۵
۲۔ بغوی، معالم التنزیل، ۴: ۲۹۵

(۲) رازی، التفسیر الکبیر، ۱۲: ۲۷

(۳) الفتح، ۴۸: ۱

سودا کر کے نہیں چلے تھے کہ انقلاب کب، کیوں اور کیسے آئے گا؟ اُن کا تو ایمان ہی یہ تھا کہ کچھ بھی ہو جائے انقلاب ہر صورت آئے گا۔ وہ یہ بات بھی بخوبی جانتے تھے کہ کیوں آئے گا؟ اس لیے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرما دیا ہے کہ آئے گا، اس لیے ضرور آ کر رہے گا۔ اِس کو ایمان بالغیب کہتے ہیں۔ یہی یقین اور ایمان ہے۔

۵۔ صاحبِ یقین کی عظمت

صحابہ کرام ﷺ میں اپنی جان، مال اور اولاد تک کو قربان کر دینے کا یہ جذبہ اُن کے ایمان بالغیب اور یقینِ محکم کا مظہر تھا کہ وہ بن دیکھے ہی اللہ تعالیٰ پر اپنا سب کچھ قربان کیے ہوئے تھے۔ اللہ رب العزت نے انہی کے بارے میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ. (۱)

بے شک اللہ نے اہلِ ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال، ان کے لیے (وعدۂ) جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔

صحابہ کرام ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے اپنی جان و مال کے بدلے بن دیکھے ایک ایسا سودا کر لیا تھا کہ دنیا جہاں کی دولت اور لالچ اُنہیں ڈگمگا نہ سکتے تھے۔ صحابہ کرام ﷺ کا یقین کبھی متزلزل نہیں ہوتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ جو یقین بن دیکھے پیدا ہو وہی ایمان کہلاتا ہے۔ سیدنا علی المرتضیٰ ﷺ فرماتے ہیں:

نَوْمٌ عَلٰى يَقِيْنٍ خَيْرٌ مِنْ صَلَاةٍ عَلٰى شَكٍّ. (۲)

صاحبِ یقین کی نیند شک والے شخص کی نماز کی ادائیگی سے افضل ہے۔

یعنی تردّد، ریب اور شک کی حالت میں ساری رات کھڑے ہو کر ایک ہزار نوافل پڑھنے والے

(۱) التوبة، ۹: ۱۱۱

(۲) ۱۔ دينوري، المجالسة وجواهر العلم: ۴۹۶، رقم: ۲۹۴۴

۲۔ هندی، كنز العمال، ۳: ۳۲۱، رقم: ۸۸۰۱

سے اس شخص کی رات بہتر ہے جو یقین کی دولت سے مالا مال ہے اور اپنے بستر پر آرام کر رہا ہے۔ اللہ رب العزت نے یقین کی یہ دولت وحی کے ذریعے خاتم الانبیاء و المرسلین ﷺ کے قلب اِطہر اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے دلوں پر اُتاری۔ پھر حضور نبی اکرم ﷺ نے اس یقین کی خیرات کو اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اَہلِ بیت اَطہار رضی اللہ عنہم اور اپنی امت میں تقسیم فرمایا۔ اُمت جب تک اس یقین پر قائم رہے گی، دنیا کی کوئی طاقت اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی، کیونکہ شک والے کسی بھی صورت یقین والوں کے ایمان و یقین کو متزلزل نہیں کر سکتے۔

٦۔ اللہ کی مدد کے حق دار صابرین ہیں

ایمان اور یقین کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے بعد آیئے! اب صبر اور اس کے تقاضوں پر بحث کرتے ہیں کہ صبر کیا ہے؟ کن حالات میں کیا جاتا ہے؟ مومنین کا صبر سے کیا تعلق ہے؟ قرآن مجید میں اللہ رب العزت کبھی يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ (اے لوگو!) کہہ کر روئے زمین پر بسنے والے سارے لوگوں کو خطاب کرتا ہے اور کبھی يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا (اے ایمان والو!) فرما کر ایمان والوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ اِن دونوں خطابات میں فرق ہے۔ جب خالقِ دو جہاں ایمان والوں سے مخاطب ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اے میرے ماننے والو! یہ خاص بات تمہارے لیے ہے۔ جو مجھے مانتے ہیں، وہ قریب آ جائیں یہ بات خصوصاً ان کے لیے ہے۔ کفار، منکرین، منافقین اور شک و تردد والوں کے لیے اور بہت سی باتیں کہنے کی ہیں۔ لہٰذا جنہیں شک اور تردد ہے، میں ان سے یہ بات نہیں کہنا چاہتا۔ وہ خاص بات کیا ہے؟ ارشاد فرمایا:

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ.(۱)

اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے (مجھ سے) مدد چاہا کرو۔

اِس مقام پر اللہ رب العزت صرف اہل ایمان سے مخاطب ہے۔ جو دولتِ ایمان

(۱) البقرة، ۲:۱۵۳

سے محروم ہیں ان سے یہ خطاب نہیں ہے۔ بیان ہونے والی کوئی خاص بات ہے جس کا مخاطب صرف مومنین کو قرار دیا جا رہا ہے، اور وہ خاص بات 'صبر' ہے۔ صبر کیا ہے؟ اس کا مقام و محل کیا ہے؟ صبر کب کیا جاتا ہے؟ صبر اور شکر کے مابین کیا فرق ہے؟ یاد رکھیں! اگر خوشحالی ہو، فراخی ہو، نعمت میسر ہو تو اس پر شکر ہوتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ نہیں فرمایا کہ اے ایمان والو! شکر کے ذریعے مجھ سے مدد چاہو۔ اگر اللہ تعالیٰ شکر کے ذریعے مدد طلب کرنے کی تلقین فرماتا تو بات یوں سمجھ میں آتی: اللہ تعالیٰ یہ سمجھا رہا ہے کہ ایمان والوں کو بہت سی راحتیں اور نعمتیں ملیں گی، مال کی فراخی اور بہت راحت وسکون ملے گا، ایسی صورت میں تم میرا شکر ادا کرو، اس شکر سے تمہاری اور مدد ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں شکر کے بجائے صبر کو بیان فرمایا کہ ایمان والو! صبر کے ذریعے میری مدد چاہو۔ گویا اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے لیے صبر کو بطور وظیفہ عطا فرمایا جا رہا ہے۔

جس نکتے کی طرف آپ کی توجہ دلانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے جب ایمان والوں سے خطاب کیا تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں فتح دینا چاہتا ہے کیونکہ وہ صاحبِ ایمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں دشمن پر غالب کرنا چاہتا ہے، کیونکہ وہ اللہ کے اپنے ہیں۔ رب العالمین نے انہیں یہ نہیں فرمایا کہ شکر کرو، نفلی عبادات، صدقات اور خیرات کرو تو میری مدد و نصرت آئے گی۔ آیتِ کریمہ میں نماز کا ذکر بھی بعد میں کیا گیا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ فلاں نیکی کرو، تسبیح کرو، استغفار کرو، اللہ اللہ کرو اور سرورِ کائنات ﷺ پر درود شریف پڑھو تو میری مدد آئے گی۔ یہ تمام چیزیں بعد میں بیان فرمائیں، مگر اہل ایمان کو پہلا خطاب کیا کہ صبر کے ذریعے میری مدد طلب کرو۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ انہیں صبر کی تلقین کیوں فرما رہا ہے؟ ایمان والا ہونا اور صبر کرنا ان دونوں میں کیا تعلق ہے؟ آیتِ مبارکہ کے ذریعے اس نے پیغام دیا کہ انہی کے درمیان تو حقیقی تعلق ہے۔ کس طرح؟

ذرا غور کریں! صبر کن حالات کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے؟ راحت ملے تو صبر ہوتا ہے

یا مصیبت ہو تو تب صبر ہوتا ہے؟ نعمتیں، راحتیں اور فراخیاں ملیں تو تب صبر کیا جاتا ہے یا تنگی، اذیت، پریشانی، مقدمے، جیلیں، عدالتیں، شہادتیں، خون، مال کی کمی، مصائب و آلام ہوں تب صبر کیا جاتا ہے؟ مقامِ غور یہ ہے کہ صبر کا جوڑ کن حالات کے ساتھ جڑا ہوا ہے؟ کروڑوں روپیہ مل جائے، ملازمت مل جائے اس کے ساتھ صبر کا ربط و تعلق ہے یا مال و ملازمت چلی جائے تو اس کے ساتھ جوڑ ہے؟ صبر کا موقع محل خوشحالی ہے یا پریشان حالی؟ ظالم دشمن کی طرف سے کوئی مقدمہ نہ ہو، تب صبر کی ضرورت پڑتی ہے یا مقدموں میں گھرے ہوئے ہوں تو تب صبر کی ضرورت ہوتی ہے؟ ہر چوتھے دن بے گناہی کے باوجود عدالتوں میں پیشی ہو تو تب صبر کی ضرورت ہے یا عمر بھر کبھی پیشی ہی نہ ہو تو تب صبر کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے؟ شہادتیں ہوں تو تب صبر ہوتا ہے یا دوسرے پر چڑھ کر غلبہ کر چکے ہوں تو تب صبر ہوتا ہے؟ اذیتیں، دکھ، تکلیفیں، مصائب، مشکلات اور آلام ہوں تب صبر ہوتا ہے یا خوشیاں، فراخیاں، روزگار، وسائل، رزق، کاروبار، طاقت، غلبہ اور دنیا کا سب کچھ موجود ہو تب صبر ہوتا ہے؟

پتہ چلا کہ اگر اچھے حالات ہوں تو یہ شکر کا محل ہے اور اگر حق کے لیے زندگی میں پریشانی آ جائے تو وہ صبر کا مقام ہے۔ صبر کے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت حاصل کی جا سکتی ہے۔

۷۔ جہاں ایمان، وہاں آزمائش

جہاں ایمان ہوگا وہاں مشکلات بھی ضرور آئیں گی۔ ایمان جتنا قوی ہوگا مشکلات بھی اتنی ہی سخت ہوں گی۔ ارشاد فرمایا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝[1]

اور ہم ضرور بالضرور تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور

(۱) البقرة، ۲: ۱۵۵

جانوں اور پھلوں کے نقصان سے، اور (اے حبیب!) آپ (ان) صبر کرنے والوں کو سنا دیں٥

یعنی جو ہم سے دوستی لگائے گا اسے ہی تو ہم آزمائیں گے، غیروں کو کوئی نہیں آزماتا۔ ہمیشہ اپنوں، محبت کرنے والوں اور وفاداروں کو ہی جانچا جاتا ہے۔ بے وفاؤں کو کوئی نہیں آزماتا، کیونکہ ان کے بارے پہلے ہی معلوم ہے کہ وہ اس قابل ہی نہیں ہیں۔ رب کبھی اپنے منکرین کافروں کونہیں آزماتا کیونکہ وہ تو پہلے ہی منکر ہیں۔ جب کوئی دعویٰ کرتا ہے: مولیٰ! میں تیرا ہوں؛ تو وہ اس دعویٰ کی سچائی جانچنے کے لیے اُنہیں طرح طرح سے آزماتا ہے۔ بلا تشبیہ و بلا مثال لیلٰی محلے کے ہر کسی مرد کونہیں آزماتی تھی بلکہ وہ صرف قیس ہی کو آزماتی تھی کیونکہ مجنوں ہونے کا دعویٰ تو فقط وہی کرتا تھا۔ جس نے عشق کا دعویٰ ہی نہیں کیا، اسے آزمانا کیوں؟ آزمایا محبت کرنے والوں، ایمان رکھنے والوں اور اللہ سے جڑ جانے والوں کو جاتا ہے۔ جو اللہ کے اپنے ہو جاتے ہیں وہ اِنہی کو آزماتا ہے۔

ذیل میں اللہ تعالیٰ کے ان چند محبوبین کا تذکرہ کرتے ہیں جنہیں آزمائشوں، امتحانات، مصائب و آلام اور مشکلات سے گزرنا پڑا مگر وہ اس سب کے باوجود راہِ محبت میں اِستقامت کے ساتھ گامزن رہے۔ ان کا آزمایا جانا جہاں ایک طرف ہمیں ان کی اِستقامت کی یاد دلاتا ہے اور دوسری طرف اس امر کو واضح کرتا ہے کہ آزمایا انہی کو جاتا ہے جو اس کے اپنے ہوتے ہیں اور اس سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

(۱) حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام پر آنے والی پے در پے آزمائشیں

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو متعدد مرتبہ آزمایا اور آپ ہر امتحان میں سرخرو ٹھہرے۔ ارشاد فرمایا:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ.(۱)

(۱) البقرة، ۲:۱۲۴

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم (ﷺ) کو ان کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو انہوں نے وہ پوری کر دیں۔

سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ﷺ اور نمرود میں سے اللہ کا اپنا کون تھا اور غیر کون تھا؟ آگ میں کس کو ڈالا گیا: غیر کو یا اپنے کو؟ دوست کو یا دشمن کو؟ اس سوال کا جواب ہی مومن کو آزمائشوں اور امتحانات میں استقامت عطا کرتا ہے۔ اگر کوئی مومن ہو کر مشکلات کی آگ میں جل رہا ہے تو وہ سجدۂ شکر بجا لائے کہ میرے مولیٰ نے میری محبت کو قبول فرما لیا ہے۔

جب سیدنا ابراہیم ﷺ کو آگ میں ڈالا جانے لگا تو ہوا کا فرشتہ حاضر ہوا، اُس نے عرض کیا: اے ابراہیم! رب العزت نے آگ کو جلانے اور بجھانے کا کام مجھے سونپ رکھا ہے، اگر آپ حکم دیں تو نمرود کی جلائی ہوئی آگ چشم زدن میں ہوا کے ذریعے بجھا دوں؟ یہاں بھی اللہ تعالیٰ فرشتے کو نہیں بلکہ حضرت ابراہیم ﷺ کو آزما رہا ہے۔ ابراہیم ﷺ نے انکار فرما دیا کہ میرا معاملہ میرے محبوب کے ساتھ ہے، اسے ہو لینے دو۔ کیا میرا رب نہیں دیکھ رہا کہ میرے لیے آگ جلائی گئی ہے۔ پھر حضرت جبرائیل ﷺ حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے ابراہیم! کیا آپ کو میری ضرورت ہے؟ فرمایا: مجھے آپ کی مدد نہیں چاہیے۔ انہوں نے کہا: اپنے رب سے اس کے بجھانے کا سوال کیجیے۔ فرمایا: (کیا وہ نہیں جانتا کہ مجھے آگ میں ڈالا جا رہا ہے؟) میرا حال بخوبی اس کے علم میں ہے۔[1]

اس طرح حضرت ابراہیم ﷺ نے دونوں فرشتوں کو جواب دے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی آزمائش کا سلسلہ یہاں پر روکا نہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا کہ نمرودیوں نے آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ دہکا کر حضرت ابراہیم ﷺ کو منجنیق کے ذریعے اس آگ کے الاؤ میں پھینک دیا۔ اللہ رب العزت نے دشمن کے ہاتھ نہیں روکے، بلکہ دشمن نے جو کرنا تھا اس نے وہ کر ڈالا۔ جب حضرت ابراہیم ﷺ دہکتے الاؤ میں ڈال دیے گئے تو اس وقت آواز آئی:

(۱) رازی، التفسیر الکبیر، ۲۲: ۱۶۲

يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ○[1]

اے آگ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سراپا سلامتی ہو جا○

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکے جانے کے وقت یہ بھی نہیں فرمایا گیا تھا کہ اے میرے خلیل! گھبرائیں نہیں، میں آگ کو گل و گلزار کر دوں گا۔ قرآن گواہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس طرح کی کوئی وحی نہیں بھیجی گئی بلکہ ان کو اسی کیفیت میں رہنے دیا کہ دیکھیں میری رضا اور میری مشیت پر کب تک ابراہیم علیہ السلام مسکراتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کچھ خبر نہیں ہے کہ کیا ہونے والا ہے؟ انہیں یہی پتہ ہے کہ میں اس آگ میں جل کر راکھ ہو جانے والا ہوں۔ وہ اسی تصور میں گم ہیں۔ چونکہ محبوب کی رضا پر آگ میں جل رہے ہیں، لہٰذا غم زدہ نہیں بلکہ فرطِ مسرت سے مسکرا رہے ہیں۔ اللہ رب العزت نے انہیں اسی حال میں رہنے دیا کیونکہ ان کا تو امتحان لینا مقصود تھا۔ ربِ دو جہاں نے آگ کو حکم دیا: اے آگ! میرے ابراہیم کو جلانا نہیں بلکہ تو ان کے لیے گل و گلزار ہو جا۔

نارِ نمرود کی آزمائش میں کامیابی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکمِ ربانی ہوتا ہے کہ پیرانہ سالی میں عطا کردہ بیٹے اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام جیسی وفا شعار زوجہ کو بے آب و گیاہ ریگستانِ مکہ میں تنہا چھوڑ آؤ۔ وہاں ان کا کوئی مونس و مددگار نہ تھا، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام ان تلخ حقائق کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے دونوں ماں بیٹے کو کھلے آسمان تلے صحرائے مکہ میں چھوڑ آئے۔ ان کی اس وفا کی قرآن ان الفاظ میں گواہی دیتا ہے:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ.[2]

اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی اولاد (اسماعیل علیہ السلام) کو (مکہ کی) بے آب و گیاہ وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسا دیا ہے۔

---

(۱) الأنبياء، ۲۱: ۶۹

(۲) إبراهيم، ۱۴:۳۷

اُنہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اِن دونوں کا یہاں کیا بنے گا اور کس کے سہارے رہیں گے؟ ان کے ذہن میں اِن سوالات نے جنم نہ لیا کہ میرا رب میرے ساتھ کیا کر رہا ہے؟ میرا قصور کیا ہے؟ میں اس کا عاجز بندہ، تابع فرمان اور وفادار ہوں۔ اگر اس نے امتحان و آزمائش میں مبتلا کرنا ہے تو اپنے دشمنوں کو کرے۔ میں نے تو ساری زندگی اس کی تابعداری میں گزاری ہے، آخر میرے بچے اور اس کی ماں کو ریگستان میں تنہا چھوڑنے کا حکم کیوں دیا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا کچھ نہ سوچا اور اپنے رب کے حکم پر اہلیہ اور شیر خوار بچے کو دشتِ بیابان میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا اور اس امتحان میں بھی سرخرو ٹھہرے۔

آزمائشوں کا سلسلہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ جب وہی فرزندِ ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام عہدِ شباب کو پہنچے تو ربِ دو جہاں نے پھر فرمایا: ابراہیم علیہ السلام اب اپنے اس پسر کو اپنے ہی ہاتھوں سے ذبح کر دیجیے۔ سوچنے کا مقام یہ ہے کہ اس سے بڑی آزمائش بھی کسی پر آئے گی؟ اللہ رب العزت اپنے محبوب پیغمبر علیہ السلام کو کہے کہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے لختِ جگر کو ذبح کر دے۔ کوئی قتل کر دے تو اور بات ہے، دشمن، ڈاکو، قاتل اور غاصب حکمران کر دیں تو کوئی اور معاملہ ہے لیکن آزمائش کا یہ دوسرا انداز ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عالی مرتبت بندے، محبوب پیغمبر اور جد الانبیاء جیسی عظیم ہستی سے کہے کہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا بیٹا ذبح کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کہا:

قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ فَانۡظُرۡ مَا ذَا تَرٰی.(۱)

(ابراہیم علیہ السلام نے) فرمایا: اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں سو غور کرو کہ تمہاری کیا رائے ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام جواب دیتے ہیں:

یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ○(۲)

---

(۱) الصافات، ۱۰۲:۳۷

(۲) الصافات، ۱۰۲:۳۷

ابا جان! وہ کام (فوراً) کر ڈالیے جس کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے○

پھر عظیم باپ نے اپنے رب کے حکم پر اپنے ہی بیٹے کے گلے پر چھری چلا دی۔ اللہ تعالیٰ چھری چلنے سے پہلے بھی روک سکتا تھا مگر پہلے چھری چلوائی، پھر روکا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے خلیل علیہ السلام اپنی حیاتِ مبارکہ کی تمام آزمائشوں پر پورا اُترے۔

فیضِ خلیل کے حاملین کارکنانِ تحریک منہاج القرآن

اب نہ تو کوئی ابراہیم علیہ السلام ہوسکتا ہے اور نہ ہی کوئی ان کے قدموں کی دھول کے ذرے کے برابر ہوسکتا ہے۔ مگر ۲۳ دسمبر ۲۰۱۲ء سے لے کر آج تک بالعموم اور ۱۷ جون ۲۰۱۴ء اور انقلاب مارچ ۲۰۱۴ء میں تحریک منہاج القرآن کے کارکنان و رُفقاء کو آزمائشوں اور امتحانات میں سرخرو ہونے کے حوالے سے فیضِ خلیل میسر آیا۔ ریاستی جبر و بربریت کے مقابلے میں یہ کارکنان وفاداری اور جاں نثاری پر پورا اُترے۔ یہاں تک کہ ان کی استقامت کا اقرار صرف اپنوں نے ہی نہیں بلکہ دشمنوں نے بھی کیا اور پوری دنیا نے اعتراف کیا کہ اپنے مشن کے ساتھ استقامت اور وفا کے پیکر کارکنان اگر کسی تحریک یا جماعت کو میسر ہیں تو وہ صرف تحریک منہاج القرآن ہے۔

(۲) خلفاے راشدین پر ابتلاء و آزمائش

اللہ رب العزت نے اہلِ ایمان کو ممیّز و ممتاز کرنے کے لیے ایمان اور ابتلاء کو اکٹھا کیا۔ جیسے جیسے ایمان کا درجہ اونچا ہوتا چلا جاتا ہے، ویسے ویسے ابتلاء بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ہر دور کے حق پرست آزمائشوں کے سمندر سے ہنس کر گزرتے رہے اور حیاتِ جاودانی پاتے گئے۔ حتیٰ کہ امام الانبیاء حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا:

يَا عَائِشَةُ، أَنَا أَشَدُّ النَّاسِ بَلاءً. (۱)

(۱) أبو يعلى، المسند، ۸:۲۰۷، رقم:۴۷۶۹

اے عائشہ! اللہ کی راہ میں سب سے زیادہ مجھے آزمایا گیا ہے۔

آزمائشوں کا یہ سلسلہ آپ ﷺ کے اَصحاب رضی اللہ عنہم و اہلِ بیت علیہم السلام نے بھی اپنا خون دے کر جاری رکھا۔ رسالت مآب ﷺ کے چاروں خلفاے راشدین میں سے تین خلفاء سیدنا فاروقِ اعظم، سیدنا عثمانِ غنی اور سیدنا علی المرتضٰی رضی اللہ عنہم یکے بعد دیگرے منصبِ شہادت پر فائز ہوئے۔ الغرض ایمان میں جو جتنے بلند مرتبے پر فائز ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں اتنا ہی آزمایا ہے۔

انبیاء کرام و رُسل عظام علیہم السلام، حضور پرنور ﷺ، جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم اور اَہلِ بیتِ اَطہار رضی اللہ عنہم کی زندگیاں حق، اس کی بقا اور اس کی فتح یابی کے لیے ہمیشہ مشکلات، مصائب و آلام، قربانیوں اور شہادتوں سے عبارت رہی ہیں۔ اَہلِ حق وہ ہیں جو صبر و تحمل اور استقامت کا پہاڑ بن کر کھڑے رہیں اور کسی بھی صورت ان کے قدموں میں لرزش نہ آئے۔ جو شخص لرز گیا، صبر کا دامن چھوڑ بیٹھا اور کب، کیوں، کیسے کے چکر میں پڑ گیا، وہ اَہلِ حق میں سے خارج کر دیا گیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا شمار بھی شہداء میں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کتنے شہید ایسے ہیں جنہیں موت بستر پر آئے گی مگر وہ شہید ہوں گے، کیونکہ ان مردانِ حق کی عمریں حق و سچ کے لیے لڑتے گزر جائیں گی۔ وہ شہادتوں کو اپنی جانوں سے زیادہ محبوب رکھیں گے۔ ان کی ساری عمر قربانیوں میں بسر ہوگی اور وہ دل و جان سے شہادت کے طلب گار ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پھرتے ہوں گے اور کسی بھی قسم کی قربانیوں سے دریغ نہیں کریں گے، مگر حکمِ الٰہی سے میدانِ کارزار میں دشمن کے ہاتھوں شہید ہونے کے بجائے بسترِ مرگ پر انتقال فرمائیں گے۔

رسولِ مکرم ﷺ نے فرمایا:

مَنْ سَأَلَ اللهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ، بَلَّغَهُ اللهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ، وَإِنْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهِ. (۱)

---

(۱) ا۔ مسلم، الصحیح، کتاب الإمارة، باب استحباب طلب الشهادة في سبیل الله تعالى، ۳: ۱۵۱۷، رقم: ۱۹۰۸-۱۹۰۹

←

جس نے اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل کے ساتھ شہادت (کی موت) طلب کی تو اللہ تعالیٰ اُسے شہداء کا مقام عطا فرمائے گا خواہ اسے (اپنے گھر میں) بستر پر (طبعی) موت ہی (کیوں نہ) آئی ہو۔

چونکہ وہ عمر بھر شہادت کی طلب میں جد و جہد کرتے رہے، عمر بھر مجاہدہ، ریاضت اور محنت کرتے رہے، ایثار و قربانی کے پیکر بنے، استقامت سے ڈٹے رہے۔ لہٰذا اُن کی اس آرزو اور طلب کی وجہ سے اللہ رب العزت نے فرمایا: بھلے ان کی موت بستر پر آئے، لیکن وہ میرے ہاں شہدا کے مرتبے پر فائز ہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ عظام رضی اللہ عنہم اور اَہلِ بیتِ اطہار رضی اللہ عنہم کی ساری زندگی حق کے لیے جد و جہد کرتے گزری۔ لہٰذا اس معنی کی رُو سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بسترِ علالت پر انتقال پانے کے باوجود شہید ہوئے۔

(i) حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ پر آزمائش اور اُن کا صبر و اِستقامت

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آقاے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یکے بعد دیگرے دو صاحبزادیاں تھیں۔ باغیوں نے چالیس دن تک حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی رہائش گاہ کا محاصرہ کرتے ہوئے پانی بند رکھا۔ بعض کتب میں مؤرّخین نے ۴۹ دن جبکہ حافظ ابن کثیر نے چالیس دن تک کا محاصرہ لکھا ہے۔[1] محبّ طبری نے ۴۹ دن اور دوسری روایت کے مطابق دو مہینے اور بیس دن یعنی ۸۰ دن کا محاصرہ لکھا ہے۔[2] اس محاصرہ کے دوران ہی خلیفۂ سوم رضی اللہ عنہ مظلومانہ انداز سے شہید کر دیے گئے۔

.... ۲۔ أبو داود، السنن، کتاب الوتر، باب في الاستغفار، ۲: ۸۵، رقم: ۱۵۲۰

۳۔ نسائی، السنن، کتاب الجهاد، باب مسألة الشهادة، ۶: ۳۶، رقم: ۳۱۶۲

۴۔ ابن ماجه، السنن، کتاب الجهاد، باب القتال في سبیل الله، ۲:۹۳۵، رقم:۲۷۹۷

(۱) ابن کثیر، البدایة والنهایة، ۷:۱۹۰

(۲) محب طبری، الریاض النضرة في مناقب العشرة، ۳:۶۲

(ii) عہدِ علوی میں اِبتلاء و آزمائش

حضرتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مولیٰ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے زمامِ خلافت سنبھالی۔ آپ وہ عظیم شخصیت ہیں جنہیں حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی لختِ جگر سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا عطا کی ہیں۔ خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کے بطنِ اقدس سے امام حسن رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی ہے۔

مولیٰ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ اور ان کی پوری آل علیہم السلام راہِ حق کے مسافر تھے۔ انہیں بھی حق کے سفر میں ہمیشہ مصائب و آلام اور ابتلاؤں کا سامنا رہا۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ جونہی مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہوئے تو روزِ اوّل ہی سے مشکلات اور مصائب و آلام کا دروازہ کھل گیا۔ جنگِ جمل، جنگِ صفین اور جنگِ نہروان کے واقعات پیش آئے۔ ان واقعات کے دوران اَہلِ حق کن کن مشکلات و آزمائشوں سے گزرے، اس کا مختصر جائزہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

(ا) جنگِ جمل

مولیٰ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بنتے ہی جنگِ جمل کا واقعہ رونما ہوتا ہے۔ ان کے مدِّ مقابل بھی (غلط فہمی سے) صحابہ تھے۔ گویا دونوں طرف آقاے دو جہاں ﷺ کے غلام ہی تھے۔ خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کا دور ابھی اختتام پذیر نہیں ہوا۔ وہ لوگ جنہوں نے عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کر کے انہیں شہید کیا تھا، وہ فتنہ پرور لوگ اس وقت بھی اسلام کے ٹکڑے کرنا چاہتے تھے۔ فتنے کی آگ جلا دی گئی تھی، مقاتلہ ہوا اور مولیٰ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی خلافت کی ابتدا ہی میں دس ہزار صحابہ اور تابعین شہید ہوگئے۔ دونوں اطراف سے قربانیاں دی گئیں، جانیں گئیں مگر چونکہ اسلام حق پر تھا، اس لیے اس کا چراغ مسلسل تابانیاں بکھیرتا رہا۔ مولیٰ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ اتنی پریشانیوں اور مصائب و آلام سے گزرتے ہوئے خلافت کی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ حتیٰ کہ حالات قابو کرنے کے لیے انہیں مدینہ منورہ چھوڑ کر کوفہ منتقل ہونا پڑا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کتنے دکھی دل کے ساتھ مدینۃ النبی ﷺ کی جگہ کوفہ کو دارالخلافہ بنایا ہوگا۔

(ب) جنگِ صفین

جنگِ جمل کے بعد ۳۷ ہجری میں جنگِ صفین کا واقعہ پیش آیا۔ اہل شام حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت پر مجتمع ہوگئے اور خلافتِ راشدہ، خلافتِ حقہ مولیٰ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہے۔ وہاں پھر معرکہ ہوتا ہے۔ اُس معرکے میں ایک لاکھ بیس ہزار افراد مولیٰ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور نوے ہزار افراد شام کے لشکر میں تھے۔ جنگ صفین میں ستر ہزار افراد شہید ہوئے۔ یہ لوگ حق کی خاطر اور اسلام کی بقا کے لیے قربانیاں دے رہے ہیں تا کہ راستہ سیدھا ہو جائے اور سلطنت وحکومت ان خطوط پر استوار ہو جو خطوط آقاے دو جہاں ﷺ نے وضع فرمائے ہیں۔ یہاں دیگر تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف اَہلِ ایمان کو درپیش آزمائشوں، امتحانات اور قربانیوں کو بیان کرنا مقصود ہے۔ الغرض اسلام کے شجر کی آب یاری کے لیے ہزاروں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین نے قربانیاں دی ہیں۔

جنگِ صفین میں حضرت مولیٰ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لشکر سے پچیس ہزار افراد شہید ہوئے اور دوسرے لشکر سے ۴۵ ہزار افراد شہید ہوئے۔ مولیٰ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے لشکر میں حدیبیہ کے میدان میں حضور پرنور ﷺ کے دستِ اقدس پر بیعتِ رضوان کرنے والوں میں سے بھی آٹھ سو صحابہ شریک تھے اور ان میں سے ۶۳ افراد شہادت کے منصب پر فائز ہوئے۔

مولیٰ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کو اپنے دورِ خلافت میں ایک دن بھی اطمینان اور سکون کا سانس نصیب نہیں ہوا۔ اس وقت حق کی خاطر زندہ، حق کو بچانے اور اسے آگے لے جانے کی چاہت وتمنا سے معمور ان عظیم صحابہ وتابعین کو سکون کی ایک رات بھی میسر نہیں آئی۔ صرف جنگ صفین میں ستر ہزار شہادتیں ہوئی ہیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اتنے سارے شہداء کو کہاں دفن کرتے ہوں گے؟ یقیناً اجتماعی تدفین عمل میں لائی جاتی ہوگی۔

(ج) فتنہ خوارج کا آغاز

مولیٰ علی شیرِ خدا رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ستر ہزار شہادتیں ہو چکیں، اب اس مسئلے کا حل باہمی گفت وشنید یعنی امن سے نکال لیں۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ اُمت اس سے زیادہ

نقصان کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ مولیٰ علی شیر خدا ﷺ نے جونہی امن کے راستے کی طرف قدم بڑھایا تو ان کے لشکر سے کچھ فوجی سرکش ہوگئے۔ اُنہوں نے بغاوت کرتے ہوئے حرورہ کے مقام پر اجتماع کیا اور وہیں سے خوارج کا آغاز ہوا۔ دہشت گردی کی ابتدا مولیٰ علی شیر خدا ﷺ کے دورِ خلافت میں صفین کی جنگ کے بعد ہوئی۔ یاد رکھ لیں کہ خوارج کوئی باہر سے آنے والا طبقہ نہیں تھا۔ خوارج وہی فوجی تھے جو مولیٰ شیر خدا ﷺ کے لشکر میں شامل تھے۔ کل تک تو وہ تلواروں سے لڑتے ہوئے جانیں دے رہے تھے۔ فقط ایک بات پر وہ بگڑ گئے، اُنہیں امن کا قیام پسند نہ آیا، کیونکہ وہ ہر صورت مقاتلہ چاہتے تھے۔ جونہی مولیٰ علی شیر خدا ﷺ نے امن کا جھنڈا بلند کیا تو وہ باغی ہوکر خوارج بن گئے۔ انہوں نے بعدازاں آپ ﷺ کے امن کے فیصلے کے خلاف بغاوت کر دی اور الحروریہ میں خود کو مسلح کرنا شروع کر دیا۔

(د) معرکۂ نہروان

مولیٰ علی شیر خدا ﷺ نے اپنی خلافت کے دوران کئی جنگیں کیں۔ اس دوران مسلسل ہزارہا شہادتیں ہوتی رہیں۔ اَہلِ حق صحابہ و تابعین اور اتباع التابعین سب حق کے لیے جان دینے سے کبھی گھبراتے نہیں تھے۔ ان کے مال لٹتے رہے، اولادیں بھی جاتی رہیں، جانیں بھی جاتی رہیں اور خون بھی بہتا رہا۔ وہ عظیم ہستیاں حق کے لیے سب کچھ لٹاتی رہیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ انہی قربانیوں سے اسلام کا چمن ہرا بھرا ہے، رہے گا اور آگے چلے گا۔

نہروان کے میدان میں بارہ (۱۲) ہزار خوارج حضرت علی ﷺ کے مد مقابل تھے۔ انہوں نے ان کے خلاف بھی فیصلہ کن جنگ لڑی۔ اس موقع پر بھی کئی صحابہ و تابعین شہید ہوئے۔ اندازہ کیجیے کہ اس دور کے صحابہ کرام ﷺ نے اپنا سکون، راحتیں، کاروبار، رات کے چین سب کا سب فقط حق کو بچانے اور اسلام کی بقا کے لیے قربان کر دیا؛ پے در پے جانی اور مالی قربانیاں دے کر اسلام کو بقا عطا کی۔

(ر) شہادتِ حضرت علی المرتضیٰ ﷺ

خوارج نے حضرت علی ﷺ سے شکست کھانے کے باوجود پھر سازش کی۔ وہ ایک ہی

وقت میں حضرت مولیٰ علی ﷜، حضرت امیر معاویہ ﷜ اور حضرت عمرو بن العاص ﷜ کو شہید کرنا چاہتے تھے۔ تینوں شخصیات کے خلاف انہوں نے الگ الگ افراد مقرر کر رکھے تھے۔ مولیٰ علی شیر خدا ﷜ کے خلاف ابن ملجم خارجی مقرر تھا۔ جب مولیٰ علی ﷜ کوفہ میں اٹھارہ رمضان المبارک کو نمازِ فجر کی امامت کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کے پیچھے پہلی صف میں ابن ملجم خارجی نمازی بن کر کھڑا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے نماز شروع کی تو اس نے حملہ کر کے آپ ﷜ کو شدید زخمی کر دیا۔ حضرت علی المرتضیٰ دو دن زخمی حالت میں رہے اور ۲۰ رمضان المبارک کی رات منصبِ شہادت پر فائز ہو گئے۔

(iii) اَہلِ بیتِ اَطہار ﷺ پر مصائب و آلام کا بیان

آقاے دو جہاں ﷺ کے بعد روئے زمین پر کوئی جان اَہلِ بیتِ اَطہار سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو محبوب، مقرب اور باکرامت نہیں تھی۔ ان سے زیادہ کوئی اَہلِ حق نہ تھا، ان سے زیادہ راحتوں اور نعمتوں کا حق دار کوئی نہ تھا حتی کہ خلافتِ راشدہ کی انتہا بھی ان قربانیوں پر منتج ہوئی۔

(ا) امام حسن مجتبیٰ ﷜ کو حضرت علی ﷜ کے بعد چھ ماہ کے لیے خلافت ملی۔ بعد ازاں آپ ﷜ کو بھی زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔

(ب) معرکۂ کربلا بھی شہادتِ علی ﷜ ہی کا ایک تسلسل ہے۔ جہاں آپ ﷜ کے خانوادہ کے افراد کے سر کاٹ کر نیزوں پر چڑھائے گئے۔ راکبِ دوشِ رسول ﷺ، مولیٰ علی شیر خدا ﷜ کے شہزادے امام حسین ﷜ کوفیوں کی دعوت پر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ امام حسین ﷜ نے اپنی روانگی سے قبل اپنے چچا زاد حضرت مسلم بن عقیل ﷜ کو کوفہ بھیجا تا کہ معلوم کریں کہ عوام نکلتے بھی ہیں یا نہیں؟ اٹھارہ ہزار اَہلِ کوفہ نے امام عالی مقام کی آمد سے قبل حضرت مسلم بن عقیل ﷜ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے کہا کہ ہم یزید کے خلاف انقلاب کے لیے جنگ لڑنے کے لیے تیار ہیں اور اس کے ظالم اقتدار کا تخت الٹنے کے لیے آپ ﷜ کے ساتھ نکلیں گے۔

حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے حالات دیکھ کر خط بھیجا کہ میرے بھائی حسین! دیر نہ کریں، فوری طور پر یہاں پہنچیں۔ دو دنوں میں اب تک اٹھارہ ہزار آدمی میرے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ اور مولیٰ علی شیرِ خدا رضی اللہ عنہ کے یہ شہزادے اَہلِ کوفہ کی دعوت پر مدینہ سے رخصت ہوئے لیکن جب اَہلِ کوفہ کو یزید اور ابن زیاد نے ڈرایا دھمکایا تو پھر اٹھارہ ہزار بیعت کرنے والوں میں سے صرف چار ہزار باقی رہ گئے۔ بعد ازاں جب حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کا محاصرہ ہوا تو صرف ستر افراد باقی رہ گئے۔ پھر جب دشمن آپ پر حملہ آور ہوئے تو مڑ کر دیکھا تو ان میں سے ایک بھی شخص آپ کے ساتھ نہ تھا۔

حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ نے خط بھیجا کہ کوفی بیعت کر کے پھر گئے ہیں اور حق کے لیے گھروں سے نہیں نکلے۔ لہٰذا میرے بھائی حسین! کوفہ نہ آنا۔ مگر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اس خط کے ملنے تک کربلا کے قریب پہنچ چکے تھے۔ امامِ عالی مقام علیہ السلام نے اپنے گھرانے کے سر کٹوا دیے لیکن شہادتوں اور مصائب و آلام اور مشکلات سے نہیں گھبرائے۔ یزید اور اس کے طرزِ سلطنت کے سامنے جھکے نہیں، بکے نہیں، ڈرے نہیں اور دبے نہیں۔ امام عالی مقام علیہ السلام سمیت تمام خانوادہ شہید کر دیا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کا سر کاٹ کر نیزہ پر چڑھا کر اسی حالت میں دمشق لے جایا گیا مگر امام حسین علیہ السلام کا سر کاٹ کر بھی یزید شکست خوردہ رہا اور امام حسین رضی اللہ عنہ نیزے کے نوک پر قرآن پڑھ کر ہمیشہ کے لیے فتح یاب ہوگئے۔ اسی لیے کہتے ہیں:

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

(ج) اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام کی قربانیوں اور آزمائشوں کی داستان میں ایک نام امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے پوتے امام یحییٰ بن زید کا بھی ہے۔ انہیں شہید کرنے کے بعد بدبختوں نے لاش کو قبر سے نکال کر کفن اتار کر ستر برہنہ کر دیا اور ان کی لاش کو سُولی پر لٹکا دیا۔ ان کا یہ جسدِ مقدس اسی حالت میں مسلسل چھ مہینے تک سرِ بازار لٹکتا رہا۔ اس دوران لوگ آتے اور مبارک جسم کو دیکھتے مگر اللہ کی قدرت دیکھیے کہ سَتر کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ پھر ابو مسلم خراسانی نے سولی سے

اُتار کر آپ کا جنازہ پڑھا۔[1]

(د) اسی طرح حضرت امام نفس ذکیہ کے بھائی حضرت ابراہیم بن عبد اللہ بن حسن مجتبیٰ کا بھی سر کاٹ کر بازار میں سولی پر لٹکایا گیا۔[2]

گویا صرف ایک مولیٰ علی شیر خدا ﷛ کی ہی شہادت نہیں ہوئی بلکہ ان کی ساری اولاد کی شہادتیں ہوئی ہیں۔ خواہ امام حسن مجتبیٰ ﷛ کی اولاد ہو یا امام حسین ﷛ کی اولاد ہو، دونوں طرف سے شہادتوں کا ایک عظیم سلسلہ جاری ہوا۔

۸۔ شہادتیں شکست نہیں بلکہ فتح کا زینہ ہوتی ہیں

ہمارا ایمان ہے کہ حضرت عثمان غنی ﷛ شہید ہو کر بھی فاتح ہیں۔ سیدنا امام حسن اور سیدنا اِمام حسین ﷺ اور ان کا خانوادہ قربانیوں کی تاریخ رقم کرتے ہوئے شہادت کے مقام پر فائز ہو کر فاتح ٹھہرے۔ جب ایمان اور یقین حق پر قائم ہو جاتا ہے تو پھر شہادتیں شکست نہیں ہوتیں بلکہ یہ شہادت دراصل فتح ہوتی ہے۔ ربِّ ذوالجلال نے اپنے اس فرمان سے ناکامی و شکست کے ہمارے خود ساختہ تصور کی جڑ کاٹ دی ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰـكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ○[3]

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مت کہا کرو کہ یہ مُردہ ہیں، (وہ مُردہ نہیں) بلکہ زندہ ہیں لیکن تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور نہیں○

یعنی نہ اسے مردہ کہہ سکتے ہو اور نہ ہی ایسا گمان کر سکتے ہو۔ ان سے مردہ کا عنوان ہٹا دیا جانا، اس امر کو واضح کرتا ہے کہ وہ تو ہمیشہ کے لیے فتح یاب ہیں۔ انہوں نے تو جینے والوں کو جینے کا

---

(۱) ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۲۲۸:۶۴

(۲) شهرستاني، الملل والنحل، ۱۵۶:۱

(۳) البقرة، ۱۵۴:۲

سلیقہ سکھایا اور مر کر جاوداں ہونے کا کلیہ بتا دیا۔

۹۔ تحریک منہاج القرآن کی تاریخ میں بابِ شہادت کی تکمیل

اللہ رب العزت جیسے جیسے اپنے بندوں کا درجہ بلند کرتا ہے، ویسے ویسے ان کی آزمائش بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ تحریکِ منہاج القرآن کے کارکنان اور رفقاء مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہیں نارِ نمرود کے مقابلے میں ابراہیمی اور یزیدیت کے خلاف ڈٹ جانے والا حسینی کردار ملا ہے۔ 17 جون 2014ء سے قبل ہماری انقلابی تحریک میں شہادت کا یہ سرخ باب نہیں تھا، بس اسی کی کمی باقی رہ گئی تھی۔ الحمد للہ ربِ دو جہاں نے اس زرّیں باب کو بھی ہماری تاریخ کا حصہ بنا دیا۔

مذکورہ بالا جملہ واقعات اور علاوہ ازیں تاریخ کے اوراق پر موجود ان جیسے دیگر واقعات کی طرف نظر دوڑائی جائے تو اللہ رب العزت کے اس فرمان کی حکمت بخوبی سمجھ میں آتی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ. (۱)

اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے (مجھ سے) مدد چاہا کرو۔

ایمان ذاتِ الٰہی کے ساتھ ایک تعلق کے قائم ہونے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ سے جس کا محبت اور ایمان کا رشتہ و تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جائے گا، اسے ہر صورت آزمایا جائے گا۔

سنار کبھی لوہے کو بھٹی میں ڈال کر نہیں پرکھتا بلکہ بھٹی میں ہمیشہ سونے کو ڈال کر کندن بنایا جاتا ہے۔ ظلم و جبر کرنے والے اور حقوق غصب کرنے والے اُس لوہے کی مانند ہیں جسے بھٹی میں نہیں ڈالا جاتا۔ حق پر ڈٹ جانے والے، ظلم و بربریت کو برداشت کرنے والے اور اپنے تمام ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر قومی، ملی و دینی مفادات کی خاطر ہر قربانی دینے والے سونے کی مانند ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ مصائب و مشکلات سے گزار کر کندن بنانا چاہتا ہے۔

(۱) البقرة، ۲:۱۵۳

اس لیے کہ یہی لوگ اس سے تعلق، نسبت، محبت اور وفا رکھنے والے ہیں۔ تحریک منہاج القرآن کے کارکنان کا شمار اِسی طبقہ میں ہوتا ہے۔

اللہ رب العزت نے ان کی وفا کو آزمایا، یہ ایمان کی آزمائش تھی جس پر یہ پورا اُترے۔ یاد رہے! ابھی اور بہت سی آزمائشیں باقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح اُصول بتا دیا کہ اگر ایمان والے ہو تو صبر کے لیے تیار رہو۔ وہ ایمان والوں کو ہر صورت آزماتا ہے۔ اگر ان مصیبتوں پر ایمان والے صبر و استقامت کا دامن تھامے رکھیں گے تو پھر اللہ کی نصرت ضرور اُترے گی۔

۱۰۔ اَہلِ حق کو 'کب'، 'کیوں' اور 'کیسے' سے غرض نہیں

اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذاتِ اقدس پر کامل یقین رکھنا ہوگا۔ یہ نہیں سوچنا کہ مدد کب اُترے گی۔ اگر مصیبتوں، مشکلات، تکالیف کو دیکھتے ہوئے زبان پر لفظ 'کب' آ گیا یعنی منزل کب ملے گی؟ فتح کب آئے گی؟ کامیابی کب مقدر بنے گی؟ مصائب و آلام کب ختم ہوں گے؟ اس کا مطلب ہے کہ دل میں منزل اور کامیابی کے متعلق شک آ گیا۔ ہم نے اُس شک ہی کی تو جڑ کاٹنی ہے۔ 'کب' نہیں کہنا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہیں کہا تھا کہ مولیٰ آگ کب بجھے گی؟ اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے 'کب' نہیں کہتے چونکہ زبان پر 'کب' آنے کا مطلب یہ ہے کہ دل میں شک ہے۔ ہر صورت کامیابی و منزل کے حصول کا یقین ہو کہ ایسا ہوگا اور ہر صورت ہوگا! کیا خبر کہ کل صبح ہی ہو جائے۔ یہ فیصلہ کُنْ فَيَكُوْن کے مالک ہی کو کرنے دیں۔ ہمیں حکم ہے کہ اس پر کامل یقین رکھیں کہ ایسا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے فرمانِ برحق وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کی رُو سے نماز سے بھی انہی کو مدد ملے گی جو پہلے صابر ہوں گے۔ نماز صابرین ہی کے لیے اللہ کی مدد کا ذریعہ بنے گی۔ اگر بے صبری کریں گے تو نماز سے بھی مدد نہیں ملے گی۔ گویا خالقِ ارض و سماء نے اپنے بندوں کو دو گُر، دو وظیفے اور دو روحانی علاج تجویز فرمائے کہ صبر اور نماز کے ذریعے میری مدد چاہو۔ اس کے بعد اعلان فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ○[۱]

یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ (ہوتا) ہے○

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُصَلِّيْنَ (اللہ نمازیوں کے ساتھ ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے یہ بتا دیا کہ میں ثوابیوں کے ساتھ نہیں بلکہ انقلابیوں کے ساتھ ہوں۔ وہ لوگ جو صرف ثواب کے لیے میری راہ پر آتے ہیں، میں ان کے ساتھ نہیں ہوں۔ رب تو ہر ایک کا ہوں، حتیٰ کہ کافروں کا بھی رب ہوں اور ان کو بھی رزق دیتا ہوں۔ یوں تو میں ہر ایک کے ساتھ ہوں مگر میری حقیقی معیت صابروں کو ہی میسر آتی ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو صبر اور نماز دو وظیفے بتائے مگر اپنی معیت کو نماز کے وظیفے کے ساتھ ذکر نہیں کیا کہ میں نماز پڑھنے والوں کے ساتھ ہوں بلکہ فرمایا کہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوں۔ مطلب یہ ہوا کہ صابر ہوں گے تو نمازی ہونا بھی کام آئے گا۔ اگر صبر کا دامن چھوڑ بیٹھیں گے تو نمازی ہونا بھی کام نہیں آئے گا۔

۱۱۔ ظلم و بربریت برداشت کرنے والے کبھی فنا نہیں ہوتے

اگلی آیتِ مبارکہ میں بھی مخاطبین ایمان والے ہی ہیں۔ اس لیے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر جس خطاب کا آغاز فرمایا تھا، اگلی آیت بھی اسی تسلسل میں ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ.[۲]

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مت کہا کرو کہ یہ مُردہ ہیں۔

یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جو شہید ہو جائیں وہ مردہ نہیں ہیں۔ بلکہ فرمایا کہ 'انہیں تم مردہ مت کہو' یعنی صرف بیان ہی نہیں کر دیا بلکہ حکماً منع فرما دیا کہ تم انہیں مردہ مت کہو۔

(۱) البقرة، ۲: ۱۵۳

(۲) البقرة، ۲: ۱۵۴

اس سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ دوسرے انہیں مردہ کہتے ہیں تو کہتے رہیں۔ ظلم کرنے والے ضرور کہیں گے کہ مار دیا، مزہ چکھا دیا، لاشیں گرا دیں، خون بہا دیا، ڈرا اور دھمکا دیا۔ زبان درازی کرنے والے، اہل حق پر ہاتھ اٹھانے والے، ظلم و جبر کرنے والے، اس دنیا میں کفر سے بدتر نظام بپا کرنے والے، دہشت گردی کرنے والے، غنڈہ گردی کرنے والے اور فرعون بننے والے اپنے تخت پر بیٹھ کر کہیں گے کہ ہم نے انہیں مار دیا، اڑا دیا اور وہ ختم ہو گئے۔ فرمایا: وہ کہتے ہیں تو انہیں کہنے دو، میں ان سے خود نبٹ لوں گا۔ مگر اے ایمان والو! تم یہ کبھی نہ کہنا کہ وہ مر گئے۔ اس لیے کہ جن لوگوں نے ریاستی جبر و بربریت کا سامنا کیا اور استقامت کے ساتھ حق پر ڈٹے رہے، وہ کبھی مرا نہیں کرتے۔

تحریک منہاج القرآن کے وہ کارکنان جنہوں نے ۱۷ جون ۲۰۱۴ء کے سانحہ ماڈل ٹاؤن، پھر یومِ شہداء اور بعد ازاں انقلاب مارچ کے دوران قربانیاں دیں وہ مر کر بھی زندہ ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ یہ مر گئے، حقیقت میں وہ خود مر گئے ہیں۔ وہ اب بھی مرے ہوئے ہیں اور آخر انہی کو مرنا ہے۔ وہ مر کر رہیں گے اور ان کا عبرت ناک خاتمہ ہوگا۔ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے، حق کے لیے قربانیاں دینے والے نہ مرے ہیں، نہ کٹے ہیں، نہ جھکے ہیں اور نہ ہی جھکیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں مار نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ یہ شہداء میرے ہیں اور جو میرے ہو جاتے ہیں وہ مرا نہیں کرتے۔ لہٰذا بقیہ مومنین بھی میری راہ میں شہید ہونے والوں کو مردہ مت کہیں۔ اس لیے کہ:

بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰـكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۝ (۱)

(وہ مُردہ نہیں) بلکہ زندہ ہیں لیکن تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور نہیں۝

اللہ رب العزت نے يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ فرما کر کافروں، مشرکین اور اہل مکہ کو خطاب نہیں کیا کہ بدر، اُحد اور دیگر غزوات میں شہید ہونے والے مسلمانوں کو مردہ نہ کہو بلکہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فرما کر شہداء کے لواحقین سے کہا ہے کہ تم میرے ہو۔ لہٰذا یہ راز

(۱) البقرة، ۲: ۱۵۴

کی بات تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے جو شہید ہوئے اور ان کی لاشیں تم اٹھا کر لائے اور دفنا رہے ہو؛ خبردار! انہیں کبھی مردہ نہ کہنا۔

غزوۂ احد میں ستر صحابہ کرام ﷺ شہید ہوئے۔ ستر شہداء کے مقدس لاشے سامنے پڑے ہیں۔ سب منتظر تھے کہ ابھی آقاے دو جہاں ﷺ شہدا کی نمازِ جنازہ پڑھاتے ہیں۔ بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان سب کو یوں ہی دفنا دو۔

عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک سے روایت ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ ﷺ بیان کرتے ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلٰى أُحُدٍ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ يَقُولُ: أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذًا لِلْقُرْآنِ فَإِذَا أُشِيرَ لَهُ إِلٰى أَحَدِهِمَا قَدَّمَهُ فِي اللَّحْدِ. وَقَالَ: أَنَا شَهِيْدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَمَرَ بِدَفْنِهِمْ فِي دِمَائِهِمْ، وَلَمْ يُغَسَّلُوا وَلَمْ يُصَلَّ عَلَيْهِمْ. (۱)

حضور نبی اکرم ﷺ شہداے اُحد میں سے دو دو شہیدوں کو ایک کپڑے میں اکٹھا کر دیتے تھے۔ پھر فرماتے کہ ان میں سے قرآن مجید کس کو زیادہ آتا ہے؟ جب دونوں میں سے کسی ایک طرف اشارہ کر دیا جاتا تو لحد میں پہلے اسے رکھا جاتا اور فرمایا کہ قیامت کے روز میں ان لوگوں کا گواہ ہوں۔ آپ ﷺ نے انہیں خون آلودہ دفن کرنے کا حکم دیا؛ انہیں غسل دیا گیا نہ اُن پر نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب الجنائز، باب الصلاة على الشهيد، ۱: ۴۵۰، رقم: ۱۲۷۸

۲۔ ترمذی، السنن، كتاب الجنائز، باب ما جاء في ترك الصلاة على الشهيد، ۳: ۳۵۴، رقم: ۱۰۳۶

۳۔ نسائي، السنن، كتاب الجنائز، باب ترك الصلاة عليهم، ۴: ۶۲، رقم: ۱۹۵۵

ستر شہداے اُحد میں سے کسی ایک کی بھی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی گئی۔ کیوں؟ اس عمل سے سپہ سالارِ اعظم ﷺ نے اُمت کو یہ تعلیم دے دی کہ جنازہ تو مُردوں کا پڑھا جاتا ہے، یہ تو زندہ ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا تھا، پریشانی کا عالم تھا، سب کے دل زخمی اور لہو رنگ تھے۔ اس لیے آقاے دو جہاں ﷺ انہیں حوصلہ دینا چاہتے تھے۔ حالانکہ امام الانبیاء ﷺ نے اس سے پہلے شہدا کے جنازے پڑھائے تھے مگر اس دن کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ یہ حضور نبی اکرم ﷺ کا فیصلہ ہے جو چاہیں وہ کر دیں۔ اَہلِ اسلام کے لیے وہی دین ہے۔ کوئی حضور ﷺ کے عمل کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ کیوں کیا؟ اس لیے کہ اِدھر 'کیوں' کہنا ایمان سے خارج کر دیتا ہے۔ آقا ﷺ جو بھی کر دیں وہی دین ہے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ شہادت کا ایک تصور دینا چاہتے تھے تاکہ مسلمانوں کا عقیدہ پختہ ہو جائے کہ شہید زندہ ہوتے ہیں۔

۱۲۔ ہر آزمائش کے بعد بشارت ہے

اَہلِ حق کے لیے آزمائش ایک لازمی چیز ہے۔ اس بات کو قرآنِ مجید یوں بیان کرتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ.[1]

اور ہم ضرور بالضرور تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے۔

مذکورہ آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا کہ ہم تمہیں ضرور بالضرور آزمائیں گے۔ کبھی خوف دے کر، کبھی بھوک دے کر آزمائیں گے۔ کبھی نوکری چلی جائے گی، روزگار خراب ہو جائے گا، مالی مشکلات آ جائیں گی، وسائل نہیں ہوں گے، تنگی آ جائے گی تو غربت اور بھوک دے کر آزمائیں گے۔ کبھی جانی نقصان دیں گے۔ کبھی

(۱) البقرة، ۲: ۱۵۵

پھلوں کا نقصان ہو جائے گا (اولاد اور دیگر سہولتیں بھی پھل ہیں)۔ تمہارے کاروبار میں نقصان سے تمہیں آزمائیں گے۔

قرآن مجید کی ہر بات ایسے لگتی ہے جیسے یہ آیت آج ہی کے ماحول کے حوالے سے نازل ہوئی ہو۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے یہ آیت ۱۷ جون ۲۰۱۴ء (سانحہ ماڈل ٹاؤن) کے حوالے سے اُتری ہے۔ تحریک منہاج القرآن کے کارکنان مذکورہ آیت میں بیان کیے گئے ہر امتحان اور ابتلا سے گزرتے ہوئے الحمد للہ سرخرو ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ایک چیز کھول کھول کر بیان فرما دی ہے کہ کس طرح مومنین کو آزمایا جاتا ہے۔ اس آیت کو صرف آج کے ہی نہیں بلکہ ہر دور کے مسلمان اسی طرح سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے لیے ہی نازل ہوئی ہے۔ یہی تو اللہ تعالیٰ اور بندے کے کلام میں فرق ہے۔ کلامِ الٰہی جب بھی پڑھا جاتا ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آج کے حال کے مطابق ہے۔

ان آزمائشوں کو بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا:

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَo(1)

اور (اے حبیب!) آپ (ان) صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیںo

یہاں ایک بڑا لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب تک آزمائشوں کی قسمیں بیان نہیں کی تھیں، اس وقت تک خطاب يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا فرما کر مومنوں سے تھا۔ لیکن جب خوش خبری سنانے کا وقت آیا تو حضور نبی اکرم ﷺ کو مخاطب فرما کر کہا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ ان کو نوید سنا دیں۔ ایسا اسلوب کیوں اختیار فرمایا؟

فطری چیز ہے کہ جب بندہ اتنی آزمائشوں، مصائب اور شہادتوں کا تذکرہ اور ان پر صبر کی تاکید سنتا ہے تو بشری تقاضے کے مطابق کچھ سوچیں پیدا ہوتی ہیں، جن سے بندہ گھبرا جاتا ہے کہ بھوک سے آزمایا تو کھانے کو کچھ نہیں ملے گا، نجانے کتنے دن بھوک میں رہیں گے؟ جابر، ظالم اور بدمعاشوں کے خوف سے نہ جانے کب تک جان و مال اور عزت کا ڈر رہے گا؟ مال

(۱) البقرة، ۲: ۱۵۵

لٹ جائیں گے، کاروبار نہیں رہے گا، اپنی جانیں چلی جائیں گی، ملازمت چلی جائے گی تنخواہیں بند ہو جائیں گی تو گھر کا چولہا کیسے جلے گا؟

اِس تمام انسانی فطرت کے پیشِ نظر کہ کہیں یہ سب کچھ سن کر میرے بندے گھبرا ہی نہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے آگے اہلِ ایمان سے خطاب نہیں کیا بلکہ اب خطاب کا رخ بدل دیا۔ فرمایا: میرے محبوب! اگلی بات آپ بتائیں: ان صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دو۔ محبوب! کہیں یہ لوگ ڈر نہ گئے ہوں، گھبرا نہ گئے ہوں، لہٰذا ان کو خوش خبری آپ سنا دیں تاکہ ان کی ڈھارس بندھ جائے، ان کا حوصلہ بڑھ جائے۔ یہاں اللہ تعالیٰ خود بھی تو فرما سکتا تھا کہ بَشَارَةٌ لِّلصَّابِرِيْن (صابروں کے لیے خوش خبری ہے) یا أُبَشِّرُ لِلصَّابِرِيْن (میں صابروں کو خوش خبری دیتا ہوں)۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ نہ فرمایا، بلکہ فرمایا: محبوب! میں نے ساری آزمائشوں کی قسمیں بیان کر دی ہیں کہ یوں کروں گا، ایسا کروں گا، خوف دلاؤں گا، بھوک آئے گی، جان چلی جائے گی، نوکری ختم ہو جائے گی، پھل چلے جائیں گے۔ سب کچھ بیان کر دیا ہے اب کہیں یہ گھبرا نہ گئے ہوں گے۔ اے میرے محبوب! آپ ان سے بہت پیار کرتے ہیں، لہٰذا اِنہیں خوش خبری بھی آپ خود ہی سنا دیں کہ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ یعنی صبر کرو گے تو خوش خبری ملے گی۔

اِس فرمانِ الٰہی سے صبر کرنے والوں کا مقام واضح ہوا کہ ان کو صبر کرنے پر خوش خبری آقا ﷺ کے وسیلے سے میسر آتی ہے۔

۱۳۔ صابرین کا طرزِ عمل

خوش خبری دینے کے بعد فرمایا کہ میرے محبوب ان کو بتا دیں کہ صبر کرنے والے وہ ہیں کہ جب بھی کوئی آزمائش، مصیبت، مشقت، پریشانی یا کوئی تکلیف آئے تو ان کے لبوں پر ہر وقت اور ہر حال میں یہی کلمات مچلتے ہیں:

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ○ (1)

---

(۱) البقرة، ۲: ۱۵۶

بے شک ہم بھی اللہ ہی کا (مال) ہیں اور ہم بھی اسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں○

یعنی مولا تیرا ہی مال ہے، تو نے ہی دیا تھا اور تو نے ہی لے لیا۔ نوکری بھی تو نے ہی دی تھی تو نے ہی لے لی۔ مولیٰ! سب کچھ تیرا ہی تو ہے۔ فرمایا: جو شخص زبان سے یہ کہے اور اس کا دل بھی اس کی تصدیق کرے تو وہ صابر ہے۔ وہ بھوکا ہو کر بھی یہ مناجات کر رہا ہوگا، مولیٰ! جو کھانا کھاتے تھے وہ بھی تو نے دیا تھا، آج اگر نہیں ملا، فاقہ آ گیا، چولہا نہیں جلا تو کیا ہوا؟ مولیٰ! ہم کھا کر بھی تیری رضا پر راضی تھے اور آج نہ کھا کر بھی خوش ہیں۔ مولیٰ! راحت بھی تو نے عطا کی تھی اور آج تکلیف بھی تیری ہی دی ہوئی ہے۔ مالک! ہم تیرے ہیں، ہم راحت میں بھی خوش تھے اور اب تکلیف میں بھی خوش ہیں۔

عام معاشرتی زندگی میں جب ہم کسی سے تعزیت کرنے اور دوسروں کے غم میں شریک ہوتے ہیں تو یہ جملہ ہر کوئی بولتا ہے: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ۔ ہم لفظوں والے لوگ ہیں، لہٰذا دل سے نہیں بلکہ صرف زبان ہی سے یہ الفاظ ادا کرتے ہیں، اس کی تہہ میں نہیں جاتے کہ اس میں کیا کہا گیا ہے؟ اس آیت میں بندے کو یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ صابر بندہ وہ ہے جو تکلیف، غم اور پریشانی پر نظر نہیں رکھتا بلکہ کہتا ہے کہ مولیٰ! میں خود بھی تیرا ہوں، تو جیسے چاہے کر دے اور ہم تو تیرے ہی ہیں۔

۱۴۔ بندگی کے تقاضے اور اِنعام

حضرت فضیل بن عیاض سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے بندگی کس سے سیکھی؟ فرمایا: میں نے بندگی کے اُصول اپنے غلام سے سیکھے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میرا ایک غلام تھا۔ میں جب اسے خدمت کے لیے بازار سے خرید کر لایا تو غلام سے پوچھا: بیٹے! تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: جو جی میں آئے اسی سے بلا لیا کریں، غلاموں کا بھی بھلا کوئی نام ہوتا ہے۔ میں جب غلام ہو گیا تو نام میں کیا رہا۔ پوچھا: کھاتے کیا ہو تاکہ جو تمہاری پسند ہو اس کا اہتمام کر دیا کریں؟ اس نے کہا: جو آپ چاہیں کھلا دیں، غلام کی پسند، ناپسند کیا۔ فرمایا: پہنتے کیا ہو؟ کہا:

غلام کو جو لباس بھی دے دیں، وہ پہن لے گا۔ حضرت فضیل بن عیاض نے فرمایا: وہ میرا غلام ہو کر مجھے ایسے جواب دیتا تھا۔

ہم بھی آخر کسی کے بندے اور غلام ہیں مگر افسوس کہ اپنے حقیقی مالک سے ہمارا ایسا تعلق نہیں ہے۔ ہم اس کی غلامی کا اقرار بھی کرتے ہیں مگر پھر بھی اپنی پسند و ناپسند کے پیچھے پڑے رہتے ہیں کہ 'مولیٰ یہ کیوں ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ ایسا کیوں ہوا؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، میرے ساتھ ہی کیوں؟' اگر ہم ایسی باتیں کریں تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اس کے بندے اور غلام تو نہ ہوئے۔ وہ مالک ہے جیسے چاہے ویسے رکھے۔

قابلِ غور بات ہے کہ اَئمہ اَہلِ بیت اَطہار اور ہمارے اسلاف پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ کُنْ فَیَکُوْن کے مالک رب نے اَئمہ اَہلِ بیت اَطہار علیہم السلام کے ساتھ یہ سب کچھ ہونے دیا۔ اگر وہ چاہتا تو ظالموں کو ظلم نہ کرنے دیتا، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کے صبر و استقامت کو دکھانا اور اُنہیں مومنین کے لیے اُسوہ بنانا چاہتا ہے کہ اتنی تکالیف کے باوجود اُن کی زبان پر کبھی گلہ و شکوہ جاری ہی نہیں ہوتا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کے کلمات کا راز یہ ہے کہ خواہ کیسی بھی صورت ہو جائے بندے کو اس کلمہ کے ذریعے ہر حال میں بندگی سکھائی گئی ہے کہ باری تعالیٰ کوئی بات نہیں، نفع و نقصان، سود و زیاں سب تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو ہی مالک ہے! ہم تیرے ہی ہیں، تیری طرف سے ہی آئے اور تیری طرف ہی لوٹ جانے والے ہیں۔ ہم تجھ سے شکوہ کرنے والے کون ہوتے ہیں؟

اللہ رب العزت نے فرمایا: میرے محبوب! جو اِس انداز کے ساتھ اپنی بندگی میرے سپرد کر دے ان کو یہ خوش خبری سنا دے:

اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ قف وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ○[1]

(۱) البقرۃ، ۲: ۱۵۷

یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے پے در پے نوازشیں ہیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیںo

یعنی اس طرزِ عمل اور اس سوچ پر اللہ تعالیٰ سے ان کا تعلق ایسا ہو جائے گا کہ اللہ ان پر اپنی نوازشوں کی بارش کر دے گا اور ان پر درود بھیجے گا۔ انہیں اپنی قربت عطا کرے گا، اپنی خاص مجلس میں لائے گا، خاص عنایات سے نوازے گا اور ان پر خصوصی فضل فرمائے گا۔ دراصل یہی وہ لوگ ہیں جو ان مشکل حالات میں بھی صابر رہتے ہیں اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ صرف ان کی زبان کی حد تک نہیں بلکہ ان کے قلب و باطن کی کیفیت کا عکاس ہوتا ہے۔

۱۵۔ مقامِ صبر اور عظیم صابرین کا بیان

قرآن مجید میں صبر کے حوالے سے بڑی لطیف بات آئی ہے کہ صبر کرنے والوں کو کیا ملتا ہے؟ جب کفار و مشرکین آپ ﷺ پر طعنہ زنی کرتے اور آپ ﷺ کو ہر طرح سے ستاتے تو قرآن حکیم میں ارشاد ہوا:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا.[1]

اور (اے حبیبِ مکرّم! اِن کی باتوں سے غمزدہ نہ ہوں) آپ اپنے رب کے حکم کی خاطر صبر جاری رکھیے بے شک آپ (ہر وقت) ہماری آنکھوں کے سامنے (رہتے) ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں صبر کی بنیاد محبت پر قائم کی گئی ہے۔ یعنی اے محبوب! آپ مشکلات و مصائب کی طرف نہ دیکھیے بلکہ اللہ رب العزت کی طرف دیکھیے، ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری خاطر صبر کریں۔ جب آپ صبر کریں گے تو اس کے بدلے آپ کو ہماری نگاہِ محبت اور توجہ ہمیشہ حاصل رہے گی کہ محبوب آپ چونکہ ہماری خاطر صبر کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم ہر وقت آپ ہی کو تکتے رہتے ہیں۔

---

(۱) الطور، ۵۲:۴۸

یہ آیتِ مبارکہ عربی گرائمر کے مطابق جملہ اِسمیہ ہے۔ جملہ اِسمیہ کی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ ایک طرف دشمن مخالف ہیں؛ وہ دکھ، درد، رنج و الم اور مختلف انداز سے ایذا دے رہے ہیں اور دوسری طرف محبوب کا نظارہ ہے، ایسا حسین اور دل کش منظر ہے کہ وہ اسی طرف تکتے جا رہا ہے۔ محبوب! اب یہ آپ کا انتخاب ہے کہ چاہیں تو دھیان دشمن کی اذیتوں کی طرف کر لیں اور چاہیں تو دھیان میری طرف کر لیں۔ اگر آپ ﷺ اُس طرف دھیان کر لیں گے تو دشمنوں کی طعنہ زنی اور ستانا بھول جائیں گے۔ بس اس کا نام صبر ہے۔

صبر میں دو جہات ہیں:

(۱) اِدھر دشمن کے مصائب و آلام کی طرف دھیان نہ کرنا۔

(۲) اُدھر اللہ تعالیٰ کے دیدار وتوجہ کی طرف دھیان کرنے میں مصروف رہنا۔

نفسِ نبوت کے سوا باقی جتنی نعمتیں اللہ رب العزت اپنے نبی کو عطا فرماتا ہے، ان ساری نعمتوں میں سے نبی کی نسبت سے کچھ حصہ اُمت کو بھی نصیب ہوتا ہے۔ یعنی حضور نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ جتنی بھی نعمت عطا فرماتے ہیں تو ہر امتی کو اس کی بساط کے مطابق اس میں سے فیض ملتا ہے۔ حضور ﷺ کو اللہ کا شفقت سے تکتے رہنا آپ ﷺ کے صبر پر اللہ کی نعمت ہے اور اس نعمت کا کچھ حصہ حضور ﷺ کی نسبت سے آپ ﷺ کی اُمت کو بھی عطا ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو صبر کرے گا، اللہ اس بندے کو بھی اپنے دھیان وتوجہ اور نگاہِ لطف و کرم میں رکھے گا۔

بس یہ ایک سودا ہے۔ دنیا داروں کی گالیوں سے کچھ نہیں بگڑتا۔ اگر اللہ کی توجہ حاصل ہو رہی ہے تو اس کے بدلے میں دنیا کے طعن و تشنیع مہنگا نہیں بلکہ سستا سودا ہے۔ اللہ رب العزت کی اس عنایت پر تو خوش ہونا چاہیے نہ کہ رنجیدہ بلکہ گالی دینے اور طعنہ زنی کرنے والے کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے کہ اس نے برا بھلا کہا۔ آپ کے درگزر کرنے پر اللہ نے آپ کو اپنی نگاہِ خاص میں لے لیا۔ انبیاے کرام علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صبر کی عظیم مثالوں کے بعد اب ہم چند ائمہ، صوفیاء اور اولیاء کرام کی صبر و استقامت کے واقعات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

(۱) امام اَعظم ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) - محسودِ اَعظم

اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد اُمتِ مسلمہ میں امام اعظم حضرت ابو حنیفہ سے بڑا کوئی عالمِ دین نہیں ہے۔ اصل مراتب تو اللہ بہتر جانتا ہے، مگر خدمتِ دین کے اعتبار سے آپ کا مقام کیا تھا اسے حضور داتا گنج بخش نے اپنے ایک خواب میں کچھ یوں بیان فرمایا:

> حرمِ کعبہ میں بابِ بنو شیبہ سے حضور نبی اکرم ﷺ تشریف لا رہے ہیں اور آپ ﷺ نے اپنی آغوش مبارک میں ایک بچہ اٹھایا ہوا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ بھلا یہ سعید بچہ کون ہوسکتا ہے؟ میں حضور ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا اور قدم بوسی کے بعد عرض کیا۔ حضور! یہ بچہ کون ہے، جسے آپ نے اتنی شفقت سے اٹھایا ہوا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اے علی ہجویری: یہ تمہارے امام ابو حنیفہ ہیں۔ حضور داتا صاحب فرماتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ اس مبارک خواب کی تعبیر یہ ہے کہ جس طرح وہ اپنے پاؤں پر نہیں چل رہے اور حضور ﷺ نے انہیں اپنی گود میں اٹھایا ہوا ہے اور ان کی رفتار سرورِ کائنات ﷺ کے سنبھالنے سے ہے یعنی جب یہ دین و شریعت میں چلتے ہیں تو حضور ﷺ کی حفاظت میں چلتے ہیں اور ان کے سنبھالنے سے ہی سنبھلتے ہیں۔[1]

امام ابو حنیفہ، امام شافعی کے دادا استاد اور امام احمد بن حنبل کے پردادا استاد تھے۔ انہوں نے چالیس برس تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا فرمائی۔[2] ان کا شمار عظیم تابعین میں ہوتا ہے۔ حدیث اور فقہ کے عظیم امام تھے، مگر ان کے ساتھ کیا ہوا؟ اس ضمن میں سمجھنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ ان کی عمر کا ایک طویل عرصہ پسِ زنداں بسر ہوا اور انتہا یہ کہ ان کا جنازہ بھی جیل سے نکلا تھا۔[3] وہ صبر کی انتہائی کٹھن منزلوں سے نکلے۔ امام اعظم کے خلاف جتنا حسد کیا

---

(۱) علی الهجویری، کشف المحجوب: ۳۰۵

(۲) خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ۱۳: ۳۵۵

(۳) ابن حجر مکی، الخیرات الحسان: ۹۲

گیا شاید ہی کسی اور کو اتنا حسد نصیب ہوا ہوگا۔ نصیب کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ جس کے خلاف جتنا حسد کیا جائے اسی قدر اجر و ثواب بھی اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے۔ ان پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ آپ اپنی غایت اور اپنی رائے سے دین کی تاویل کرتے ہیں۔ ان کا معمول تھا کہ جب بھی اطلاع ملتی کہ کسی نے غیبت کی ہے تو اس کے گھر تحفہ بھیجتے اور شکریہ ادا فرماتے کہ آپ نے اپنی نیکیاں میرے نامۂ اعمال میں منتقل کر دی ہیں۔[1]

(۲) امام مالک بن انس (م ۱۱۰ھ) کا صبر و اِستقامت

مشہور فقہی مذہب مالکیہ کے بانی امام مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو بن الحارث الاصبحی المدنی دار الہجرۃ (مدینہ طیبہ) کے امام، حافظِ حدیث اور فقیہِ امت تھے۔ ان کا خاندان جاہلیت اور اسلام دونوں میں معزز تھا۔ ان کے جد امجد ابو عامر نے اسلام قبول کیا اور انہوں نے غزوۂ بدر کے سوا باقی تمام غزوات میں حضور نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ شرکت کی۔[2]

امام مالک اپنے دور کے عظیم محدث، مجتہد، اور اَہلِ تصوف میں سے تھے۔ ان کے حلقہ درس میں تمام عالمِ اسلام سے لوگوں کی کثیر تعداد شریک ہوتی تھی۔ وہ حضور نبی اکرم ﷺ سے شدید محبت رکھتے تھے۔ اسی لیے آخری عمر میں مدینہ منورہ سے باہر نہیں گئے کہ کہیں شہر مدینہ سے باہر وفات نہ ہو جائے۔

امام مالک کو اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام سے بھی خاص جبی تعلق تھا۔ جب آپ نے اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام کی محبت میں عباسی خلیفہ کے خلاف نفس زکیہ کی حمایت کا اِعلان کیا تو ایک طلاق کے مسئلے کو بہانہ بنا کر بنو عباس کے حکمرانوں نے ان کو محبت و مودتِ اَہلِ بیت کی سزا دی۔ یہاں تک کہ ان کے سر اور داڑھی کو مونڈھ دیا اور سواری پر بٹھا کر مدینے کی گلیوں میں

---

(۱) ۱۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ۱۳: ۳۶۱
۲۔ محمد بن یوسف صالحی، عقود الجمان: ۲۳۶
(۲) ۱۔ ذهبی، تذکرة الحفاظ، ۱:۲۰۷
۲۔ أیضاً، تاریخ الإسلام، ۱۱:۳۱۸

گھمایا اور حکم دیا کہ سب کو بتاؤ کہ میں امام مالک ہوں۔ آپ کہتے جاتے: جو مجھے پہچانتا ہے پہچان لے کہ میں کون ہوں اور جو مجھے اس حال میں دیکھ کر نہیں پہچان رہا، وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں۔ اس واقعہ کے بعد آپ پچیس (۲۵) سال تک گھر میں گوشہ نشین رہے اور باہر نہیں نکلے۔[۱]

حکمرانِ وقت کی مخالفت کی پاداش میں آپ کو کوڑے بھی مارے گئے۔ لیکن آپ نے اس ابتلاء و آزمائش کے دور میں بھی صبر و رضا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ امام مالک کو عباسی خلیفہ جعفر بن سلیمان عباسی کے حکم پر جب کوڑے مارے جاتے تو آپ بے ہوش ہوجاتے۔ مگر جونہی ہوش آتا تو پہلا جملہ یہ بولتے کہ میں نے کوڑے مارنے اور مروانے والے کو معاف کردیا۔ پھر کوڑے لگتے اور کوڑے کھا کر بے ہوش ہوجاتے، مگر ہوش میں آتے ہی انہیں معاف کر دیتے۔ امام مالک سے جب معاف کرنے کی وجہ پوچھی گئی تو فرمانے لگے: خلیفہ کی نسبت چونکہ اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام سے ہے، اس لیے اُس نسبت کا حیا کرتے ہوئے میں اُسے معاف کر رہا ہوں۔ ساتھ ساتھ اِس لیے معاف کیے جا رہا ہوں کہ مجھے خدشہ ہے ان کوڑوں کی وجہ سے اگر میری موت واقع ہوگئی اور میں نے معاف نہ کیا تو کہیں مجھ پر ظلم کرنے کی وجہ سے حضور نبی اکرم ﷺ کے چچا سے تعلق رکھنے والا یہ شخص آخرت میں سزا کا مستحق نہ ٹھہر جائے۔[۲]

(۳) امام محمد بن ادریس الشافعی (م۲۰۴ھ) کا صبرِ عظیم

عالم العصر، ناصر الحدیث، فقیہ الملۃ امام محمد بن ادریس الشافعی نسباً رسول اللہ ﷺ کے رشتہ دار اور آپ ﷺ کے چچا کے بیٹے تھے۔ آپ نے علوم شرعیہ میں نمایاں مقام حاصل کیا اور سیدِ اہلِ زمانہ کے منصب پر فائز ہوئے۔[۳] تفقہ فی الدین، اَحکام میں استدلال اور مسائل میں دقتِ نظری کے پیشِ نظر آپ اپنے دور کے مجددِ امت کہلائے اور فقہی مذہب شافعیہ کے بانی

(۱) ذهبي، سير أعلام النبلاء، ۸: ۴۸-۸۰
(۲) ابن حجر ہيتمي، الصواعق المحرقة، ۲: ۶۸۳
(۳) ذهبی، سير أعلام النبلاء، ۱۰: ۵-۶

تھے۔ امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے علاوہ جلیل القدر ائمہ کے شاگرد اور علماء کے ایک جم غفیر کے شیخ اور امام تھے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کے فرامین پر عمل پیرا ہوتے ہوئے امام شافعی کو اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام سے شدید محبت تھی۔ لیکن معاصرین نے حسد و بغض کی بنا پر ان پر شیعہ اور رافضی ہونے کے فتوے لگائے اور (معاذ اللہ) انہیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا۔ اس پر امام شافعی نے وہ مشہور اشعار کہے جن میں سے ایک شعر یہ ہے:

اِنْ كَانَ رِفْضًا حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ
فَلْيَشْهَدِ الثَّقَلَانِ اَنِّيْ رَافِضِيٌّ[1]

اگر آلِ محمد سے محبت کرنے کا نام رافضی/شیعہ ہو جانا ہے تو سارا جہان جان لے کہ میں شیعہ ہوں۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ امام شافعی کا فقہ مالکی کے ایک عالم فتیان بن ابی السمح سے مناظرہ ہوا۔ اس میں اُسے علمی شکست ہوئی تو وہ طیش میں آ گیا اور اُس نے آپ کو زد و کوب کرنا شروع کر دیا، بلکہ اُس کے حامیوں نے بھی امام شافعی کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس پر ان کی طبیعت بگڑ گئی اور اسی بنا پر امام شافعی کا وصال ہوگیا۔[2]

(۴) امام احمد بن حنبل (م۲۴۱ھ) کی اِستقامت

امام احمد بن حنبل کی عظمت بیان کرنے کے لیے اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ فقہ میں شہنشاہِ بغداد سیدنا عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ آپ کے پیروکار ہیں۔ آپ کی کرامات کی کتاب میں تحریر ہے کہ فقۂ حنبلی کا دائرہ سمٹ رہا تھا اور امام احمد بن حنبل نے خواب میں حضور ﷺ کی بارگاہ میں التجا کی کہ حضور! میرا فقہ بھی تو آپ کی شریعت کی ہی خدمت ہے اور اب وہ ختم ہو رہا ہے،

---

(۱) أبو نعيم، حلية الأولياء، ۹: ۱۵۳

(۲) ذهبي، تاريخ الإسلام، ۱۴: ۲۹۲

اگر آپ اپنے بیٹے شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرما دیں کہ وہ میرے مسلک کو اپنا لیں تو یہ مذہب بھی فروغ پا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عبد القادر چاروں مذاہب ہماری ہی شریعت کی خدمت ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اِرشاد پر شیخ عبد القادر جیلانی نے رضی اللہ عنہ نے حنبلی مذہب کے اِحیاء کے لیے اسے اپنا لیا۔[1] اندازہ کیجیے کہ اتنے بڑے امام جن کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بذاتِ خود سفارش فرمائی ہو، ان کی عظمت کا عالم کیا ہوگا؟

فتنہ خلقِ قرآن کے خلاف حق پر ڈٹ جانے کی پاداش میں امام احمد حنبل کو اٹھارہ (۱۸) سے تیس (۳۰) مہینے قید بامشقت میں رکھا گیا۔ آپ کو لوہے کی موٹی موٹی چار زنجیریں پہنائی جاتیں اور کہا جاتا تھا کہ ان کے ساتھ چل کر دکھاؤ۔ وہ چلنے کے لیے جیسے ہی قدم اٹھاتے تو وہاں کوڑے مارے جاتے۔ یوں ان کے ایک ایک قدم پر کئی کئی کوڑے اندھا دھند برسائے جاتے۔

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ خود بیان فرماتے ہیں کہ خلیفہ معتصم باللہ ہر صحت مند جلاد کو حکم دیتا کہ صرف دو کوڑے پورے زور سے لگائے اور اگلے دو کوڑوں کے لیے تازہ دم جلاد کو بلایا جاتا۔ اِس طرح باری باری تیسرا، چوتھا اور پھر پانچواں جلاد آتا۔ اندازہ کریں کہ امام احمد بن حنبل پر کتنے مصائب و آلام ڈھائے گئے اور کس قدر ظلم روا رکھا گیا۔

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ ہی بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مجھے اتنے کوڑے مارے گئے کہ میں شدتِ درد سے بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش میں آیا تو میرے پاؤں سے بیڑیاں اتاری جا چکی تھیں اور میں زخمی حالت میں اُوندھے منہ زمین پر چت پڑا تھا۔ میں نے وہاں موجود افراد سے پوچھا کہ بے ہوش ہوجانے کے بعد میرے ساتھ کیا ہوا؟ لوگوں نے بتایا کہ جب آپ بے ہوش ہو کر گر گئے تو پھر آپ کے جسم پر کوڑے برسائے گئے۔ بعد ازاں سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ انہیں پاؤں کے ساتھ روندا جائے۔ آپ کے جسم کو بے شمار ٹھڈے مارے گئے اور اندھا دھند کچلا گیا۔ آپ کے جسم کو اس قدر روندا گیا کہ وہ لہولہان ہو گیا اور آپ میں مزید

---

(۱) محمد صادق القادری، تفریح الخاطر فی مناقب الشیخ عبد القادر: ۳۹

سہنے کی سکت نہ رہی۔[1]

اندازہ کیجیے کہ امام احمد بن حنبل، جنہوں نے کروڑوں اَفراد کو حضور ﷺ کی شریعت کا راستہ بتایا، ان کے ساتھ اتنا برا سلوک روا رکھا گیا۔ واضح رہے کہ حق کا راستہ اپنانے والوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

(۵) امام بخاری (م۲۵۶ھ) فتوؤں کی زد میں

روئے زمین پر قرآن مجید کے بعد سب سے مقبول کتاب 'صحیح البخاری' ہے۔ اس بلند رُتبہ کتاب کے جامع امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری کے مقام سے کون شخص واقف نہیں ہے۔ ان کا حافظہ بے مثال تھا۔ خود بیان فرماتے ہیں:

مجھے ایک لاکھ صحیح احادیث اور دو لاکھ غیرِ صحیح احادیث یاد ہیں۔[2]

مندرجہ ذیل واقعہ بھی امام بخاری کے مقامِ حدیث پر وافی شافی گواہ ہے۔ جب امام بخاری بغداد گئے تو وہاں کے محدّثین نے ان کے حافظے کو آزمانے کا پروگرام بنایا۔ انہوں نے سو اَحادیث لے کر ان کے متون اور اسانید کو تبدیل کر دیا۔ ایک اِسناد کا متن دوسری سند کے ساتھ لگا دیا اور اور ایک متن کی سند دوسرے متن کے ساتھ لگا دی۔ انہوں نے دس افراد چُنے جن کو دس دس احادیث دے دی گئیں۔ پھر حلقۂ درس کا آغاز ہوا جس میں اَہلِ خراسان کے پردیسی اور بغداد کے اَصحاب الحدیث جمع تھے۔ اُن دس افراد میں سے ایک شخص امام بخاری کے پاس آیا اور ایک ایک کر کے اُن دس احادیث کے متعلق سوال کرنے لگا۔ امام بخاری نے ہر حدیث کے جواب میں فرمایا: لَا أَعْرِفُهُ (میں اسے نہیں جانتا)۔

اُس مجلس میں موجود فقہاء تو پہچان گئے کہ اِس شخص کو فہم و بصیرت حاصل ہے لیکن دیگر لوگ اسے امام بخاری کی خامی، ناکامی اور قلتِ فہم تصور کرنے لگے۔ پھر اُن دس افراد میں

(۱) ذهبی، تاریخ الإسلام، ۱۸:۱۰۷-۱۰۹

(۲) ابن أبی یعلی حنبلی، طبقات الحنابلة، ۱:۲۷۵

سے دوسرا شخص آیا اور ان تبدیل شدہ احایث کے متعلق سوال کرنے لگا۔ انہوں نے اسے بھی ہر حدیث کے متعلق یہی جواب دیا: لَا أَعْرِفُهُ (میں اسے نہیں جانتا)۔ حتی کہ اسی طرح تیسرا، چوتھا اور جمیع دس افراد مکمل ہو گئے۔ امام بخاری اُنہیں صرف یہی جملہ کہتے: لَا أَعْرِفُهُ (میں اسے نہیں جانتا)۔ پھر جب امام بخاری نے جان لیا کہ سب فارغ ہو گئے ہیں۔ وہ اُن میں سے پہلے کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تمہاری بیان کردہ پہلی حدیث اِس طرح ہے، دوسری حدیث اس طرح، تیسری اور چوتھی اس طرح ہیں یہاں تک کہ آپ نے دس کی دس بیان کر دِیں۔ آپ نے ہر متن کو اس کی اصل سند کے ساتھ اور ہر سند کو اس کے اصل متن کی طرف لوٹا دیا۔ باقی احادیث کے ساتھ بھی انہوں نے اسی طرح کیا اور تمام احادیث کے متون کو ان کی اسانید اور اُن کی اسانید کو اُن کے اصل متون کے ساتھ ملا دیا۔ لوگوں نے ان کے حافظہ کی داد دی اور ان کی فضیلت کو تسلیم کیا۔ (۱)

امام بخاری جیسے حدیث کے عالم اور حافظ پر عقیدہ خلقِ قرآن اور کفر کے فتوے لگائے گئے۔ اِنہی فتنوں کے باعث انہیں اپنی سرزمین بخارا سے نکلنا پڑا حتی کہ ان کی وفات بھی اجنبیت کی حالت میں دیارِ غیر میں ہوئی۔ (۲)

ایسے مخالف حالات اور شدید مصائب کا سامنا کرنے کے باوجود امام بخاری حق کی راہ سے ہٹے نہ احادیثِ نبویہ کی ترویج سے اپنا ہاتھ کھینچا۔

(۶) امام مسلم (م ۲۶۱ھ) کے خلاف فتویٰ

کتبِ احادیث میں صحیح البخاری کے بعد صحیح مسلم کا درجہ ہے۔ امام بخاری کی طرح امام مسلم بھی محفوظ نہ رہے اور ان پر بھی عقیدہ خلقِ قرآن کا باطل فتویٰ لگایا گیا اور طعنہ زنی ہوئی، لیکن وہ ہمیشہ حق پر قائم رہے۔ (۳)

---

(۱) ۱۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ۲: ۲۰، ۲۱
۲۔ أبو الولید الباجی، التعدیل والتجریح، ۱: ۳۰۸

(۲) ذھبی، سیر أعلام النبلاء، ۱۰: ۳۱۲-۳۱۳، ۳۱۵

(۳) ذھبی، سیر أعلام النبلاء، ۱۰: ۳۸۷-۳۸۸

(۷) امام نسائی (م۳۰۳ھ) پر بے سرو پا الزام

امام ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب النسائی بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ صحاح ستہ میں شامل کتاب ’السنن‘ کے مؤلف تھے۔ انہیں اپنے دور میں اَہلِ بیتِ اَطہار کے ساتھ محبت کی وجہ سے طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑا بلکہ ان پر شیعیت کا الزام عائد کیا گیا اور اِسی وجہ سے ان پر اتنا تشدد کیا گیا کہ ان کی شہادت کا سبب بن گیا۔ تادمِ شہادت آپ نے راہِ حق کو چھوڑا نہیں بلکہ دوسروں کے لیے قابلِ تقلید مثال قائم کی کہ اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہیے۔(۱)

(۸) حضرت مخلد بن یزید (م۱۰۰ھ) پر فتاویٰ

حضرت مخلد بن یزید وہ محدّث تھے جنہوں نے اندلس میں حدیثِ نبوی کی اشاعت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اکابر مشائخ ان کے پاس جوق در جوق آنے لگے۔ وہ کہتے کہ میں اندلس میں ایسی شجر کاری کر دی ہے جو صرف خروجِ دجال سے ہی متاثر ہوسکتی ہے۔ عوام میں ایسی پذیرائی دیکھ کر مخالفوں اور حاسدوں نے ان پر بدعتی، زندیق اور ملحد ہونے کے فتوے لگانا شروع کر دیے،(۲) لیکن ان کے پاے اِستقلال میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔

(۹) امام عبد الرزاق بن ہمام (م۲۱۱ھ) کے خلاف اِلزامات

فتنہ پروروں نے تاریخ میں کسی امام کے علمی، اخلاقی اور روحانی مقام کا حیاء نہیں کیا۔ صاحب ’المصنف‘ امام عبد الرزاق بھی طعنہ زنوں کا نشانہ بنے۔ انہیں شیعہ اور کذاب جیسے عنوانات دیے گئے۔(۳)

(۱) ۱۔ ذهبی، تذکرة الحفاظ، ۲: ۷۰۱

۲۔ ابن کثیر، البداية والنهاية، ۱۱: ۱۲۴

(۲) ذہبی، سیر أعلام النبلاء، ۱۰: ۶۲۱

(۳) ذهبی، المغنی فی الضعفاء، ۲: ۳۹۳، رقم: ۳۶۸۷

(۱۰) شیخ ذو النون مصری (م ۲۴۵ھ) کو صبر پر عظیم انعام

شیخ ذوالنون مصری کے مرتبہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس رات اُن کا وصال ہوا، ستر (۷۰) اولیاء، علماء اور عوام الناس کو حضور ﷺ کی زیارت ہوئی اور ہر ایک نے پوچھا: حضور! آپ کیسے تشریف لائے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہمارا دوست ذو النون فوت ہوگیا ہے، اس کے استقبال کے لیے آئے ہیں۔(۱) جب ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو پرندے انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے پروں سے پر ملا کر سایہ فگن ہوگئے اور انہوں نے تدفین مکمل ہونے تک سائبان تانے رکھا۔ لوگوں کو اُس دن معلوم ہوا کہ یہ ہستی کس قدر اعلیٰ مرتبے کی حامل تھی۔ پھر لوگ روتے تھے کہ کاش ان کی حقیقت ہم پر پہلے آشکار ہو جاتی۔(۲)

حضرت ذو النون مصری پر بھی مصر کے تمام علماء نے کافر، زندیق اور ملحد ہونے کا فتویٰ لگایا تھا۔ اُس وقت کے مفتیان کرام مختلف فتوے لگا کر عمر بھر انہیں پریشان کرتے رہے اور ان کے خلاف پورے زور وشور سے تحریک جاری رہی۔(۳)

(۱۱) حضرت بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) کا صبر

حضرت بایزید بسطامی اولیاء کبار کے سلطان ہیں۔ بسطام کے مفتی اَعظم حسین بن عیسیٰ نے دیگر مفتیان کو اپنے ساتھ ملا کر آپ پر کفر کے فتوے لگائے اور اتنی شدت سے تحریک چلائی کہ آپ کو جلا وطن کر دیا گیا۔ وہ انہیں (معاذ اللہ) دجال، کذاب اور لعین جیسے القابات سے نوازتے رہے؛ حتیٰ کہ اس سے آگے ایسے کلمات بھی ہیں جنہیں تحریر کرنے کی یہ قلم اجازت نہیں دیتا۔(۴)

(۱) علی الھجویری، کشف المحجوب: ۳۱۱-۳۱۲
(۲) ذھبی، سیر أعلام النبلاء، ۱۱: ۵۳۳
(۳) ۱۔ ذھبی، سیر أعلام النبلاء، ۱۱: ۵۳۴
۲۔ أیضاً، میزان الاعتدال فی نقد الرجال، ۳: ۵۳
(۴) عسقلانی، لسان المیزان، ۳: ۲۱۴، رقم: ۹۶۹

(۱۲) حضرت سہل بن عبد اللہ تستری (م ۲۸۳ھ) کی اِستقامت

حضرت سہل بن عبد اللہ کے ساتھ کئی قباحتیں منسوب کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تکفیر بھی کی گئی اور انہیں آبائی شہر سے بصرہ کی طرف نکال دیا گیا۔ وہ ہمیشہ بصرہ میں ہی رہے، یعنی ہمیشہ اِستقامت اِختیار کی اور کبھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔[1]

(۱۳) حضرت جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ) کا صبر

طریقت میں حضرت شیخ جنید بغدادی، غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانی کے پردادا پیر تھے۔ لوگوں نے ان پر بھی کافر، زندیق اور الحاد کے فتوے لگاتے ہوئے انہیں موردِ الزام ٹھہرایا، لیکن انہوں نے ہمیشہ صبر و اِستقامت کا مظاہرہ کیا۔[2]

(۱۴) حضرت ابو عبد اللہ الشجر ی پر مصائب

حضرت ابو حفص الحداد کے رفیق حضرت ابو عبد اللہ الشجر ی کو حسد، تعصب اور عناد کے باعث آبائی علاقے سے نکال دیا گیا۔ ان کے خلاف منصوبہ بندی ابو عثمان الجبری نے کی اور ان کا مقاطعہ کیا اور لوگوں کو ان سے قطع تعلق کرنے کا حکم دیا۔ یہ اُس وقت کیا گیا جب لوگ ابو عثمان سے زیادہ حضرت ابو عبد اللہ الشجر ی کی قدر و منزلت کے معترف اور ان کی طرف زیادہ مائل ہوئے۔[3]

(۱۵) حکیم ترمذی کی مخالفت

جب حکیم ترمذی نے دو کتابیں - علل الشریعة اور ختم الأولیاء - لکھیں تو انہیں بلخ کی طرف نکال دیا گیا۔ ان دو کتب کی وجہ سے انہیں شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا اور مخالفین

---

(۱) عبد الوهاب الشعرانی، لواقح الأنوار فی طبقات الأخیار: ۱۳
(۲) ابو نصر السراج الطوسی، اللمع: ۵۰۰
(۳) عبد الوهاب الشعرانی، لواقح الأنوار فی طبقات الأخیار: ۱۴

نے الزام عائد کیا کہ تو نے اولیاء کو انبیاء پر فضیلت دے دی ہے۔ ان پر بہت سختی کی گئی۔ انہوں نے اپنی ساری کتب جمع کر کے دریا میں ڈال دیں جنہیں ایک مچھلی نے کئی سال تک نگلے رکھا، پھر انہیں باہر ڈال دیا اور لوگوں نے ان سے نفع حاصل کیا۔ (۱)

(۱۶) حضرت محمد بن فضیل بلخی (م ۳۱۹ھ) پر ظلم و ستم

حضرت محمد بن فضیل بلخی کو شہر بدر کر دیا گیا اور کہا گیا کہ آپ کا ہمارے شہر میں رہنا جائز نہیں۔ لوگوں نے ان کی گردن میں رسی ڈال کر انہیں شہر کے بازاروں میں گھمایا اور شہر سے نکال دیا۔ انہوں نے ان کی طرف منہ کر کے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں سے اپنی معرفت نکال دے۔ اس کے بعد بلخ سے کوئی صوفی ظاہر نہیں ہوا حالاں کہ سب سے زیادہ صوفیاء اِسی علاقے سے ہوتے تھے۔ (۲)

(۱۷) امام ابو بکر النابلسی (م ۳۶۵ھ) پر ظلم و بربیت

امام ابو بکر النابلسی کی فضیلت، علم، زہد، استقامت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی مسندِ صدارت پر فائز ہونے کے باوجود اہلِ مغرب نے ان کے خلاف بے سرو پا باتیں کیں۔ انہیں مغرب (مراکش) سے قید کر کے مصر بھیجا گیا اور بادشاہ کے ہاں ان کے خلاف گواہیاں پیش کی گئیں۔ لیکن وہ حق پر قائم رہے۔ ان پر اس قدر ظلم و ستم کیا گیا کہ زندہ حالت میں ان کے جسم سے کھال کھینچی گئی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی اس وقت کھال کھینچی گئی جب وہ اوندھے منہ پڑے قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ قریب تھا کہ لوگ ان کی وجہ سے فتنہ میں پڑ جاتے۔ معاملہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوا تو اس ظالم نے کہا: پہلے قتل کرو پھر کھال کھینچو۔ (۳)

---

(۱) عبد الوهاب الشعرانی، لواقح الأنوار فی طبقات الأخیار: ۱۴

(۲) عبد الوهاب الشعرانی، لواقح الأنوار فی طبقات الأخیار: ۱۴

(۳) عبد الوهاب الشعرانی، لواقح الأنوار فی طبقات الأخیار: ۱۴

(۱۸) ابو القاسم نصر آبادی (م ۳۶۷ھ) پر مصائب

حضرت ابو القاسم نصر آبادی کو ان کی عظیم صلاحیتوں، زُہد و ورع اور اِتباعِ سنت کے باوجود بصرہ سے نکال دیا گیا۔ ان کے کلام اور اَحوال کا انکار کیا گیا۔ وہ ہمیشہ حرم میں رہے اور وہیں ان کا وصال ہوا۔(۱)

(۱۹) شیخ ابو عثمان المغربی (م ۳۷۳ھ) پر مصائب

شیخ ابو عثمان المغربی کو ان کے مجاہدات اور کمالِ علم و روحانیت کے باوجود مکہ معظّمہ سے نکال دیا گیا اور ان کے سر اور کندھوں پر شدید ضربیں لگانے کے بعد اونٹ پر بٹھا کر انہیں مکہ مکرمہ کے بازاروں میں گھمایا گیا۔ اس کے بعد وہ بغداد میں اقامت گزیں ہوئے اور وہیں آپ کا وصال ہوا۔(۲)

(۲۰) حضرت علی ہجویری (م ۴۶۵ھ) پر مصائب

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کے نام سے بھلا کون واقف نہیں؟ برصغیر کی سرزمین جن کے قدموں کے توسط سے اسلام کے نور سے منور ہوئی۔ وہ جب لاہور میں وارد ہوئے تو ان کے خلاف نام نہاد مفتیوں کی جانب سے فتوؤں کی بوچھاڑ کی گئی۔ بعض حلقوں کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ جو ان کی مسجد میں نماز پڑھے گا، اس کی نماز نہیں ہوگی۔ کیوں؟ اس لیے کہ مفتیانِ شہر کی جانب سے یہ فتویٰ لگایا گیا کہ ان کی مسجد کے محراب کی سمت قبلہ رُخ نہیں ہے۔ قابلِ غور بات ہے کہ اگر داتا گنج بخش کی سمت درست نہیں ہے تو اور بھلا کس کی سمت صحیح ہوگی؟ مگر فتویٰ لگاتے وقت یہ نہ سوچا گیا کہ قبلہ کا رخ تو ٹھیک ہے، البتہ مخالفین کی سوچ کا رخ ضرور غلط ہے۔ آپ نے ان سب علماء کرام کو اپنی مسجد میں بلایا اور انہیں نماز کی دعوت دی۔ جب وہ سب نماز کے لیے کھڑے ہو گئے تو فرمانے لگے: بھئی دیکھو تو سہی قبلہ کی سمت درست ہے یا

---

(۱) عبد الوهاب الشعراني، لواقح الأنوار في طبقات الأخيار: ۱۴

(۲) عبد الوهاب الشعراني، لواقح الأنوار في طبقات الأخيار: ۱۴

نہیں؟ حضرت داتا گنج بخش نے اشارہ کیا، تمام پردے ہٹ گئے اور کعبہ معظّمہ کو وہیں کھڑے کھڑے سب نے دیکھ لیا۔ ان کی اس کرامت سے سب علماء تائب ہوگئے۔ (۱)

(۲۱) قاضی عیاض (م۵۴۴ھ) پر یہودی ہونے کا فتویٰ

قاضی عیاض کی فضائل و خصائص الرسول ﷺ پر کتاب 'الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ ﷺ' آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ تعصب اور عناد کے باعث ان پر یہودیت کا الزام لگا دیا گیا اور خلیفۂ وقت مہدی نے ان کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ ان کے پائے اِستقلال میں کوئی لغزش نہ آئی۔ وہ ہفتہ کے دن گھر سے باہر نہیں نکلا کرتے تھے کیونکہ ہفتہ کے روز وہ کتاب الشفا کی تصنیف کیا کرتے تھے۔ (۲)

(۲۲) امام غزالی (م۵۰۵ھ) اور ان کی تعلیمات سے بدسلوکی

آج پوری دنیا امام غزالی کو حجۃ الاسلام کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف 'احیاء علوم الدین' ہے۔ جو کوئی اہلِ حق شریعت کے رموز و اسرار جاننا چاہتا ہے، اسے یہ شہرۂ آفاق تصنیف پڑھے بغیر چارہ نہیں ہے۔ جب یہ کتاب تحریر کی گئی تو وقت کے علماء اور مفتیِ اعظم ابو الحسن ابن حرزم نے امام غزالی کی کتاب کو جلانے کا حکم دیتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب بدعت اور مخالفِ سنت ہے۔ سب علماء نے فیصلہ کیا کہ مذکورہ تصنیف کے نسخے یک جا جمع کر کے جمعہ کے دن جلا دیے جائیں۔ اس کتاب کے تمام نسخے بحقِ سرکار ضبط کر لیے گئے۔ جس دن انہیں نذرِ آتش کیا جانا تھا، اس سے گذشتہ شب جمعرات کو اسی مفتیِ اعظم ابو الحسن نے خواب میں دیکھا کہ تخت لگا ہوا ہے اور حضور ﷺ اس پر جلوہ افروز ہیں۔ سرورِ کائنات ﷺ کے ایک طرف سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں اور دوسری جانب سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں۔ امام غزالی سامنے سے گھٹنوں کے بل حضور ﷺ کی بارگاہ میں ہاتھ میں کتاب 'احیاء علوم

(۱) دارا شکوہ، سفینۃ الأولیاء:۱۶۴

(۲) عبد الوهاب الشعرانی، لواقح الأنوار فی طبقات الأخیار:۱۵

الدین' کا نسخہ تھامے گھسٹتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے وہ نسخہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا: حضور! یہ کتاب میں نے تحریر کی ہے اور اس پاداش میں بعض علماء نے مجھ پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہوئے اس کتاب کو جلانے کے احکامات جاری کیے ہیں۔ آپ خود اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیں۔ اگر ناپسند ہے تو مجھے حکم ارشاد فرمائیں، میں خود اسے تلف کر دوں گا۔ حضور ﷺ نے کتاب کا بغور جائزہ لیا اور ارشاد فرمایا کہ غزالی یہ تو بہت اعلیٰ تصنیف ہے۔ پھر آپ ﷺ نے وہ کتاب سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو تھمائی اور فرمایا: اے ابوبکر! اس کتاب کو تم بھی دیکھو! انہوں نے عرض کیا: آقا! یہ تو بہت بے مثل کتاب ہے۔ حضور ﷺ نے پھر فرمایا: اے عمر! ذرا تم بھی دیکھو۔ انہوں نے بھی دیکھی اور کلماتِ تحسین ادا فرمائے۔ امام غزالی نے عرض کیا: حضور نے جس کتاب کو پسند فرمایا ہے، آپ ہی کی امت کے علماء اسے باعث کفرِ گردانتے ہوئے جلانے کے احکامات فرما رہے ہیں۔ یہ سن کر حضور ﷺ جلال میں آ گئے اور فرمایا: کہاں ہے وہ بدبخت جو اسے نذرِ آتش کرنا چاہ رہا ہے؟ اس وقت مجلس میں مفتی صاحب کی طرف اشارہ کیا گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس ظالم کو پکڑ لو اور جلاد کو حکم دیا کہ اسے بہتان تراشی پر کوڑے لگائے جائیں۔ پانچ کوڑوں کے بعد حضرت ابو بکر کی شفاعت اور امام غزالی کی معافی سے اسے بقیہ کوڑوں سے چھٹکارا ملا۔ جب وہ مفتی شدتِ درد سے چیخا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ بعد ازاں وہ مفتی اپنے رفقا کے ہمراہ تائب ہو گیا۔ تاریخ کی کتب میں تحریر ہے کہ دس سال بعد جب اس مفتی کا انتقال ہوا تو ان کوڑوں کے نشان اس کے جسم پر بدستور موجود تھے۔

اس واقعہ کو درج کرنے کے بعد امام تاج الدین سبکی کہتے ہیں کہ یہ حکایت صحیح ہے جسے ہم سے ہمارے ثقہ شیوخ نے عارف باللہ یاقوت الشاذلی سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے اپنے شیخ سید کبیر اللہ تعالیٰ کے ولی ابو العباس مرسی سے اور انہوں نے اپنے شیخ ولی اللہ ابو الحسن الشاذلی سے روایت کیا ہے۔[1]

اندازہ کیجیے کہ حسد و مخالفت اور سازش کا یہ سنگین عالم امام غزالی جیسی عظیم ہستیوں کے ساتھ بھی روا رکھا گیا۔

(۱) تاج الدين السبكي، طبقات الشافعية الكبرى، ٦: ٢٥٨-٢٦٠

(۲۳) حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (م۵۶۱ھ) کے خلاف حاسدانہ کارروائیاں

سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو ہر طرف ان کی ولایت کا سکہ چلنے لگا۔ ان کے عقیدت مندوں کے ساتھ ساتھ حاسدین کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ ان حالات میں بہت سے لوگ ان کی مخالفت پر تُل گئے۔ آج دنیا جنہیں پیرانِ پیر اور غوثِ اعظم کے نام سے یاد کرتی ہے اور جب تک ان کا قدم مبارک ولایت کی سند کے طور پر گردن پر ثبت نہیں ہو جاتا تب تک شرق سے غرب تک کسی کو ولایت نہیں مل سکتی۔ اندازہ کریں! اتنی عظیم شخصیت کے خلاف بھی شدید مخالفت کی تحریک چلائی گئی۔

بغداد شہر کے ایک سو علماء کا وفد تیار ہوا اور انہوں نے شاہِ جیلان پر اعتراضات اٹھاتے ہوئے ایک سوال نامہ تیار کیا۔ علماء کے اس وفد نے طے کیا کہ شیخ عبد القادر جیلانی پر اس طرح تابڑ توڑ سوالات کیے جائیں کہ وہ جواب دینا ہی بھول جائیں۔ وہ پے در پے سوالات کر کے (معاذ اللہ) آپ کو خاموش کرا دینا چاہتے تھے۔ وہ لوگ جب سوالات کے لیے آتے تو آپ نے اپنی نگاہِ ولایت ان علماء کے سینوں پر ڈالی جس سے وہ تمام علماء سوالات کرنا ہی بھول گئے۔ آپ ان سے بار بار فرماتے رہے کہ پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ مگر کسی کی کیا مجال کہ وہ کچھ بولیں، تمام کے تمام علماء ایک سوال تک نہ کر سکے۔ آپ نے پھر انہیں فرداً فرداً متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا سوال یہ تھا اور اس کا جواب یہ ہے۔ پھر دوسرے سے یہی فرمایا کہ تمہارا سوال یہ تھا اور اس کا جواب یہ ہے۔ اس طرح تمام علماء کرام کو ان کے سوالات اور جوابات سے آگاہ فرما دیا۔ یہ سن کر سب کے سب علماء کرام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

(۲۴) شیخ سید احمد الرفاعی (م۵۷۸ھ) پر مصائب

شیخ سید احمد رفاعی اپنے دور کے ولیِ کامل تھے، ان پر بھی کفر کے فتوے لگائے گئے۔ ان کی طرف سے خطوط لکھے جاتے، ان کے خلاف خطوط شائع کرائے جاتے اور (معاذ اللہ)

انہیں کافر، زندیق، ملحد، دجال، کذاب اور اس سے بھی بڑھ کر الفاظ استعمال کیے جاتے، جنہیں میں نے خود اپنی آنکھوں سے کتابوں میں پڑھا ہے، لیکن زبان پر لانا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔[۱]

(۲۵) سیدنا امام ابو الحسن شاذلی (م ۶۵۶ھ) کا صبرِ عظیم

سیدنا امام ابو الحسن شاذلی جامعہ اَزہر قاہرہ تشریف لے گئے تو وہاں کے علماء میں مناظرہ ہو رہا تھا کہ 'اللہ کا قرب ذاتی ہے یا علمی؟' آپ فرمانے لگے: اللہ کا قرب ذاتی ہے۔ انہوں نے پوچھا: حضرت! کوئی دلیل دیجئے! آپ نے فرمایا کہ دلیلیں دو اقسام کی ہوتی ہیں:

۱۔ ایک دلیل کانوں کے ذریعے سنائی جاتی ہے۔

۲۔ ایک آنکھوں کے ذریعے دکھائی جاتی ہے۔

تم کون سی دلیل چاہتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: ہم دلیلِ سمعی چاہتے ہیں۔ اس پر انہوں نے جامع خطبہ دیتے ہوئے مسئلے کو اتنے اَحسن انداز سے ثابت کر دیا کہ سب علماء انگشت بدندان رہ گئے۔ اس پر امام شاذلی فرمانے لگے کہ یہ دلیلِ سمعی تھی۔ آؤ اب دلیلِ بصری دیتا ہوں۔ جو شخص چاہے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما دے۔ رب کی عزت کی قسم! یہاں کھڑا کھڑا اسے رب کا قرب نہ دکھا دوں تو پھر کہنا!

امام ابو الحسن شاذلی کی مخالفت میں بھی سخت تحریک چلائی گئی اور کفر کے فتوے لگاتے ہوئے انہیں ملک بدر کر دیا گیا۔ انہوں نے اسکندریہ کی طرف سفر کیا مگر مخالف علماء نے وہاں کے لوگوں کو بھی مشتعل کر دیا کہ یہ (معاذ اللہ) کافر، ملحد اور زندیق ہیں۔ لہٰذا اسے اپنے ملک کی سرزمین پر قدم رکھنے نہ دینا۔ اس پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر اسکندریہ کے لوگوں نے سنگ باری کرتے ہوئے انہیں واپس لوٹا دیا۔[۲]

امام ابو الحسن شاذلی برسوں کشتی میں خانماں برباد پھرتے رہے۔ جب ان کا صبر اِنتہا

---

(۱) عبد الوهاب الشعراني، لواقح الأنوار في طبقات الأخيار: ۱۵

(۲) عبد الوهاب الشعراني، لواقح الأنوار في طبقات الأخيار: ۱۵

کو پہنچ گیا تو رب کے کرم کا بادل جھوم اٹھا اور کشتی میں 'حزب البحر' نازل ہوئی۔ آج آٹھ سو سال بعد بھی اُمت کے اولیاء اِسی 'حزب البحر' کا وظیفہ کرتے ہیں۔

(۲۶) امام تاج الدین السبکی (م ۷۷۱ھ) پر مصائب

امام سبکی کو کمالِ علم، کثرتِ مجاہدات اور اِتباعِ سنت میں بلند درجہ حاصل تھا۔ اس کے باوجود کئی بار ان کی تکفیر کی گئی حتی کہ ظالموں سے ان کی جان چھڑانے کے لیے ان سے محبت کرنے والے ایک شخص نے ان کے پاگل ہونے گواہی دی۔ سو انہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ ان کی پاکیزگی کے متعلق امام ابوالحسن الخوارزمی - جو کہ بغداد کے مشائخ میں سے ہیں - نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی ایسا جہنم نہیں ہے تو وہ سبکی کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے ایسا جہنم پیدا کرے گا جنہوں نے انہیں اذیت دی، ان کا انکار کیا اور باطل طریق پر ان کی تکفیر کی۔ (۱)

(۲۷) حضرت مجدد الف ثانی (م ۱۰۳۴ھ) پر مصائب

امام ربانی مجدد الف ثانی جن کا سر زمین ہند کے مسلمانوں پر اتنا بڑا احسان ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو آج جنوبی ایشیا کی صورتِ حال ہی کچھ اور ہوتی۔ عالمی سطح پر تبلیغِ دین کے کام اور مکتوبات کے ذریعے اس قدر پذیرائی پر ہند بھر کے علماء سیخ پا ہوگئے۔ انہوں نے حاکم وقت کو بھی خوب اُکسایا اور حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات میں ردّ و بدل کر کے مختلف انداز سے پیش کیا۔ ان کے خلاف کفر کے فتوے لیے گئے اور نتیجتاً گوالیار کے قلعے میں قید و بند کی صعوبتیں نصیب ہوئیں۔ شہنشاہ جہانگیر کے مظالم بھی اس مردِ قلندر کے پایۂ استقلال میں تزلزل نہ پیدا کر سکے۔ (۲)

---

(۱) عبد الوهاب الشعرانی، لواقح الأنوار فی طبقات الأخیار: ۱۴

(۲) ۱۔ گوکانی، جہانگیرنام/توزک جهانگیری: ۳۰۹

۲۔ فاروقی، مقامات خیر: ۴۹-۵۱

۳۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی، زبدة المقامات: ۲۹۲-۲۹۴

ہندوستان بھر میں شرق سے غرب تک ان کی مخالفت کی گئی مگر یہ تو ہند نگری میں شریعتِ مصطفیٰ ﷺ کے نگہبان تھے۔ لہٰذا نہایت ہی استقامت کے ساتھ اپنے مشن پر کاربند رہے۔ علامہ محمد اقبالؔ انہیں یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ اَحرار

(۲۸) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م۱۱۷۶ھ) پر کفر کا فتویٰ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے جب خدمت دین کا بیڑا اٹھایا اور سرزمین ہند میں سب سے پہلے قرآنِ مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، تاکہ امت کو قرآن سمجھنے میں آسانی ہو تو اس تاریخی خدمتِ دین پر بھی انہیں کفر کے فتویٰ سے نوازا گیا۔

یہ ان لوگوں کا حال ہوا جن کی عظمت، تقوی، علمی مرتبت، معرفت اور احسان کے مراتب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے سامنے ہمارا تو ذکر ہی کیا:

چه نسبت خاك را به عالم پاك

یہ عظیم ہستیاں پاک عالم تھے۔ وہ عظمت، ایمان، یقین اور استقامت کے کوہِ گراں تھے اور ہم ذرۂ بے نشاں ہیں۔ کُجا وہ عظمت کے مینار اور کُجا ہم گناہوں کی تحت الثریٰ گھاٹی کے اسیر! درحقیقت ہمیں اَعمال میں ان سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ اگر ہم زندگی ان کی پیروی میں راہِ حق پر چلتے چلے جائیں تو بڑی بات ہے۔ اگر کسی کو ان کی روش پر چلنے کا موقع ملے تو اس پر پریشانی کی ضرورت نہیں بلکہ فخر کرنے کا مقام ہے۔

۱۶۔ مصائب کا نزول کامیابی کے اعلان کا نقارہ ہے

علماءِ حق بھی ہوتے ہیں اور علماء سوء بھی ہوتے ہیں۔ سارے علماء ایک جیسے نہیں ہوتے۔ علماءِ حق کے توسط سے ہی دین کی میراث ہم تک پہنچی ہے۔ انہی علماء حق کے بارے

میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا.[۱]

بس اللہ کے بندوں میں سے اس سے وہی ڈرتے ہیں جو (ان حقائق کا بصیرت کے ساتھ) علم رکھنے والے ہیں۔

یہی لوگ خشیتِ الٰہی کے پیکر اور دین کے سچے خادم ہوتے ہیں۔ انبیاء کے ان ورثا کے توسط سے ہی دین کی میراث ہم تک پہنچی ہے۔ اس کے برعکس ہر دور میں وہ بھی رہے ہیں جن کا کام اہلِ حق کو پریشان کرنا، فتویٰ زنی اور فتنہ برپا کرنا رہا ہے۔ مگر یاد رکھیے! جس مشن کے اندر اللہ کی سچی محبت ہو، آقاے دو جہاں ﷺ کا سچا عشق ہو، اخلاص ہو، من میل سے پاک ہو، اس کی سمت گنبد خضری کی طرف ہو، انہیں اللہ رب العزت کی رحمتوں پر بھروسہ ہو اور ان کے قبلہ کی سمت درست ہو تو پھر ساری مخالفانہ تحریکیں مل کر بھی اس تحریک کا بال بیکا نہیں کر سکتیں۔

منہاج القرآن کی عظیم عالمی تحریک کے ساتھ وابستہ رہنے والے اسلام کے سچے سپاہیو! یہ مخالفتیں تو معمولی اشیاء ہیں۔ یہ تو اتنے معمولی جھونکے ہیں کہ تحریکِ منہاج القرآن کا ایک تنکا بھی ان سے ہل نہیں سکتا۔ یاد رہے! ابھی تو ہماری مخالفت میں بڑی بڑی طاقتوں نے میدان میں اترنا ہے اور ابھی شدید آندھیوں نے ہمارے خلاف حشر برپا کرنا ہے۔ ابھی تو بڑے بڑے طوفان اُٹھیں گے اور شرق تا غرب ہنگامے رونما ہوں گے مگر یہ سب گنبد خضری کے سائے میں چلنے والے مردانِ حق کے قدموں میں کبھی تزلزل پیدا نہیں کر سکتے۔ ہمارے خلاف ہونے والی صف آرائی بتا رہی ہے کہ آسمانوں پر اس عظیم مشن کی کامیابی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ رب ذوالجلال کی رحمتیں ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچانے کا تہیہ کر چکی ہیں۔ تمہارے لیے زمین پر بھی رب کی برکتوں کے دروازے کھل چکے ہیں اور آسمان سے بھی رب کی رحمتوں کا نزول شروع ہو چکا ہے۔

جنہیں حالات کے تند و تیز تھپیڑوں سے متاثر ہو کر متزلزل ہونا ہو تو ہمیں اس سے

---

(۱) فاطر، ۳۵: ۲۸

کوئی گلہ نہیں، وہ خوشی سے راہِ حق چھوڑ کر گھر بیٹھ جائیں اور جنہیں آقا ﷺ کی خاطر مصائب و آلام کو مسکرا کر برداشت کرنا ہو، وہ انہیں سر آنکھوں پر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ان مصائب کا عادی بنا لیں۔ اللہ کا فضل و کرم شاملِ حال رہا تو سب کچھ آپ کے موافق رہے گا۔ حضور ﷺ کے نعلین پاک کے صدقے ہم سلامتی کے ساتھ بین الاقوامی سطح پر احیاء اِسلام کی منزل مصطفوی انقلاب سے ہم کنار ہوں گے۔ (ان شاء اللہ۔)

ان بازاری فتوؤں سے بھلا کون سا حق کا علمبردار بچا ہے؟ ہمارے اکابرین کے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے اور ہمارا شمار تو ان کے غلاموں میں بھی نہیں ہے۔ ان حالات میں سوائے صبر کے کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ تاریخِ انسانیت گواہی دیتی ہے کہ جو حق کی راہ پر گامزن رہے ہیں، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ان کے خلاف فتنہ، فساد اور ظلم مسلط نہ کیا گیا ہو۔ یہ حق کی پہچان ہے اور کامیابی صبر میں مضمر ہے۔

۱۷۔ حق اور صبر لازم و ملزوم ہیں

اللہ رب العزت نے قرآنِ حکیم میں جہاں حق کی بات کی، وہاں صبر کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ.[(۱)]

اور (تبلیغِ حق کے نتیجے میں پیش آمدہ مصائب و آلام میں) حق پر قائم رہنے اور باہم صبر کی تاکید کرتے رہے۔

یاد رکھ لیں! اگر حق کا دامن تھامنا ہے تو صبر اختیار کرنا پڑے گا۔ یہ قرآن کا فیصلہ ہے۔ صبر تب ہوتا ہے جب مشکلات آتی ہیں۔ ان مشکلات میں استقامت سے ڈٹ جانے والوں کو ہی مددِ الٰہی کی نوید سنائی جاتی ہے۔ ارشاد فرمایا:

(۱) العصر، ۱۰۳: ۳

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا.[1]

بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ (اِس پر مضبوطی سے) قائم ہو گئے۔

یعنی جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور سب بت توڑ ڈالے تو وہ پھر اللہ کے ہو گئے۔ اس نوید کے حق دار بننے کے لیے ہمیں بھی استقامت اور صبر کے ساتھ رہنا ہے۔ ابھی ابتلاء و آزمائش آئے گی، ظلم اور مصائب آئیں گے، اس لیے کہ مصائب و آلام کے لیے وہ اپنوں ہی کو منتخب کرتا ہے۔

مصطفوی انقلاب کے داعیو! آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ آپ کو محبت اور غیرت کے لیے چنا گیا ہے۔ اس کے برعکس کئی افراد ایسے بھی ہیں جنہیں نفرت اور کدورت کے لیے چنا گیا ہے۔ یاد رکھ لیں! اگر کسی گھر میں کچھ نہ ہو تو اس میں کوئی چور یا ڈاکو نہیں آتا۔ جیب تراش اسی جیب کو ہاتھ مارتا ہے جس میں کچھ مال کی موجودگی محسوس ہوتی ہے۔ آپ اللہ کا شکر ادا کریں کہ حاسد اس لیے آپ سے حسد کی آگ میں جل رہا ہے کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے آپ پر اللہ کی نعمتوں کو نازل ہوتا دیکھ رہا ہے۔ جب وہ اپنی جھولی خالی دیکھتا ہے اور تمہارے دامن کو رب کی نعمتوں سے لبریز پاتا ہے تو وہ تم سے بھی اس نعمت کو چھین لینے کی خواہش کے پیشِ نظر مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کریں اور کسی گالی دینے والے کو بھی برا بھلا مت کہیں بلکہ اس سے اچھا سلوک کریں، یہی صبر کہلاتا ہے۔

سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی برداشت کا ایمان افروز واقعہ

ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے۔ ایک منافق شخص حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ اس شخص نے کئی بار زبان درازی کی، مگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔ آخر

(۱) فصلت، ۴۱: ۳۰

کار آپ ﷺ کو حضور ﷺ کی بارگاہ کا خیال آیا، وگرنہ آپ ﷺ تو لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ کے مصداق پروا کرنے والے نہ تھے، کوئی برا بھلا کہے تو گھبراتے نہیں تھے۔ حضور ﷺ کی بارگاہ کے ادب کی بناء پر آپ ﷺ نے اسے کچھ جواب دیا۔ اس پر حضور ﷺ کبیدہ خاطر ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ سیدنا صدیقِ اکبر ﷺ واقفِ اسرارِ نبوت اور مزاج شناسِ رسالت تھے، فوراً سمجھ گئے۔ دست بستہ عرض کیا: یا رسول اللہ! ایسا لگتا ہے کہ مجھ سے کچھ خطا سرزد ہوگئی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے ابوبکر! اس جگہ سے اس لیے اٹھ گیا ہوں کہ جب تک وہ شخص زبان درازی کر رہا تھا اور تم خاموش تھے تو اُس وقت تک اللہ رب العزت کی طرف سے مقرر کردہ ایک فرشتہ کھڑا تھا، جو تمہاری طرف سے اُسے جواب دیتا تھا؛ مگر جب تم نے جواب دینا شروع کیا تو وہ فرشتہ واپس چلا گیا۔[(۱)]

اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم کیا پسند کرتے ہیں کہ اپنا دفاع خود کریں یا فرشتے ہماری طرف داری کریں؟ اگر ہم فرشتوں کی طرف داری اور مدد کے خواہش مند ہیں تو اس کے لیے صبر کے دامن کو ہر صورت تھامنا ہو گا۔ انسان کو ہر حال میں خوش و خرم اور صابر و شاکر رہنا چاہیے۔ جس تحریک کے خلاف جتنی مخالفت ہو وہ اتنی ہی زیادہ حق پر ہے اور جس تحریک کے خلاف مزاحمتیں نہ ہوں سمجھ لیں کہ وہ تحریک راہِ حق پر مبنی نہیں ہے۔ ہمیں ان مخالفتوں کو کھلے دل کے ساتھ خوش آمدید کہنا چاہیے۔ اللہ رب العزت کے ہاں اور گنبدِ خضریٰ میں یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ ہم نے منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے۔ منزل بہت دور، سفر بہت زیادہ اور وسائل بہت کم ہیں۔ لہٰذا اللہ رب العزت اس کے لیے وقتاً فوقتاً مخالفین کی جانب سے جھونکے بھیجتا رہتا ہے۔ مخالفین کی جانب سے برپا کیے گئے یہ جھونکے ہوتے ہی اونچا اڑانے کے لیے ہیں:

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

(۱) ابو اللیث السمرقندی، تفسیر بحر العلوم، ۳: ۲۳۴

۱۸۔ صبر کرنے والوں پر اِنعاماتِ الٰہیہ کی برسات

اللہ رب العزت صبر کرنے والوں پر مختلف طرح کے انعامات نازل فرماتا ہے۔

۱۔ ان صبر کرنے والوں سے محبت بھی فرماتا ہے۔

۲۔ انہیں نوید بھی سناتا ہے کہ تم بے خوف اور بے غم ہو جاؤ۔

ارشاد فرمایا:

وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ. (۱)

اور تم جنت کی خوشیاں مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا○

گویا اُنہیں زندگی ہی میں جنت کی خوش خبریاں دے دی جاتی ہیں۔ مزید ارشاد فرمایا:

لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِی الْاٰخِرَةِ. (۲)

ان کے لیے دنیا کی زندگی میں (بھی عزت و مقبولیت کی) بشارت ہے اور آخرت میں بھی (مغفرت و شفاعت کی)۔

ان صبر کرنے والوں کے دلوں میں فرشتے آ کر الہام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہیں مبارک ہو! تمہیں خوش خبری ہو! تمہارے لیے جنت لکھ دی گئی۔ جنت کی خوش خبریاں دینا اور یہ بشارات الہامی کیفیات ہیں۔ اگلی آیت میں فرمایا:

نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِی الْاٰخِرَةِ. (۳)

ہم دنیا کی زندگی میں (بھی) تمہارے دوست اور مددگار ہیں اور آخرت میں (بھی)۔

(۱) فصلت، ۴۱: ۳۰

(۲) یونس، ۱۰: ۶۴

(۳) فصلت، ۴۱: ۳۱

صبر کرنے والوں کو فرشتے پھر ایک اور الہام و القاء کرتے ہیں کہ گھبراؤ نہیں بلکہ بے غم، بے فکر اور بے خوف رہو۔ تمہیں خوش خبری ہو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ہمیں تمہارا رفیق بنا دیا گیا ہے۔

قابلِ غور نکتہ ہے کہ صاحبانِ جرأت و استقامت کو ملائکہ خوش خبریاں سناتے ہیں کہ گھبراؤ نہیں۔ رفقاء و کارکنانِ تحریک اگر دعوت و استقامت کے عہد پر قائم رہیں تو اُنہیں جنت کی خوش خبری ہے اور ملائکہ ان کے رفیق ہیں۔ اس لیے کہ آپ منہاج القرآن کے مشن کے رفیق بنے، نتیجتاً فرشتے آپ کے رفیق ہو گئے۔ سچائی و استقامت کے ساتھ اور صدق و اخلاص کے ساتھ منہاج القرآن کے مشن کے رفیق بن کر رہیں، دعوت، توحید، استقامت پر قائم رہیں اور بے خوف ہوکر توکل کے ساتھ بڑھتے چلیں۔ یاد رکھیں! اگر رفاقت سچی ہے تو ملائکہ تمہاری رفاقت میں دے دیے جائیں گے۔

فرشے کہتے ہیں: ہمیں راہِ حق پر استقامت کے ساتھ چلنے والوں کا دنیاوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رفیق اور دوست بنا دیا گیا ہے۔ اندازہ کریں! جن لوگوں کو فرشتے خود آ کر خوش خبری سنائیں کہ ہم تمہارے دوست ہیں، اُس پیکر خاکی کی عظمت کا عالم کیا ہوگا؟ ملاء اعلیٰ پر بسنے والے نورانی فرشتے جو ہر وقت تجلیات الٰہی کی دنیا میں بستے ہیں اور وہ سراپاء نور ہیں، جن میں کوئی شر، فتنہ، بدی اور گناہ نہیں، وہ ہر وقت امر الٰہی کے تابع رہتے ہیں ، وہ ملاءِ الاعلیٰ کے ملائکہ نیچے اتر کر خود آ کر کانوں میں یہ کہیں: ''گھبراؤ نہیں کہ اللہ نے ہمیں تمہارا دوست بنا دیا ہے۔'' اس کیفیت اور اس بشر کی عظمت کا عالم کیا ہوگا۔

۱۹۔ اَہلِ حق کا قافلہ کبھی رکتا نہیں

یاد رکھیں! ہمیشہ حق کی جدوجہد زیر و بم کے ساتھ چلتی ہے۔اسی طرح جیسے زمین کے نیچے پانی چلتا ہے۔ کبھی اوپر آتا ہے کبھی نیچے جاتا ہے، اسے جہاں زمین نرم دکھائی دیتی ہے تو وہیں سے پانی چشمے کی صورت میں پھوٹ پڑتا ہے۔ اہل حق اپنی جد و جہد کو قائم و دائم اور جاری و ساری رکھتے ہیں۔ حکمرانوں کا جبر وتشدد، قتل و غارت گری اور مالی و جانی نقصانات انہیں

ان کی جدوجہد سے روک نہیں سکتے۔ شہادتیں انہیں ڈرا اور دھمکا نہیں سکتیں۔ سانحہ ماڈل ٹاؤن میں تو حکمرانوں نے قتل عام کیا، حق کے علمبرداروں کے اگر سر بھی نیزے کی نوک پر چڑھ جائیں تو اہل حق نہ ڈرتے ہیں اور نہ ہی شکست خوردہ ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ اہل حق کا سفر ہمیشہ قربانیوں کے ساتھ جاری رہا ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔

کارکنان تحریک کو خوش خبری ہو! ہم ان کی راہ پر ہیں جن کے سر کٹے اور نیزوں پر قرآن پڑھنے لگے اور ظالم حکمران ان کی راہ پر ہیں جو دمشق کے تخت پر یزید بن کر فتح کا جھوٹا شادیانہ بجاتے تھے۔ ہم یزید اور یزیدیت کے پیروکار نہیں بلکہ ہم حسین علیہ السلام اور حسینیت کا علم اٹھائے ہوئے ہیں۔ حسین علیہ السلام اور حسینیت کو کبھی شکست نہیں ہوئی۔ حسینیت ہمیشہ سے فتح یاب ہے اور رہے گی۔ جو اہل حق امام حسین علیہ السلام کی راہ پر چلنے والے ہیں وہ ہمیشہ فتح یاب ہیں اور دشمن خائب و خاسر ہے۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کے لیے آئین وقانون میں رہتے ہوئے جدوجہد جاری رکھیں اور اس میں کوئی پریشانی، مایوسی، تذبذب اور شک و شبہ نہ آنے پائے۔ یقین پر قائم رہنا ہی ہماری فتح اور کامیابی ہے۔ جو لوگ حق پر لڑے، حق پر مرے، حق پر رہے یقین متزلزل نہ ہوا، دلوں میں شک نہ آیا اور استقامت کا پہاڑ بنے رہے، وہ ہمیشہ سے فتح یاب تھے، فتح یاب ہیں اور تا حشر فتح یاب رہیں گے۔ اگر حوصلے قائم ہوں اور حق کی جدوجہد جاری رہے تو شکست کبھی ہمارے قریب نہیں آ سکتی۔ اللہ تعالیٰ اخروی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ دنیوی فتح بھی ہمارا مقدر بنائے گا۔ ان شاء اللہ۔

یہ فتح صرف آخرت کی فتح نہیں ہے، اسی دنیا میں، اسی جدوجہد میں، اسی حق و باطل کی جنگ میں حق سرخرو اور فتح یاب ہوگا۔ ظلم کرنے والے اس طرح خس و خاشاک کی مانند بہہ جائیں گے جیسے یزید، فرعون اور قارون مٹ گئے۔ حق کو کوئی جھکا نہیں سکتا اور نہ ہی کوئی اسے دبا سکتا ہے۔ ہمارا کام اپنے یقین کو قائم رکھ کر اللہ کی رضا کے لیے اپنے ایمان کو مضبوط تر کرنا ہے۔

فتح ہمارے قدم چومے گی، ہماری فتح کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اسی دنیا کے معرکے میں فتح ہو گی اور ان شاء اللہ انقلاب ضرور آئے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت انقلاب کا راستہ روک نہیں سکتی۔ انقلاب اہلِ حق کا مقدر ہے اور وہ آ کر رہے گا۔ ہمارا کام اپنے ایمان کو تازہ کرنا، اپنے یقین کو مضبوط کرنا، اپنے اندر ایمان کا باغ شاداب کرنا، ایمان کا نور پیدا کرنا، اپنی جبینوں پر سجدوں کی لذت لانا، اللہ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کرنا اور اپنی روحانی قوتیں بڑھانا ہے۔ ہمیں اپنے احوال اور کیفیات کو بدلنا ہوگا، گنبد خضریٰ سے اپنا تعلق جوڑنا ہوگا اور ''کب، کیوں، اور کیسے'' تینوں لفظوں کی جڑ کاٹنا ہوگی۔ نہ کیسے، نہ کیوں اور نہ ہی کب، فقط ہو کر رہے گا۔ انقلاب آ کر رہے گا۔ دشمن سرنگوں ہو گا، باطل کا خاتمہ ہو گا اور اِن شاء اللہ انقلاب کا جھنڈا لہرائے گا۔

اگر ہم یقین کے پیکر بن کے چلتے رہے، مایوسی سے نکل گئے، کیوں، کب اور کیسے کو کاٹ ڈالا اور یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ. کی طاقت لے کر چلے تو نہ کوئی پہلے ہمارا مقابلہ کرسکتا تھا، نہ کر سکا اور نہ ہی کوئی آئندہ کر سکے گا۔ ہمیں حضور ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ بیت اَطہار علیہم السلام والے ایمان کی چمک اپنے اندر پیدا کرنی ہے۔ ہمیں ایمان، یقین، تقویٰ اور استقامت کا نور پیدا کرنا ہے۔ اگر ہم ایمان کی کیفیت کی طرف پلٹ آئے تو سب چیزیں ہمارے پیچھے چلیں گی۔ ہم ہی رہبر و رہنما ہوں گے۔ مشکلات کو مسکرا کر برداشت کریں، اس لیے کہ یہ ہمیشہ رہنے والی نہیں ہوتیں۔ یہ ہوا کے جھونکے ہوتے ہیں۔ جیسے سردی آتی ہے، مگر ہمیشہ نہیں رہتی، گرمی بھی آتی ہے مگر چلی جاتی ہے۔ جولائی میں جو حالات ہوتے ہیں وہ اگست میں نہیں رہتے اور جو کیفیت اگست میں ہوتی ہے وہ ستمبر میں نہیں رہتی۔

حالات بھی موسموں کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ یہ مصائب اور مشکلات موسموں کی طرح آتیں اور چلی جاتی ہیں مگر مومن کی شان یہ ہے کہ موسمی حالات اس کے یقین میں کمزوری اور تزلزل پیدا نہ کرسکیں۔ یاد رہے کہ یقین میں پختگی تب آتی ہے جب ہم اپنے ایمان کو مضبوط کر لیں اور یقین اس طرح کامل رکھیں کہ زندگی میں شک کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ جب یقین آ جاتا ہے تو مایوسی نکل جاتی ہے۔ مایوسی راہِ حق پر چلنے والوں کی دشمن ہے اور یقین اہلِ حق کا دوست ہے، اسی کو ایمان کہتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ عظام رضی اللہ عنہم، اہل

بیت اطہار علیہم السلام اور اہل حق کی شہادتوں کی سنت پر ہمیں قائم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی برکت ہمیں عطا کرے اور استقامت کی دولت سے نوازے۔ استقامت ہی اصل فتح ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں جگہ کامیابی ہمارا مقدر بنے گی۔

باب دوم

اِیمان، آزمائش اور شہادت

گزشتہ باب میں اس پہلو پر گفتگو ہو چکی ہے کہ وہ لوگ دنیا اور آخرت میں کامیاب اور فتح یاب ہیں، جو شک کو اپنے دلوں میں داخل نہیں ہونے دیتے اور نہ ہی خود اس کی وادی میں اترتے ہیں۔ ان کے اندر ہمیشہ ایمان اور یقین کا درخت تناور اور مضبوط رہتا ہے۔ اس پختہ یقین ہی کا پھل استقامت ہے۔ جب تک جد و جہد اور تگ و دو میں اللہ پر کامل یقین اور توکل نہ ہو تو اس وقت تک استقامت نصیب نہیں ہوتی۔ اگر اِستقامت نہ ہو تو بے صبری آتی ہے اور بے صبری مایوسی کو جنم دیتی ہے۔ قرآن مجید نے اوّل سے آخر تک بے صبری اور شک کی جڑوں کو کاٹ کر دل کی زمین میں ایمان، یقین، توکل اور اِستقامت کا بیج بویا ہے اور اس درخت کے پھل کا نام فتح یابی اور کامرانی رکھا ہے۔

۱۔ ہر ذہنی اِنتشار کی جڑ 'کیوں'، 'کب' اور 'کیسے' ہے

یقین کی دولت کے حصول کے لیے 'کیوں'، 'کب' اور 'کیسے'، کے تین الفاظ کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکالنا ہو گا۔ یہ تینوں الفاظ ایمان کو جلا دینے اور یقین کو دیمک کی طرح کھا جانے والے ہیں۔ یہ تینوں الفاظ شر ہیں۔ انہیں کبھی اپنے دل و دماغ میں داخل نہ ہونے دیں۔ یہ تینوں الفاظ 'ک' سے شروع ہوتے ہیں۔ اسی حرف 'ک' سے ان الفاظ کی جڑیں کاٹ کر اپنی فہم و فکر سے ہمیشہ کے لیے نکال دیں۔ ذہن میں سوال اٹھے گا کہ ایسا کیوں کیا جائے؟ میں ان تین الفاظ کو جڑ سے اس لیے کاٹ دینے کی تاکید کر رہا ہوں تاکہ ان کے برے اثرات ہم پر اثر انداز نہ ہوں۔ آیئے! اب اِن الفاظ کے انسانی فہم و فکر پر مرتب ہونے والے اثرات کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ 'کیوں؟' سے ہمارا ذہن ماضی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے کہ فلاں کامیابی کیوں نہ

ہوئی؟ جب انسان کے ذہن میں آیا کہ 'کیوں' نہ ہوا؟ تو اس کیوں کے لفظ نے بندے کا اللہ کی ذات پر یقین اور اس کے امر پر توکل ختم کر دیا۔ ہر صاحبِ ایمان کا عقیدہ یہ ہے کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ جو کرتا ہے اسی میں خیر اور بہتری ہوتی ہے۔ 'کیوں' کا لفظ ذہن کو ماضی میں واپس لے جاتا ہے اور اللہ کے امر پر شکوہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ لفظ 'کیوں' یقین کو متزلزل کرتا ہے اور اس لفظ سے ایک طرف انسان میں بےصبری پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف اللہ پر یقین کمزور ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا لفظ '<u>کب</u>' ہے۔ اس لفظ کے ذہن میں آتے ہی سوال ابھرتا ہے کہ فلاں کامیابی یا فلاں کام کب ہوگا؟ جب آدمی 'کب'، میں گھرتا ہے اور اس کی سوچ میں پڑتا ہے تو بےصبری جنم لیتی ہے کہ کب ہوگا؟ 'کب' کا لفظ صبر کو کھا جاتا ہے۔

اللہ رب العزت نے کامیابی کے لیے یقین اور صبر دونوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے؛ جب کہ 'کیوں' کا لفظ یقین کو مٹاتا اور 'کب' صبر کو کھاتا ہے۔

۳۔ تیسرا لفظ '<u>کیسے</u>' بھی انسان کو متزلزل کر دیتا ہے۔ اس لفظ کے ذہن میں وارد ہوتے ہی سوال ابھرتا ہے کہ فلاں کام یا کامیابی 'کیسے' ہوگی؟ بندہ جب 'کیسے' میں پڑتا ہے تو یہ لفظ اسے شک کی کھائی میں دھکیل دیتا ہے۔ انسان جب کیسے کے گورکھ دھندے میں پھنستا ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اُسے اللہ کی قدرت پر ایمان نہیں ہے۔

انسان اگر اپنے آپ پر غور کرے تو اس 'کیسے' کا جواب مل جاتا ہے۔ انسان سوچے کہ وہ کیسے پیدا ہوا؟ ایک نطفہ سے اتنا بڑا انسان کیسے بنا؟ جب کچھ نہ تھا تو پھر کائنات کیسے پیدا ہوئی؟ جب بندہ ختم ہوگا تو پھر خاک کے ذروں سے دوبارہ کیسے جی اٹھے گا؟ اس کے بعد قیامت کیسے برپا ہوگی؟ یہ سب کچھ اللہ کی قدرت میں ہے۔ ہم روزمرہ زندگی میں 'کیسے، کا عمل قدرتِ الٰہی کے مظاہر میں دیکھتے رہتے ہیں۔ ہزاروں واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ 'کیسے' ہوگئے۔

'کیسے' کے لفظ میں الجھنے سے قادرِ مطلق کی قدرت پر شک آتا ہے۔ 'کیوں' میں

پڑیں تو رب پر یقین متزلزل ہوتا ہے اور بندہ اللہ کا کام اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے۔ یہ لفظ مخلوق کے شایانِ شان نہیں۔ اگر 'کب' میں پڑیں تو اس سے صبر ختم ہوتا ہے۔

حق و سچ کے غالب آنے کے متعلق 'کیوں'، 'کب' اور 'کیسے' میں نہ الجھا کریں۔ اس لیے کہ خالقِ کائنات کا وعدہ ہے کہ حق غالب آ کر ہی رہے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَo(۱)

تو اللہ کی جماعت (کے لوگ) ہی غالب ہونے والے ہیںo

غلبہ، فتح اور کامرانی اُس کا وعدہ ہے، اس میں کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب اس کا وعدہ ہے تو پھر یوں نہیں سوچتے کہ 'اُس دن کیوں کامیابی نہیں ملی جب ہم نے جد و جہد کی؟' 'اب کب یہ وعدہ پورا ہو گا؟' 'زمینی حقائق تو کچھ اور بتا رہے ہیں، ان حالات میں فتح کیسے ملے گی؟' حق کی جدوجہد کے دوران اس طرح نہیں سوچتے بلکہ یقین بھی رکھو، صبر بھی کرو اور توکل بھی قائم رکھو کہ آخر حق غالب آ کر رہے گا اور فتح یابی ضرور مل کر رہے گی۔ (اِن شاء اللہ تعالیٰ)

۲۔ 'کیوں'، 'کب' اور 'کیسے' کا منبع کیا ہے؟

جنہیں منزلِ مقصود کے حصول کا یقین ہوتا ہے، وہ کبھی 'کیوں'، 'کب' اور 'کیسے' کی بھول بھلیوں میں نہیں پڑتے۔ اہلِ یقین کو کامل یقین ہوتا ہے کہ اِسی طرح کے تمام سوالات، ذہنی الجھنیں اور سارا گورکھ دھندہ شک کا تانہ بانہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ شیطان لعین کے حربے اور حملے ہیں اور اس طرح کے وساوس وہ ہی ڈالتا ہے۔ وہ راہِ حق پر چلنے والوں کے دل و دماغ میں اس طرح کے سوالات ڈال دیتا ہے کہ پوچھو کہ ''انقلاب کب آئے گا؟ منزل کا کتنا سفر طے ہو گیا ہے اور کتنا سفر باقی رہ گیا ہے؟ اب ہم کہاں کھڑے ہیں؟ کتنا وقت باقی ہے؟ انقلاب کب آئے گا؟'' آئے گا بھی یا نہیں آئے گا؟ یہ سارے سوالات ایمان، رحمٰن اور قرآن

(۱) المائدة، ۵:۵۶

کی طرف سے نہیں آتے بلکہ ان سب سوالات کا محور و مرکز شیطان لعین ہے۔ اِسے وسوسہ کہتے ہیں۔

اس طرح کے تمام سوالات کو یک جا کریں تو ایک set of questions سامنے آتا ہے۔اگر ان تمام سوالات پر ہر کوئی تھوڑی دیر تحمل اور دیانت داری سے سوچے کہ یہ سوال ایمان اور یقین کی روشن وادی کی سمت سے آتے ہیں یا وسوسہ کی اندھیری گھاٹی سے نمودار ہوتے ہیں؟ اپنا محاسبہ خود کرتے ہوئے سوچیں کہ یہ سوالات یقین اٹھاتا ہے یا انہیں وسوسہ بلند کرتا ہے؟ جلد ہی ہم فیصلہ کر لیں گے کہ ان سوالات کی اصل کیا ہے؟ یہ سوالات کہاں سے اور کس چشمے سے پھوٹتے ہیں؟ کیا ان کا منبع یقین کی دھرتی ہے یا وسوسہ کی سرزمین؟ نتیجتًا جب یہ جواب سامنے آئے گا کہ یہ تمام سوالات وسوسہ سے تعلق رکھتے ہیں تو لامحالہ یہ بھی ذہن میں ابھرے گا کہ وسوسہ رحمٰن اور ایمان کی طرف سے نہیں بلکہ شیطان کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ خالقِ دو جہاں نے یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ سے آغاز کیا ہے یعنی بن دیکھے ماننا، ایمان ہے اور قرآن نے یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ کے ذریعے وسوسہ کو شیطان کی طرف سے منسوب کیا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ جسے وسوسہ آئے، وہ جان لے کہ یہ فتنہ شیطان کی طرف سے آیا ہے۔ سمجھانا یہ مقصود تھا کہ یقین سے چلیں گے تو منزلِ مقصود حاصل کر لیں گے اور اگر وسوسہ آئے گا تو پھر سمجھ لیں کہ شیطان نے اپنے دام میں پھنسا لیا ہے۔ قرآنِ مجید کی آخری سورہ ’الناس‘ کا مضمون یہی ہے۔ فرمایا گیا:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِo(۱)

آپ عرض کیجیے کہ میں (سب) انسانوں کے رب کی پناہ مانگتا ہوںo

کس سے؟ پانچویں آیت میں واضح فرما دیا:

الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِo(۲)

---

(۱) الناس، ۱۱۴:۱

(۲) الناس، ۱۱۴:۵

اس سے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے○

وسوسہ ڈالنے والے یہ شیطان جنات کے قبیلے سے بھی ہوتے ہیں اور ان کا تعلق انسانوں سے بھی ہوتا ہے۔ گویا وسوسہ ان دونوں سمتوں سے آتا ہے۔ جو انسان کے ایمان کی بنیاد میں دراڑ ڈال کر اس کے یقین کو کمزور کر دیتا ہے۔ لہٰذا حالات کچھ بھی ہوں نہ ہمت ہارو، نہ غم کرو، نہ ہی مایوسی لاؤ بلکہ کامل یقین رکھو کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ فتح تمہاری ہو گی۔ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی قرآن میں بیان کردہ اس خوش خبری کو آپ تک پہنچا رہا ہوں کہ حق و سچ کے مصطفوی مشن پر اگر کارکنانِ تحریک ایمان، یقین اور استقامت کے ساتھ قائم رہے تو ہمارا ہی غلبہ ہوگا۔

۳۔ اِستقامت کسے کہتے ہیں؟

عام طور پر استقامت کا معنی حقیقت سے ہٹ کر کچھ اور طرح سے لیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ عام حالات میں ثابت قدم رہنا استقامت نہیں کہلاتا۔ استقامت تو یہ ہے کہ جب صبر آزما مراحل آئیں، زندگی میں مصائب و آلام آئیں، پریشانیاں آئیں، ماحول اور حالات لغزش پیدا کر دیں، ایسے حالات پیدا ہو جائیں جو انسان کے قدموں کو راہِ حق سے ہٹانے، بہکانے، پھسلانے اور ڈگمگانے پر مجبور کر دیں۔ کہیں مفادات کا حملہ ہو، کہیں خطرات کا خدشہ ہو، کہیں حرص، ہوس اور لالچ کا جھانسہ ہو، کہیں خوف و ہراس کا غلبہ ہو، کہیں جان، مال، کاروبار اور ملازمت کے چھن جانے کا خوف ہو ان حالات میں جو لوگ ثابت قدم رہیں، انہی کو صاحبانِ استقامت کہا جائے گا۔

استقامت عام حالات سے نہیں بلکہ پریشان کن حالات سے مشروط ہے۔ ہماری کیفیت اس کے برعکس ہے۔ عام حالات میں تو ہم استقامت کا دامن تھامے رکھتے ہیں۔ اگر حالات ہمارے موافق رہیں، مطلوبہ نتائج آتے رہیں اور سارے کام سنورے رہیں تو ایسے حالات میں ہمیں حوصلہ بھی ہوتا ہے اور ہمارا بھروسہ بھی قائم رہتا ہے۔ اس کے برعکس جب حالات بگڑتے ہیں، ناسازگار حالات کی آندھیاں چلتی ہیں اور مفادات کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو

وہاں ہمارے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور ہم یہاں آ کر استقامت کا دامن چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لیے فرمایا:

وَالْعَصْرِ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ○[1]

زمانہ کی قَسم (جس کی گردش انسانی حالات پر گواہ ہے)○ بے شک انسان خسارے میں ہے (کہ وہ عمرِ عزیز گنوا رہا ہے)○ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اور (معاشرے میں) ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے رہے اور (تبلیغِ حق کے نتیجے میں پیش آمدہ مصائب و آلام میں) باہم صبر کی تاکید کرتے رہے○

ذہن نشین رہے کہ خسارے سے وہی لوگ بچتے ہیں جو ایمان لائے، جنہوں نے نیک اعمال کیے، حق کی نصیحت اور وصیت کی اور حق کہنے کے بعد صبر کے ساتھ ثابت قدم بھی رہیں۔ حق اور صبر دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لہٰذا یہ نکتہ سمجھ لیں تو استقامت کی بات بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ مشکل حالات میں ہی استقامت کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔ مگر ہم مشکلات میں ہی صبر کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور ان حالات میں ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں کہ 'بہت صبر کر لیا'، 'بہت ضبط کے ساتھ وقت گزار لیا ہے مگر اب حالات قابو سے باہر ہو گئے ہیں'۔ اچھے حالات میں زندگی اللہ کی عبادت، اطاعت اور رزقِ حلال پر استقامت کے ساتھ گزاری ہے مگر اب حالات اتنے دگرگوں ہوگئے ہیں کہ اب حوصلہ ہار بیٹھے ہیں۔ حالات کے بگڑے تیوروں نے استقامت کا دامن ہاتھوں سے چھڑوا دیا ہے۔ ابھی تو استقامت ظاہر کرنے کا وقت آیا تھا۔ پہلے استقامت بھلا کہاں تھی؟ پہلے تو حالات اچھے تھے تو تم بھی اچھے رہے، حالات جب دگرگوں ہوئے تب استقامت ثابت کرنے کا وقت آیا، اب تو پتا چلا ہے کہ عاشق صرف چُوری کھانے والا ہرجائی ہے یا خون دینے والا مجنوں ہے۔

---

(۱) العصر، ۱۰۳: ۱-۳

ایک دفعہ لیلیٰ بیمار ہوئی، اطباء نے کہہ دیا کہ اب لیلیٰ کی جان نہیں بچتی جب تک اسے کئی بوتلیں خون کی لگ نہیں جاتیں۔ محلے کی مسجد میں سات آٹھ مجنوں ہونے کے دعویدار بیٹھے تھے اور ان کے لیے لیلیٰ روزانہ چوری بنا کر بھیجتی تھی۔ ان میں سے ہر کوئی پکا اور سچا مجنوں ہونے کا دعویٰ کیا کرتا تھا۔ چوری کھانے کے لیے تو ہر کوئی مجنوں موجود تھا، خون دینے کا وقت آیا تو سب کے سب رفو چکر ہو گئے۔ ان میں سے ہر ایک نے کہا کہ دوسرا حقیقی مجنوں ہے، ہم تو بس دل لگی کی وجہ سے آ گئے تھے۔ ہم تو فقط حسنِ لیلیٰ کے دل دادہ ہیں، اصل مجنوں تو وہ ہے جو خون دے گا۔ جب خون دینے کا وقت آتا ہے، حالات دگرگوں ہوتے ہیں، مفادات خطرے میں پڑتے ہیں، انسان مشکلات میں گھرتا ہے اور حالات ساتھ چھوڑ جاتے ہیں تو تب کہیں جا کر استقامت کا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ہم میں سے بیشتر نے دیگر معاملات اور افکار کی طرح شعورِ استقامت کو بھی اس کے اصل مفہوم کے برعکس سمجھ رکھا ہے۔ ہماری سوچ وفکر کے سب پیمانے الٹے ہوگئے ہیں۔ ہمیں جہاں استقامت کی ضرورت ہے وہاں ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں وقت ثابت قدم رہنے کا ہوتا ہے، وہاں قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ جہاں مفادات نظر آتے ہیں وہاں قائم رہتے ہیں اور اس عمل کو استقامت کہتے ہیں۔

قرآن کی نظر میں ایسا کردار تو منافقانہ ہے۔ اللہ رب العزت نے تمثیلی انداز میں اس منافقانہ کردار کو یوں بیان کیا ہے:

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَلَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ○(۱)

یوں لگتا ہے کہ بجلی ان کی بینائی اچک لے جائے گی، جب بھی ان کے لیے (ماحول میں) کچھ چمک ہوتی ہے تو اس میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اگر اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل

---

(۱) البقرة، ۲: ۲۰

سلب کر لیتا، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے○

جب حق کی راہ میں ذاتی مفادات کا تحفظ ہو؛ عزت، دولت اور شہرت میسر ہو تو ساتھ ساتھ چلتے رہیں اور جب ناموافق حالات ہوئے، مصائب و آلام گھیرے میں لے لیں، قربانیوں کا تقاضا ہونے لگے تو اس وقت پیچھے ہٹ جائیں۔ قرآن کی رُو سے یہ منافقانہ طرزِ عمل ہے۔

اس کے متضاد اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور اولیاء کی روش کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوۡا لِمَآ اَصَابَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوۡا وَمَا اسۡتَكَانُوۡا ‌ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ○[1]

اور کتنے ہی انبیاء ایسے ہوئے جنہوں نے جہاد کیا ان کے ساتھ بہت سے اللہ والے (اولیاء) بھی شریک ہوئے، تو نہ انہوں نے ان مصیبتوں کے باعث جو انہیں اللہ کی راہ میں پہنچیں ہمت ہاری اور نہ وہ کمزور پڑے اور نہ وہ جھکے، اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے○

یعنی ایک تو وہ بذاتِ خود انبیاء تھے پھر کثیر بڑے بڑے ربانی اولیاء ان کے ہمراہ۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہاں اہلِ علم کے لیے ایک نکتہ بیان کر دوں کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ روحانی لوگوں کے طبقہ سے مراد اولیاء اللہ ہیں اور اولیاء کا یہ طبقہ اور روحانیت کا یہ تصور پہلی امتوں سے چلا آ رہا ہے، قرآن مجید کی اس نص سے یہ ثابت ہے۔ آج جو لوگ روحانیت اور اولیاء کرام پر اعتراض کرتے ہیں وہ جان لیں کہ قرآن مجید کا انہیں ایک انفرادی طبقہ کے طور پر بیان فرمانا اِس طبقہ کی تاریخی و دینی حیثیت اور تسلسل کو واضح کرتا ہے۔

آیتِ مبارکہ میں بیان کیا گیا کہ انبیاء اور اِن بڑے ربانی اولیاء نے بھی اللہ کی راہ میں جہاد کیا، قتال کیا، زخم خوردہ اور شہید ہوئے۔ بعض اوقات انہوں نے فتوحات بھی سمیٹیں اور

(۱) آل عمران، ۳: ۱۴۶

بسا اوقات ظاہراً ناکامیاں بھی دیکھنے میں آئیں۔ وہ ناسازگار حالات کے شکنجوں میں جکڑے گئے، پریشان بھی ہوئے، لٹے بھی، کٹے بھی اور شہید بھی کر دیے گئے۔ ایمان، یقین اور استقامت کے پیکران کے ساتھ یہ سب کچھ ہوگیا مگر انہوں نے اللہ کی راہ میں نہ کبھی حوصلہ ہارا، نہ کبھی غم کو دل میں جگہ دی اور نہ ہی اپنا سفر سست کیا۔ وہ حق گوئی، بے باکی، جرأت اور استقامت کے ساتھ اللہ پر توکل قائم کرتے ہوئے ہر حال میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔

۴۔ اِبتلاء اور آزمائش تقاضائے ایمان ہے

یقین، آزمائش اور صبر کی تعلیمات قرآن مجید میں اوّل تا آخر سینکڑوں آیات پر مشتمل ہیں۔ جب ہر جگہ سیاق و سباق اور واقعات بدلتے رہیں مگر نفسِ مضمون اور پیغام ایک ہی ہو تو اس کا مطلب ہے کہ آزمائشوں اور صبر کے مراحل سے انبیاء، صلحاء میں سے ہر کوئی گزرا ہے اور جو کوئی قیامت تک حق کے راستے پر گامزن ہوگا اُسے ابتلاؤں اور آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ یہی تقاضائے ایمان ہے۔ آیئے! اسی مضمون پر قرآن مجید کی چند آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○[1]

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم (یونہی بلا آزمائش) جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالاں کہ تم پر تو ابھی ان لوگوں جیسی حالت (ہی) نہیں بیتی جو تم سے پہلے گزر چکے، انہیں تو طرح طرح کی سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور انہیں (اس طرح) ہلا ڈالا گیا کہ (خود)

(۱) البقرة، ۲: ۲۱۴

پیغمبر اور ان کے ایمان والے ساتھی (بھی) پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ آ گاہ ہو جاؤ کہ بے شک اللہ کی مدد قریب ہےo

قرآن مجید میں جب مومنوں سے اس انداز میں خطاب ہوتا ہے کہ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ کیا تم یہ گمان کرتے ہو، تو سب سے پہلے صحابہ کرام ﷺ اس خطاب کے مخاطَب تھے۔ ان کی وساطت سے یہی خطاب پھر تابعین کو ہوتا تھا۔ بعد ازاں اتباع تابعین، سلف صالحین ، جمیع امت کے مومنین، مومنات، صالحین، صالحات اور قیامت تک کے سب مسلمان اس خطاب کا تسلسل ہیں۔

اوّلین مخاطب کی حیثیت سے خطاب صحابہ کرام ﷺ سے ہو رہا ہے۔ اس کلام کو حضرت سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر، سیدنا عثمان غنی، سیدنا مولا علی المرتضٰی، حضرت بلال، حضرت ابو عبید اللہ بن الجراح، حضرت سلمان فارسی، اُبی بن کعب، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس اور دیگر تمام صحابہ ﷺ آقاے دو جہاں ﷺ کے سامنے بیٹھ کر سن رہے ہوتے تھے۔ اس وقت صحابہ کرام ﷺ کے ایمان اور یقین کی اَعلٰی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جب صاحبِ قرآن ﷺ منبر پر قیام فرما ہوتے اور اللہ کا کلام اترتا اور اس میں ان صحابہ سے مذکورہ مضمون کے حوالے سے خطاب ہوتا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ بار بار اس طرح کے مضمون سے مزین کلامِ الٰہی کیوں اترتا تھا؟ حالانکہ صحابہ کرام ﷺ ایمان میں کمزور نہیں تھے۔ صدیقِ اکبر ﷺ جیسے ایمان کی مضبوطی والا کون ہو گا؟ فاروقِ اعظم، عثمان غنی، علی شیر خدا دیگر صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار ﷺ کو ایمان کی جو مضبوطی، استحکام، قوت اور یقین نصیب تھا، ان جیسے ایمان والا بھلا کون ہوسکتا ہے؟ جب ان جیسی استقامت والا کوئی بھی شخص قیامت تک نہیں آ سکتا تو پھر ان کے سامنے بار بار یہ آیتیں کیوں نازل ہوتی تھیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کی تربیت کا ایک مسلسل عمل (process) تھا۔ اگرچہ ان کا اپنے رب پر کامل یقین ہوتا تھا مگر ان کے یقین کو دوبالا کیا جاتا تھا۔ اُن میں ایمان ہوتا تھا، لیکن ان کے ایمان میں مزید اضافہ کیا جاتا تھا۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات سے اس بات

پر شاھد ہیں کہ مختلف طریقوں سے ایمان والوں کے ایمان کے درجے کو بلند کیا جاتا تھا۔ مثلاً سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ○ (۱)

اور اسی طرح ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمین کی تمام بادشاہتیں (یعنی عجائباتِ خلق) دکھائیں اور (یہ) اس لیے کہ وہ عین الیقین والوں میں ہو جائے○

کیا معاذ اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یقین والے نہیں تھے؟ بلاشبہ وہ یقین و ایمان والے تھے مگر اس طرح ان کے یقین پر مزید یقین کا اضافہ کیا جاتا تھا۔ نتیجتاً ان کے درجات بلند سے بلند تر ہوتے چلے جاتے۔ وہ یقینِ کامل ان کے روحانی حال کے مطابق تھا۔ جب حال بلند تر ہو جاتا تو یقین بھی اونچے درجے کا عطا کیا جاتا تھا۔ اس طرح انبیاء و رُسل علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درجات کے بلند ہونے میں رکاوٹ پیش نہ آتی اور ان کے درجات لمحہ بہ لمحہ، روز بہ روز اور ماہ بہ ماہ بلند سے بلند تر ہوتے رہتے۔ درجات کی اس بلندی کے ساتھ ساتھ ان کا ایمان اور یقین بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتا رہتا تھا۔ یہی حالت انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ بھی تھی اور اسی طرح ان کے صحابہ کے ساتھ بھی ہوتا تھا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے اللہ رب العزت نے فرمایا:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى○ (۲)

اور بے شک (ہر) بعد کی گھڑی آپ کے لیے پہلی سے بہتر (یعنی باعثِ عظمت و رفعت) ہے○

فخرِ کون و مکاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بعد کا زمانہ پہلے زمانے سے بہتر ہے۔ رسول اللہ

---

(۱) الأنعام، ۶: ۷۵

(۲) الضحی، ۹۳: ۴

ﷺ کی آخرت کی زندگی دنیا کی حیات سے بہتر ہے۔ گویا لحہ بہ لحہ آقاے دو جہاں ﷺ کے درجات بھی بلند سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں۔ مگر اس تمام کے باوجود پیغمبرِ اخلاق ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ ﷺ ہر روز ستر (۷۰) مرتبہ اور بعض احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ ایک سو (۱۰۰) مرتبہ اِستغفار کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ ﷺ کا بیان ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

وَاللهِ، إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً. (۱)

اللہ کی قسم! میں روزانہ ستر مرتبہ سے زیادہ بارگاہِ خداوندی میں استغفار اور توبہ کرتا ہوں۔

حضرت عبد اللہ بن عمر ﷺ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ! تُوبُوا إِلَى اللهِ، فَإِنِّي أَتُوبُ فِي الْيَوْمِ إِلَيْهِ مِائَةَ مَرَّةٍ. (۲)

اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کیا کرو کیونکہ میں ہر روز سو بار توبہ کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب نبی ﷺ معصوم عن الخطا اور گناہوں سے پاک تھے تو پھر آپ ﷺ کون سی توبہ کرتے تھے؟ کیا کسی غلطی، گناہ اور خطا سے توبہ کرتے تھے؟ نہیں! نہیں! ایسا نہیں

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الدعوات، باب استغفار النبی ﷺ في اليوم والليلة، ۵: ۲۴۲۳، رقم: ۵۹۴۸
۲۔ نسائی، السنن الکبری، ۶: ۱۱۴، رقم: ۱۰۲۷۰
۳۔ ابن حبان، الصحیح، ۳:۲۰۴، رقم: ۹۲۵
۴۔ طبراني، المعجم الأوسط، ۸: ۳۲۹، رقم: ۸۷۷۰

(۲) ۱۔ مسلم، الصحیح، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب استحباب الاستغفار والاستکثار منه، ۴: ۲۰۷۵، رقم: ۲۷۰۲
۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴: ۲۱۱، رقم: ۱۷۸۸۰
۳۔ نسائی، السنن الکبری، ۶: ۱۱۶، رقم: ۱۰۲۸۱

ہے بلکہ حضور نبی اکرم ﷺ کے استغفار سے آپ ﷺ کے درجات بلند سے بلند تر ہوتے چلے جاتے تھے۔

صحابہ کرام ﷡ کو جب آزمائشیں، مشکلات، مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا تو بشری و انسانی تقاضے کے پیشِ نظر ان میں سے کئی ایک گھبراتے بھی تھے اس لیے کہ وہ بھی آخر بشر ہی تھے۔ ہر صحابی، ابوبکر صدیق ﷛ کے درجے پر فائز نہ تھا، ہر کوئی عمر ﷛، عثمان ﷛ اور علی ﷛ جیسا بھی نہ تھا۔ صحابہ کرام ﷡ کے اندر بھی اپنے اپنے مراتب ہیں، جس طرح **تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ** کے تحت انبیاء اور رسولوں میں جدا جدا درجات ہیں۔

جس طرح انبیاء کرام اور رُسل عظام ﷩ میں بھی کئی ایک کے درجے دوسروں سے بلند تھے۔ اسی طرح صحابہ کرام ﷡ میں بھی درجات متفاوت تھے۔ کئی ایک صحابہ کرام حوصلہ ہار جاتے تو ان لمحات میں اس کیفیت کے حامل صحابہ کرام کو ہر دوسرے، تیسرے اور چوتھے روز ایمان، یقین، استقامت اور صبر کے موضوع پر آیات سننے کو ملتیں؛ جن سے گھبرانے والوں کا حوصلہ بڑھتا اور یقین کے حامل صحابہ کے یقین کو مزید تقویت نصیب ہوتی۔ اسی طرح کئی ایک صبر کا دامن چھوڑنے کے قریب پہنچتے تو اِن آیات سے مقصود انہیں پھر صبر پر قائم کرنا ہوتا تھا۔ الغرض قرآن مجید کی یہ آیات حسبِ حال ہر ایک کو فیض دیتی تھیں۔

۵۔ ہر زمانہ میں اَہلِ حق طبقہ کی معاشرتی حیثیت

ہر زمانہ میں اہلِ حق طبقہ مومنین اور انبیاء کے صحابہ کو بڑی اذیت ناک تکلیفیں پہنچی تھیں اور مصائب اور آلام میں اس حد تک ڈالا گیا کہ قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ ہل کر رہ گئے۔ ان پر مشکلات کی اتنی حد ہو گئی کہ انبیاء کے ان صحابہ، سابقہ امتوں کے مومنین جو اللہ کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کرتے، جانیں قربان کرتے اور مال لٹاتے تھے، وہ سب معاشرتی طور پر کمزور ہونے کے سبب پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟

اللہ رب العزت نے صحابہ کرام ﷡ کو مخاطب کر کے فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ط مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ط اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○ (۱)

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم (یونہی بلا آزمائش) جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالاں کہ تم پر تو ابھی ان لوگوں جیسی حالت (ہی) نہیں بیتی جو تم سے پہلے گزر چکے، انہیں تو طرح طرح کی سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور انہیں (اس طرح) ہلا ڈالا گیا کہ (خود) پیغمبر اور ان کے ایمان والے ساتھی (بھی) پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ آگاہ ہو جاؤ کہ بے شک اللہ کی مدد قریب ہے○

چاہے یہ زمانہ حضرت نوح علیہ السلام کا تھا یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا، حضرت صالح علیہ السلام کا تھا یا حضرت ہود علیہ السلام کا، حضرت شعیب علیہ السلام کا تھا یا حضرت لوط علیہ السلام کا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھا یا حضرت یوسف علیہ السلام کا، حضرت زکریا علیہ السلام کا تھا یا حضرت یحیٰ علیہ السلام کا، حتیٰ کہ مکہ میں امام الانبیاء ﷺ کا دورِ رسالت ملاحظہ کرلیں۔ ہر دور میں بڑے جاگیردار، سرمایہ دار، وڈیرے، ظالم، کرپٹ اور بدمعاش قسم کے لوگ کسی پیغمبر کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ ہر پیغمبر کی دعوت تو ہمیشہ ہی سے انقلاب کی دعوت ہوتی تھی۔ ہر پیغمبر نظام کو بدلنا، عدمِ مساوات اور حقوق کی پامالی کے بتوں کو پاش پاش کرنا، غریبوں کو سربلند کرنا اور عدل و انصاف کا نظام لانا چاہتے تھے۔ ان کے ہمراہ ہمیشہ غریب ہی ہوتے تھے۔ اس صورت میں یہ وڈیرے ان کے ساتھ کیسے کھڑے ہوتے؟ ہر نبی کی امت میں جنہوں نے دینِ حق کا ساتھ دیا وہ غریب اور کمزور ہی ہوتے تھے۔ یاد رکھ لیں! یہ ہزار ہا سالوں کی تاریخ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی وہی کمزور لوگ تھے، جن کے بیٹوں کو فرعون قتل کروا ڈالتا تھا اور بیٹیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ مراد یہ ہے کہ راہِ حق میں ہمیشہ کمزور لوگ تھے۔ جب ان پر سختیاں، تکالیف اتنی بڑھ گئیں کہ برداشت کے قابل نہ رہے تو پکار اٹھے: مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ (اللہ کی مدد کب آئے گی)؟

---

(۱) البقرۃ، ۲: ۲۱۴

انبیاء کے صحابہ اپنے نبی سے کہتے کہ آپ تو کہتے تھے کہ اللہ کی مدد آئے گی۔ اب تو ظلم وستم کی انتہاء ہو گئی ہے، وہ مدد کب آئے گی؟ یعنی صبر کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا۔ پیغمبر انہیں جواب دیتے: اَ لَآ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ (آگاہ ہو جاؤ کہ بے شک اللہ کی مدد قریب ہے)۔ قرآن مجید نے واضح فرما دیا کہ اُن کی سختیاں آج کے دور میں اَہلِ حق پر آنے والی مشکلات سے کہیں زیادہ تھیں۔ یاد رکھیں! یہ ابتلاء اور آزمائش ایمان کا حصہ اور تقاضا ہے۔ اسی ابتلاء و آزمائش کی بھٹی میں ایمان مضبوط ہوتا اور یقین پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

٦۔ قرآن کی پکار! اِستقامت پر قائم رہو

ایمان، یقین اور استقامت کے باب میں آزمائشوں اور صبر کا بیان اللہ رب العزت نے غزوۂ اُحد کے حوالے سے بھی قرآن مجید میں سورہ آلِ عمران کی آیات نمبر ۱۳۸ تا ۱۵۳ میں تفصیلاً فرما دیا ہے۔ آیئے ان آیات کی روشنی میں اس موضوع سے اِکتسابِ فیض کرتے ہیں:

ارشاد فرمایا:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوۡعِظَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ۝[1]

یہ قرآن لوگوں کے لیے واضح بیان ہے اور ہدایت ہے اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہے۝

اس آیتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ مومنوں کو اپنے گمان کی نہیں بلکہ قرآن کی بات کی طرف متوجہ ہونا ہوگا۔ جب یہ قرآن لوگوں کے لیے واضح بیان، ہدایت و رہنمائی اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہے تو اہلِ ایمان کو اس پر عمل کرنا اپنا شعار بنانا ہوگا۔

وہ بات کیا ہے جس پر عمل کرنے کی طرف قرآن مجید نے متوجہ کیا؟ اگلی آیت میں اسی کی طرف رہنمائی فرمائی:

(۱) آل عمران، ۳: ۱۳۸

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○[1]

اور تم ہمت نہ ہارو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب آؤ گے اگر تم (کامل) ایمان رکھتے ہو○

قابلِ فہم بات یہ ہے کہ قرآن یہ بات کس کو بتا رہا ہے؟ دراصل آقائے دو جہاں ﷺ کی پوری امت اور قیامت تک کے اہل حق اور اہل ایمان کو یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ خواہ کچھ ہو جائے، کئی مرحلے گزر جائیں تم نہ کبھی ہمت ہارنا اور نہ غم کرنا۔ کبھی نقصان کے متعلق مت سوچنا۔ ہمت ہارو گے، غم کرو گے تو مایوسی آ جائے گی۔ مایوسی آئے گی تو یقین ختم ہو جائے گا اور اگر یقین ختم ہو گیا تو اللہ کی فتح کبھی نہیں آئے گی۔

لہٰذا ایمان والو! یقین رکھو کہ اُس کی مدد و نصرت ضرور آئے گی۔ کامل یقین کے لیے شرط ہے کہ مایوسی کو اپنے قریب نہ آنے دو۔ کیوں، کب اور کیسے کو دھکا دے کر اپنے دل و دماغ اور وہم و گماں سے بھی نکال دو۔ لہٰذا اہلِ حق مصائب و آلام اور آزمائشوں سے گزرتے ہوئے ایک طرف صبر کا دامن تھامے رکھیں اور دوسری طرف اپنے حال اور عمل سے یہ ثابت کریں:

اے 'کیوں'! آج سے تجھ سے رابطہ ختم۔ ......تو یقین کو متزلزل کرتا ہے۔

اے 'کب'! تجھ سے بھی تعلق ختم۔ ......تو بے صبری لاتا ہے۔

اے 'کیسے'! تجھ سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ ......تو شک پیدا کرتا ہے۔

۷۔ غزوۂ اُحد: اِستقامت کی لازوال مثال

قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے یہ اصولی بات سمجھا کر غزوۂ احد کے حالات وواقعات بیان کرنا شروع کیے ہیں۔ غزوۂ اُحد کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا لشکر جب مدینہ منورہ سے اُحد کے لیے روانہ ہوا تو اس میں ایک ہزار (۱,۰۰۰) لوگ شامل تھے، جن میں

(۱) آل عمران، ۳: ۱۳۹

رئیس المنافقین عبد اللہ بن اُبی کے ۳۰۰ رفقاء بھی تھے۔[1]

صحابہ کرام ﷺ میں یہ منافقین ذہنی مایوسی، بے چینی اور اضطراب پیدا کرنے کے لیے افواہیں پھیلانے لگے۔ وہ پراپیگنڈہ کر رہے تھے کہ یہ کوئی جنگ ہی نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی مقابلہ ہے۔ دشمن طاقت وَر ہے، دیکھ لینا تمھیں شکست ہوگی اور یقیناً تم نے مارے جانا ہے۔ (معاذ اللہ!) یہ رسول ﷺ تمہیں مروانے کے لیے لے جا رہا ہے۔ ہماری بات مانو، گھروں میں بیٹھے رہو تو بچ جاؤ گے ورنہ تمہاری لاشیں ہی واپس آئیں گی۔

منافقین ایسی باتوں کے ذریعے لشکرِ اسلام میں سے تین سو منافق افراد کو بہلا پھسلا کر مدینہ واپس لے گئے۔ سرورِ کائنات ﷺ سات سو صحابہ کرام ﷺ کے لشکر کے ساتھ اُحد کے مقام پر پہنچے اور تین ہزار حملہ آوروں پر مشتمل لشکر سے مقابلہ کیا گیا۔

آقاے دو جہاں ﷺ نے جنگ کے آغاز میں ستر (۷۰) جوان اور بعض روایات کے مطابق ساٹھ (۶۰) جوان پہاڑ کی گھاٹی پر پہرے کے لیے متعین کر دیے تھے کیونکہ جغرافیائی حقائق کے مطابق اسلامی لشکر کو خطرہ تھا کہ کہیں کفار پیچھے سے پلٹ کر حملہ نہ کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ جانتے تھے کہ اگر کفار شکست کھا گئے تو وہ پلٹ کر مسلمانوں پر دوبارہ حملہ ضرور کریں گے۔ غزوۂ اُحد کے پہلے مرحلے میں مسلمان فتح یاب ہو گئے اور کفار شکست کھا کر مکہ کی جانب پلٹے۔

گھاٹی پر متعین پہرے داروں کو آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس جگہ کو میرا حکم آنے تک چھوڑنا نہیں ہے۔ گھاٹی پر متعین ان افراد نے جب میدان کو کفار سے صاف دیکھا تو کچھ افراد یہ کہنے لگے کہ کفار پلٹ گئے ہیں، فتح تو ہو گئی۔ لہٰذا اب یہاں کھڑے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بھی جا کر مالِ غنیمت اکٹھا کریں۔ ان میں سے بعض افراد نے کہا کہ آقاے دو جہاں ﷺ نے یہ جگہ چھوڑنے سے منع فرمایا تھا، لہٰذا حکم آنے تک یہاں ہی ٹھہرا جائے۔ ان میں سے زیادہ لوگوں نے یہ سمجھا کہ جنگ کے دوران یہاں سے ہٹنے سے منع فرمایا تھا؛ چونکہ اب جنگ ختم ہو گئی ہے، لہٰذا یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے انہوں

(۱) ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۲: ۳۹

نے وہ گھاٹی چھوڑ دی۔

خالد بن ولید اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے اور کفارِ مکہ کے ایک لشکر کی قیادت کر رہے تھے۔ ان کی سربراہی میں قائم کفار و مشرکین کے لشکر نے جب دیکھا کہ مسلمان مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گئے ہیں اور پیچھے کا راستہ خالی ہوگیا ہے تو انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلامی لشکر پر گھاٹی کے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ اچانک حملے سے لشکرِ اسلام میں افراتفری مچ گئی اور صحابہ کرام شہید و زخمی ہونے لگے۔[1]

خلفاء راشدین، اہلِ بیتِ اطہار اور جلیل القدر انصار و مہاجر صحابہ کرام ﷺ اس مشکل صورتِ حال میں بھی استقامت کے ساتھ ڈٹے رہے۔ لیکن اس صورتِ حال میں مسلمانوں کا لشکر اجتماعی صورت میں قائم نہ رہ سکا اور افراتفری کے عالم میں ہر کوئی انفرادی لڑائی میں مصروف ہوگیا۔ میدانِ جنگ میں جا بجا الگ الگ کئی محاذ کھل گئے۔ صحابہ کرام ﷺ کفار سے فرداً فرداً جنگ لڑ رہے تھے۔ ہر طرف افراتفری کا سماں تھا۔ پہلے والا ماحول نہ رہا کہ فرداً فرداً ایک ایک شخص جاتا اور مقابلہ کرتا، یا پھر پورے کا پورا لشکر اکٹھا ہو کر دوسرے لشکر سے لڑتا۔ میدانِ جنگ کے عقب کی گھاٹی کی طرف سے ہونے والے اچانک حملہ کے سبب فریقین کا ہر جگہ آمنا سامنا ہوگیا۔ اسلامی لشکر کی یہ کیفیت ہوگئی کہ کسی کو کسی کی خبر ہی نہ تھی کہ وہ کہاں لڑ رہا ہے۔ اس کے باوجود صحابہ کرام ﷺ ثابت قدمی سے لڑ رہے تھے۔

ان تلخ حالات میں محسنِ انسانیت ﷺ زخمی ہوئے، مقدس خون بہا اور آپ ﷺ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور جسدِ مبارک زمین پر چلا آیا۔[2]

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجهاد والسیر ، باب ما یکره من التنازع والاختلاف في الحرب، ۳: ۱۱۰۵ رقم: ۲۸۷۴
۲۔بخاری، الصحیح، کتاب المغازی، باب غزوة أُحد، ۴: ۱۴۸۶ رقم: ۳۸۱۷

(۲) مسلم، الصحیح، کتاب الجهاد والسیر، باب غزوة أُحد، ۳: ۱۴۱۶ رقم: ۱۷۹۰

اسی دوران میں ایک مشرک نے آواز لگائی کہ اُس نے حضور ﷺ کو شہید کر دیا ہے (معاذ اللہ)۔ جلد ہی یہ افواہ چاروں جانب پھیل گئی۔ صحابہ کرام ﷺ نے جب یہ خبر سنی تو اُن میں سے کئی حوصلہ ہار گئے جس سے افراتفری میں مزید اضافہ ہوگیا۔

(۱) جان نثارانِ مصطفیٰ ﷺ کی آفاقی قربانیاں

اس پسِ منظر کو جاننے کے بعد آیئے اب غزوۂ اُحد کے دوران پیش آنے والے حالات و واقعات کو استقامت، آزمائش اور شہادت کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اس افراتفری کی کیفیت میں ہادیِ برحق حضور نبی اکرم ﷺ کے اردگرد آپ کے دفاع میں چند صحابہ کھڑے تھے اور باقی منتشر حالت میں کفار سے دو بدو لڑ رہے تھے۔ صحابہ کرام ﷺ آقاے دو جہاں ﷺ کی سواری کے گرد حصار بنا کر کھڑے تھے اور چاروں طرف سے محسنِ انسانیت ﷺ کا دفاع کر رہے تھے۔ ایک ایک صحابی آپ ﷺ کے دفاع میں آپ ﷺ کے سامنے لڑ لڑ کر شہید ہوتا جاتا تھا۔ شاہِ عرب و عجم ﷺ کے دفاعی دستے میں گنتی کے چند صحابہ کرام ﷺ رہ گئے تھے، باقی سب میدان جنگ میں کفار سے نبرد آزما تھے۔ مشرق سے مغرب کی طرف جہاں جہاں میدان تھا ہر طرف لڑائی جاری تھی۔

کفار آہستہ آہستہ سید المرسلین ﷺ پر اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ جب آپ ﷺ کے دفاع میں صحابہ شہید ہوتے جاتے تو آقاے دو جہاں ﷺ صحابہ کرام ﷺ سے پوچھتے تھے کہ اب کون آئے گا؟ ہر صحابی آگے بڑھتا اور آپ ﷺ کے دفاع میں زخمی ہوتا اور جام شہادت نوش فرماتا چلا جاتا۔ دوسرا صحابی آگے بڑھتا، دفاعِ مصطفیٰ ﷺ میں کفار سے لڑتا، بالآخر زخموں سے چور ہو کر شہید ہو جاتا۔[1]

اسی طرح جو بھی صحابی آتا وہ تنہا درجنوں کافروں کے ساتھ لڑ لڑ کر شدید زخمی ہوتا یا

---

(۱) ۱۔ مسلم، الصحیح، کتاب الجهاد والسیر، باب غزوة أحد، ۳:۱۴۱۵، رقم: ۱۷۸۹

۲۔ بیهقی، السنن الکبریٰ، ۹:۴۴، رقم: ۱۷۶۹۷

شہید ہو کر گر جاتا۔ کفار ہر لمحہ حضور نبی اکرم ﷺ کے مزید قریب آتے جا رہے تھے۔ اس دوران آقاے دو جہاں ﷺ میدانِ جنگ سے حوصلہ ہارنے کے سبب بھاگنے والوں کو واپس بلانے اور لڑنے والوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے کہ ہر کوئی جہاں جہاں لڑ رہا ہے، پلٹ آئے۔ اکٹھے ہو جاؤ، سب متحد ہو جاؤ تا کہ مل کر دشمن کا مقابلہ کریں۔

(۲) غزوۂ اُحد میں صحابیات رضی اللہ عنہن کا کردار

احادیثِ مبارکہ میں ہے کہ غزوۂ احد میں آپ ﷺ کے اردگرد موجود صحابی ایک ایک کر کے لڑتے اور شہید ہوتے رہے۔ ایک ایسا وقت بھی آ گیا کہ حضور پرنور ﷺ کی حفاظت کے لیے صرف دس، بارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رہ گئے، پھر کم ہوتے ہوتے پانچ، چھ رہ گئے۔ رفتہ رفتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوتے گئے اور کفار کا لشکر انہیں لڑائی میں الجھا کر منتشر کرتا رہا۔ پھر ایسا وقت بھی آیا کہ رسول اللہ ﷺ کے اردگرد صرف دو، تین صحابہ رہ گئے۔

ان حالات میں معروف صحابیہ حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا سرورِ کائنات ﷺ کی سیکیورٹی کرنے لگیں۔ حالات کی سنگینی دیکھیے کہ میدانِ جنگ میں یہ نوبت بھی آ گئی کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے دفاعی دستے میں صحابیات رضی اللہ عنہن کو بھی شامل ہونا پڑا۔ آج لوگ حق کے لیے خواتین کی جد و جہد اور ان کے عملی طور پر شریک ہونے پر انہیں طعنہ دیتے ہیں کہ تم عورتیں ہو اور انقلابی جد و جہد میں حصہ کیوں لیتی ہو؟ یاد رہے کہ یہ خیر الخلائق آقا ﷺ کی سنت ہے کہ میدانِ جنگ میں صحابیات بھی لشکرِ اسلام کے ہمراہ ہوتی تھیں۔ جب مرد صحابہ جنگ میں شریک تھے تو ان حالات میں کفار کو پیچھے کی جانب بھی دھکیلنا ضروری تھا تا کہ وہ حضور نبی اکرم ﷺ کو خدانخواستہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ ایسے حالات میں حضرت اُم عمارہ نسیبہ بنتِ کعب رضی اللہ عنہا آگے بڑھیں اور کفار سے لڑنے لگیں۔ انہیں اس دوران سر سے پاؤں تک تلواروں اور تیروں کے بارہ زخم لگے تھے۔ حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتایا کہ میں اپنی سکیورٹی میں دائیں دیکھتا تو مجھے وہاں بھی اُم عمارہ رضی اللہ عنہا میرا دفاع کرتے اور کفار سے جنگ لڑتے نظر آتی تھیں۔ بائیں دیکھتا، سامنے دیکھتا ہر طرف ام عمارہ دوڑ دوڑ کر اور لپک لپک کر تینوں

سمتوں میں کافروں سے دو بدو لڑتی نظر آتی تھیں۔ حدیث مبارکہ کے الفاظ ہیں:

مَا الْتَفَتُّ يَمِينًا وَلَا شِمَالًا إِلَّا وَأَنَا أَرَاهَا تُقَاتِلُ دُونِي. (۱)

(اُحد کے روز ایک وقت آیا کہ) میں اپنے دائیں بائیں جدھر دیکھتا تھا تو میری حفاظت میں اُم عمارہ نسیبہ بنتِ کعب رضی اللہ عنہا ہی لڑ رہی ہوتی تھیں۔

حضرت اُم عمارہ رضی اللہ عنہا اس بات پرفخر کرتی تھیں کہ غزوہ اُحد کے موقع پر ارشاد فرمائے گئے آقاے دو جہاں ﷺ کے یہ کلمات میرا فخر اور میری زندگی کا کُل سرمایہ ہیں۔

پھر جنگ میں ایسی نوبت بھی آئی کہ ان کے شوہر، ان کے بیٹے اور ان کے بھائی بھی آقا ﷺ کا دفاع کر رہے تھے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی مکمل سیکیورٹی اُم عمارہ رضی اللہ عنہا کے پورے خاندان نے سنبھالی ہوئی تھی۔ حضرت اُمِّ عمارہ کہتی ہیں کہ جب آقا ﷺ کی سیکیورٹی پر صرف دس آدمی رہ گئے تھے تو اس وقت میں اور میرے دو بیٹے حضور ﷺ کے آگے دفاعی جنگ لڑ رہے تھے۔ میرے دونوں بیٹے بھی دائیں بائیں کفار سے لڑ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آقا ﷺ کے قدموں میں شہید نہ ہوئے تو تمہیں قبر تک معاف نہیں کروں گی۔ فرماتی ہیں:

وَأَنَا وَابْنَايَ وَزَوْجِي بَيْنَ يَدَيْهِ، نَذُبُّ عَنْهُ، وَالنَّاسُ يَمُرُّونَ بِهِ مُنْهَزِمِينَ. (۲)

میں اور میرے بیٹے (دائیں بائیں) تھے اور میرے شوہر آپ ﷺ کے آگے تھے۔ ہم حضور ﷺ پر حملہ کرنے والوں سے آپ ﷺ کو بچاتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب عوام بھاگے جا رہے تھے۔

---

(۱) ۱۔ ابن سعد، الطبقات الكبرى، ۸: ۴۱۵
۲۔ عسقلانی، فتح الباری، ۶: ۸۰
۳۔ عسقلاني، الإصابة في تمييز الصحابة، ۸: ۲۶۶
۴۔ هندی، كنز العمال، ۱۳: ۲۶۹، رقم: ۳۷۵۹۲

(۲) ابن سعد، الطبقات الكبرى، ۸: ۴۱۴

حضرت اُم عمارہ ﷝ کے علاوہ درج ذیل خواتین بھی اس غزوہ میں عملاً شریک تھیں:

۱۔ حضرت ام سُلیم وہ صحابیہ تھیں، جو باقاعدہ مسلح ہو کر میدان جنگ میں جاتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اُن پر بھی حملہ ہوسکتا ہے، اس لیے وہ دفاع کرنا بھی جانتی تھیں۔(۱) گویا آقاے دو جہاں ﷺ نے مرد ہوں یا عورتیں، جوان ہوں یا بچے، بوڑھے سب کی ایسی تربیت کی تھی۔

۲۔ حضرت سعد بن معاذ ﷜ کی والدہ حضرت اُم سعد ﷝ اپنے سارے خاندان سمیت لڑ رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے انہیں اور ان کے خاندان کو خوش خبری دیتے ہوئے فرمایا:

يَا أُمَّ سَعْدٍ، أَبْشِرِي وَبَشِّرِي أَهْلِيهِمْ، أَنّ قَتَلَاهُمْ قَدْ تَرَافَقُوا فِي الْجَنّةِ جَمِيعًا – وَهُمُ اثْنَا عَشَرَ رَجُلًا – وَقَدْ شَفَعُوا فِي أَهْلِيهِمْ.(۲)

اے اُم سعد! تجھے خوش خبری ہو اور ان کے خاندان کو بھی خوش خبری سناؤ کہ اللہ کی راہ میں ان کے شہید ہونے والے جمیع اَفراد جنت میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں – وہ شہید ہونے والے بارہ اَفراد تھے – اور وہ اپنے اَہل و عیال کی شفاعت بھی کریں گے۔

۳۔ نبی آخر الزمان ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ ﷝ بنت عبد المطلب بھی لوگوں کے منتشر ہوتے وقت اُحد کے میدان میں اگلے محاذ پر جنگ میں شریک تھیں۔(۳)

۴۔ غزوۂ اُحد میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ﷝ اور حضرت اُم سلیط ﷝ بھی

---

(۱) ۱۔ احمد بن حنبل، المسند، ۳:۲۸۶، رقم: ۱۴۰۸۱
۲۔ ابن حبان، الصحیح، ۱۱:۱۶۹، رقم:۴۸۳۸
۳۔ ابن أبی شیبة، المصنف، ۷:۴۱۹، رقم:۳۶۹۹۹

(۲) واقدی، المغازی، ۳:۳۱۶

(۳) ابن سعد، الطبقات الکبری، ۸:۴۱

شریک تھیں۔[1]

الغرض کوئی بھی غزوہ ہوتا مدینہ منورہ کی خواتین صحابیات عملاً اس غزوہ میں شریک ہوتیں۔ تلوار سے لڑنے کے ساتھ ساتھ یہ صحابیات مجاہدین کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹیاں بھی کیا کرتی تھیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ صحابیات صرف پانی پلانے اور مرہم پٹی کرتی تھیں۔ تاریخ کے قرطاس اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ میدانِ جنگ کے اندر نیزوں اور تیروں سے بھی لڑی ہیں اور آقاے دو جہاں ﷺ کا بھرپور دفاع بھی کیا ہے۔ گویا مرد مجاہدین والا ہر کام خواتین مجاہدات نے بھی کیا ہے۔ یہ کلچر تھا جو آقا ﷺ نے اُمت کو دیا۔

خواتین کی جنگوں میں شرکت کے حوالے سے اَئمہ و محدثین نے اپنی کتب میں باقاعدہ ابواب قائم کیے ہیں۔ مثال کے طور پر امام بخاری نے 'الصحیح' کی 'کتاب الجهاد والسیر' میں درج ذیل اَبواب باندھے ہیں:

۱۔ بَابُ غَزْوِ النِّسَاءِ وَقِتَالِهِنَّ مَعَ الرِّجَالِ (خواتین کا مردوں کے شانہ بشانہ غزوہ میں شریک ہونا)

۲۔ بَابُ غَزْوِ الْمَرْأَةِ فِي الْبَحْرِ (خواتین کی بحری جنگ (naval war) میں شرکت)

۳۔ بَابُ حَمْلِ النِّسَاءِ الْقِرَبَ إِلَى النَّاسِ فِي الْغَزْوِ (غزوہ میں عورتوں کا مردوں کے لیے مشکیں بھر کر لانا)

۴۔ بَابُ مُدَاوَاةِ النِّسَاءِ الْجَرْحٰى فِي الْغَزْوِ (میدان جہاد میں عورتوں کا

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجهاد والسیر، باب غزوة النساء وقتالهن مع الرجال، ۳:۱۰۵۵، رقم:۲۷۲۴

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب المغازی، باب ذکر أم سلیط، ۴:۱۴۹۴، رقم:۳۸۴۳

زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا)

۵۔ **بَابُ رَدِّ النِّسَاءِ الْجَرْحٰی وَالْقَتْلٰی** (عورتوں کا زخمیوں اور مقتول لوگوں کو اٹھا کر لے جانا)

۶۔ **بَابُ حَمْلِ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ فِي الْغَزْوِ دُونَ بَعْضِ نِسَائِهِ** (دیگر بیویوں کو چھوڑ کر صرف ایک کو جہاد میں ساتھ لے جانا)[1]

امام مسلم نے 'الصحیح' کی 'کتاب الجہاد والسیر' میں **بَابُ غَزْوَةِ النِّسَاءِ مَعَ الرِّجَالِ** (خواتین کا مردوں کے ہمراہ جنگ میں حصہ لینا) قائم کیا ہے۔[2]

امام ابو داود نے 'السنن' کی 'کتاب الجہاد' میں **بَابٌ فِي النِّسَاءِ يَغْزُونَ** (خواتین کا جنگ میں حصہ لینا) قائم کیا ہے۔[3]

علاوہ ازیں دیگر ائمہ و محدثین نے اپنی اپنی کتب میں اِس موضوع پر ابواب قائم کیے اور کثیر احادیث روایت کی ہیں۔

(i) صحابیات کا میدانِ جنگ سے فرار ہونے والوں کو دوبارہ جنگ پر آمادہ کرنا

غزوۂ اُحد میں ایسے حالات بھی آئے کہ جب عوام میں سے بعض لوگوں نے دیکھا دیکھی میدانِ جنگ سے بھاگ کر اِدھر اُدھر پناہ لے لی۔ حضرت اُمِ عمارہ بنتِ کعب اور حضرت اُمّ ایمن رضی اللہ عنہما کنکریاں، مٹی، پتھر اور ڈنڈے اٹھا کر ان کو مارتیں اور کہتی تھیں کہ مرد کہلاتے ہو؟ شرم سے ڈوب مرو! مرد ہو کر میدان سے بھاگ کر یہاں بیٹھے ہو؟ چلو یہاں سے جاؤ اور کفار

---

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب الجہاد والسیر، ۳:۱۰۵۴-۱۰۵۶

(۲) مسلم، الصحیح، کتاب الجہاد والسیر، ۳:۱۴۴۲

(۳) أبو داود، السنن، کتاب الجہاد، ۲:۲۲

سے لڑو۔[۱]

تصور کریں کہ غزوات میں صحابیات کی جرأت و بہادری کا کیا عالم ہوتا تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی ایسی صحابیات بھی تھیں کہ جن کے باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے شہید ہو گئے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ آپ کے گھرانے کے تمام مرد شہید ہو گئے تو اس موقع پر ان کا ردِعمل نہایت غیر معمولی تھا۔ انہوں نے کہا کہ سارے چلے گئے ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتایا جائے کہ ہمارے آقا ﷺ کا کیا حال ہے؟ جب آقائے دو جہاں ﷺ ان کو نظر آئے اور حضور نبی اکرم ﷺ نے ان کے گھر والوں کی شہادت کی خبر دی تو وہ مسکراتے ہوئے کہتی تھیں کہ آقا ﷺ آپ سلامت ہیں تو میرا کچھ بھی نہیں گیا، کوئی پرواہ نہیں۔ اُس صحابیہ رضی اللہ عنہا نے اس موقع پر درج ذیل تاریخی الفاظ کہے:

كُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ.[۲]

(یارسول اللہ!) آپ کی سلامتی کے بعد ہر مصیبت ہیچ ہے۔

(ii) پیرانہ سالی کے باوجود جنگ میں شرکت

۱۔ اَنصارِ مدینہ کی خواتین میں سے حضرت اُم سلیط رضی اللہ عنہا بھی غزوۂ اُحد میں شریک تھیں۔[۳] آپ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ خود بڑی

---

(۱) ۱۔ بيهقي، دلائل النبوة، ۳: ۳۱۱
۲۔ حلبي، انسان العيون في سيرة الأمين المأمون، ۲: ۵۰۴

(۲) ۱۔ ابن ہشام، السيرة النبوية، ۴: ۵۰
۲۔ طبری، تاريخ الأمم والملوك، ۲: ۷۴
۳۔ بيهقي، دلائل النبوية، ۳: ۳۰۲
۴۔ ذہبی، تاريخ الاسلام، ۲: ۲۱۷
۵۔ ابن كثير، البداية والنهاية، ۴: ۴۷

(۳) ۱۔ بخاری، الصحيح، كتاب الجهاد والسير، باب غزوة النساء وقتالهن ←

عمر کے صحابی تھے، ان کی والدہ کی عمر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کم از کم ساٹھ ستر سال کی ہوں گی۔ اندازہ کریں اس قدر بزرگ صحابیہ بھی میدان جنگ میں موجود تھیں۔

۲۔ اسی طرح حضرت اُم اَیمن بھی ایک ضعیف العمر صحابیہ تھیں۔ جب آقائے دو جہاں ﷺ کی والدہ حضرت آمنہ ؓ کا مقامِ ابوہ میں وصال ہوگیا، اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک ۶ سال تھی۔ اس سفر میں حضرت ام ایمن بھی آپ ﷺ کے ہمراہ تھیں۔ اور انہی کے ساتھ آپ ﷺ مکہ واپس آئے تھے۔ اندازہ کرلیں کہ غزوہ اُحد کے وقت حضور نبی اکرم ﷺ کی عمر مبارک تقریباً ۵۵ سال تھی تو حضرت ام ایمن ؓ کی عمر کیا ہوگی، تقریباً ۷۰ سال ہوگی۔ آپ ؓ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود غزوۂ احد میں آقائے دو جہاں ﷺ کی سیکیورٹی کر رہی تھیں۔ (۱)

۳۔ نہ صرف بزرگ خواتین بلکہ ضعیف العمر صحابہ کرام ؓ نے بھی تاریخ اسلام میں آنے والے متعدد معرکوں کے اندر عملی شرکت کی۔ حضرت ابو ایوب انصاری ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے قسطنطنیہ کی فتح کی بشارت سنی ہوئی تھی۔ وہاں پر حملے کے وقت آپ کی عمر مبارک بانوے (۹۲) سے چھیانوے (۹۶) سال کے درمیان تھی۔ آپ ؓ نے اس پیرانہ سالی کے باوجود استنبول جا کر جہاد میں حصہ لیا۔ (۲)

.... مع الرجال، ۳:۱۰۵۵، رقم:۲۷۲۴

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب المغازی، باب ذکر أم سلیط، ۴:۱۴۹۴، رقم:۳۸۴۳

(۱) ۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبری، ۸:۲۲۵

۲۔ ابن حجر عسقلانی، الإصابة في تمییز الصحابة، ۸:۱۷۲

۳۔ حلبی، انسان العیون في سیرة الامین المأمون، ۲:۵۰۴

(۲) ۱۔ أبو نعیم، حلیة الأولیاء، ۱: ۳۶۱

۲۔ فسوی، المعرفة والتاریخ، ۳: ۳۲۸

۳۔ ابن الجوزی، صفة الصفوة، ۱:۴۷۰

۴۔ نووی، تہذیب الأسماء، ۲: ۴۶۹

۵۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۶: ۱۰۲

←

آج تحریکِ منہاج القرآن کے اِحیاے اسلام و تجدید دین کے مصطفوی مشن میں شریک بزرگ افراد، بزرگ صحابہ کرام ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہیں۔

(iii) اِنقلابی بیٹیاں، صحابیات اور اَہلِ بیتِ اَطہار ﷺ کی پیروکار ہیں

یاد رکھیں! ہماری جو بیٹیاں، بہنیں اور خواتین مصطفوی انقلاب کے مشن میں حصہ لیتی ہیں، وہ حضور نبی اکرم ﷺ کی صحابیات کی سنت پر عمل کرتی ہیں۔ بعض لوگ گھبرا کر انہیں مشن کا کام کرنے سے روکتے ہیں۔ خدارا! انہیں اس عظیم سعادت سے نہ روکیں۔ غزوات میں اُمہات المومنین کے تذکار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ آقاے دو جہاں ﷺ کی سنت ہے۔ اگر انقلاب کی جد و جہد اور حق و باطل کے معرکے میں خواتین کا جانا جائز نہ ہوتا تو سب سے پہلے امامِ عالی مقام حضرت امام حسین علیہ السلام اس حکم پر عمل کرتے اور سبطِ رسول سیدہ زینب ﷺ، سیدہ سکینہ ﷺ اور ساری شہزادیوں کو مدینہ سے کربلا ساتھ نہ لے جاتے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب ہم سب شہید ہو جائیں گے تو قافلۂ کربلا کی قیادت سیدۂ زینب ﷺ کے ہاتھ میں ہوگی۔ دربارِ یزید میں انہی کی آواز گونجے گی اور وہی قافلۂ حسینی کو سلامتی سے لے کر مدینہ تک واپس لائیں گی۔

اللہ کا شکر ہے کہ تحریک منہاج القرآن کے زیر اہتمام ہونے والی ہر انقلابی جد و جہد میں ہمارے بزرگوں، جوانوں، بیٹوں، ہماری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو اس پوری سنت پر عمل کرنے کا بھرپور موقع ملا ہے۔

(۳) مقامِ صبر اور یقین

جب حضور نبی اکرم ﷺ کا دفاع کرنے والے صحابہ کرام ﷺ ایک ایک کر کے جام شہادت نوش کرتے جا رہے تھے تو کفار آہستہ آہستہ آپ ﷺ کے قریب ہوتے گئے۔ اسی اثنا میں کفار میں سے بدبخت عتبہ بن ابی وقاص اور ابی قمحہ کے حملہ سے پیکرِ اخلاق حضور نبی اکرم ﷺ

٦۔ ملا علی القاری، مرقاۃ المفاتیح، ۲: ۴۷

اُحد کے میدان میں زخمی ہو جاتے ہیں، دائیں جانب کا نچلا دندان مبارک کا ایک حصہ شہید ہو جاتا ہے، آقاے دوجہاں ﷺ کا کندھا مبارک بھی زخمی ہے، رخسارِ منور پر بھی زخم آیا ہے، جس سے خون مبارک بہہ رہا ہے۔ غشی کی حالت طاری ہونے کی بناء پر جسمِ مقدس بھی زمین پر تشریف لے آتا ہے۔ کفار نے یہ افواہ پھیلا دی کہ آقا ﷺ شہید ہوگئے۔ جب حضور نبی اکرم ﷺ نیچے تشریف لائے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی طرف لپکے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم ﷺ کا دست مبارک پکڑا اور اوپر کی جانب کھینچا اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔

آقا ﷺ اس خون آلود حال کے باوجود لوگوں کو مجتمع فرما رہے تھے اور اس دوران اپنے دستِ مبارک سے خون پونچھتے اور فرماتے جاتے:

كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ خَضَّبُوا وَجْهَ نَبِيِّهِمْ بِالدَّمِ، وَهُوَ يَدْعُوهُمْ إِلٰى رَبِّهِمْ عزوجل. (۱)

وہ قوم کیسے نجات پائے گی جس نے اپنے رب کی طرف بلانے والے اپنے نبی کے چہرے کو خون آلود کر دیا!

دوسری روایت میں ہے:

كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ شَجُّوْا نَبِيَّهُمْ وَكَسَرُوْا رَبَاعِيَتَهٗ وَهُوَ يَدْعُوْهُمْ إِلَى اللهِ. (۲)

---

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۱۷۸، رقم: ۱۲۸۵۴
۲۔ ابن ماجه، السنن، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، ۲: ۱۳۳۶، رقم: ۴۰۲۷
۳۔ نسائی، السنن الكبرى، ۶: ۳۱۴، رقم: ۱۱۰۷۷

(۲) ۱۔ بخاری، الصحيح، كتاب المغازی، باب ليس لك من الأمرِ شيء، ۴: ۱۴۹۳

←

وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کا سر زخمی کر دیا اور سامنے کا دانت توڑ دیا، حالانکہ وہ ان کو اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہے!

آپ ﷺ کے ساتھ اُحد کے میدان میں اس قدر ظلم روا رکھا گیا مگر اس کے باوجود رسالت مآب حضرت محمد ﷺ صبر فرما رہے ہیں۔ اس نوعیت کا مقامِ صبر یقین کے بغیر نہیں آتا۔ جب یقین اتنا پختہ ہو جائے کہ فولاد بھی ٹکرائے تو ریزہ ریزہ ہو جائے تو منزل کا حصول لازم ہوتا جاتا ہے۔ جب آقائے دو جہاں ﷺ کی زبانِ اقدس پر یہ کلمہ مبارک آیا تو اللہ رب العزت نے فوری جبریل امین علیہ السلام کو بھیجا کہ جا کر میرا پیغام دیں:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ۝[1]

(اے حبیب! اب) آپ کا اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں، چاہے تو اللہ انہیں توبہ کی توفیق دے یا انہیں عذاب دے کیوں کہ وہ ظالم ہیں۝

یعنی محبوب! جو آپ کا کام تھا، وہ آپ شاندار انداز سے کر چکے۔ آپ سرخرو، کامیاب و کامران اور فتح یاب ہوگئے۔ آگے ان کے ساتھ کیا ہوگا؟ کب ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ یہ کام آپ کا نہیں ہے، یہ ظالم ہیں۔ ان کے ساتھ کیا کرنا ہے یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔

جب ظلم کی اتنی انتہاء ہو جائے تو یہی وہ مقام ہے جہاں انسان بے صبرا ہو جاتا ہے۔ یہیں ہر انسان کی جد و جہد کی تاریخ میں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے رسولوں اور پیغمبروں علیہم السلام کا نہ صرف مرّبی ہوتا ہے بلکہ اس نے ان کو معصوم بھی بنایا ہے اور ان کا کفیل بھی خود ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا زبانِ اطہر پر بھی ایسی بات نہ آنے دی کہ کل کوئی اس کو کوئی اور رُخ نہ دے سکے۔ آپ ﷺ نے صرف اتنا کلمہ فرمایا تھا کہ وہ قوم جس نے اپنے رب کی طرف بلانے والے اپنے نبی کے چہرے کو خون آلود کر دیا، کیسے نجات پائے گی؟ اللہ نے

.... ۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب الجهاد والسير، باب غزوة أحد، ۳: ۱۴۱۷، رقم: ۱۷۹۱

(۱) آل عمران، ۳: ۱۲۸

وہیں روک دیا کہ محبوب! اس سے آگے کچھ نہیں کہنا، آپ کا کام مکمل ہو چکا، مبارک ہو آپ سرخرو ہو گئے، اب یہاں سے آگے اللہ کا کام ہے۔

(۴) امام الانبیاء ﷺ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اِستقامت کی تلقین

ان قیامت خیز لمحات میں امام الانبیاء ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرما رہے تھے کہ ثابت قدم رہو۔ آپ ﷺ نے ثابت قدمی کے ساتھ ڈٹے رہنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بالخصوص آخرت میں اپنی معیت و رفاقت اور جنت کی خوش خبری دی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ اُحد کے دن حضور نبی اکرم ﷺ تنہا رہ گئے، آپ ﷺ کے ساتھ صرف سات انصاری اور دو قریشی تھے۔ جب کفار نے آپ ﷺ کا محاصرہ کر لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ يَرُدُّهُمْ عَنَّا وَلَهُ الْجَنَّةُ أَوْ هُوَ رَفِيقِي فِي الْجَنَّةِ. (۱)

ان دشمنوں کو ہمارے پاس سے کون ہٹائے گا؟ (اور جس نے ان کو ہٹایا تو) اس شخص کو جنت ملے گی، (یا فرمایا:) وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔

غزوۂ اُحد کے ان حالات کی منظرکشی قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے:

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰکُمْ فَاَثَابَکُمْ غَمًّا م بِغَمٍّ لِّکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا مَآ اَصَابَکُمْ ط وَاللهُ خَبِیْرٌ م بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ (۲)

جب تم (افراتفری کی حالت میں) بھاگے جا رہے تھے اور کسی کو مڑ کر نہیں دیکھتے تھے اور رسول (ﷺ) اس جماعت میں (کھڑے) جو تمہارے پیچھے (ثابت قدم) رہی تھی تمہیں پکار رہے تھے پھر اس نے تمہیں غم پر غم دیا (یہ نصیحت و تربیت تھی) تاکہ تم اس

(۱) مسلم، الصحيح، كتاب الجهاد والسير، باب غزوة أحد، ۳: ۱۴۱۵، رقم: ۱۷۸۹

(۲) آل عمران، ۳: ۱۵۳

پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہا اور اس مصیبت پر جو تم پر آن پڑی، رنج نہ کرو، اور اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہےo

گویا فرمایا جا رہا ہے کہ یہ مت سوچو کہ کیا کیا چلا گیا، کیا کیا مصیبت آئی، کون کون زخمی اور شہید ہو گیا اور کس پر کیا کیا بیتی؟ فرمایا: رنج و غم میں نہ پڑو، مصیبت کو مت دیکھو اور صرف یقین، توکل اور اللہ کی مدد و نصرت پر ایمان رکھتے ہوئے ثابت قدمی سے آگے بڑھتے رہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس لیے تمہیں غموں کی بھٹی سے گزارا ہے تاکہ تم غموں کے خوگر ہو جاؤ۔ مشکلات کے عادی ہو جاؤ اور تمہارا ایمان حالات کی بھٹی میں مزید نکھر جائے اور مضبوط و مستحکم ہو جائے۔

(۵) اَہلِ حق کی تربیت کا اِہتمام

غزوۂ اُحد میں جب افواہ پھیل گئی کہ رہبرِ انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ شہید ہو گئے ہیں تو لوگ حوصلہ ہار گئے۔ کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دل برداشتہ ہو کر دور گھاٹی میں سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ کسی نے پوچھا کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ کہا: جن کی خاطر لڑتے تھے وہ نہیں رہے، اب ہمیں اپنی زندگی کا کوئی مقصد نظر نہیں آ رہا۔ اب ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے؟ جب ایسے حالات پیدا ہوئے اور اس قسم کی باتیں ہوئیں تو قرآن مجید کی آیت نازل ہوئی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ. (۱)

اور محمد (ﷺ بھی تو) رسول ہی ہیں (نہ کہ خدا)۔ آپ سے پہلے بھی کئی پیغمبر (مصائب اور تکلیفیں جھیلتے ہوئے اس دنیا سے) گزر چکے ہیں، پھر اگر آپ (ﷺ) وفات فرما جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اپنے (پچھلے مذہب کی طرف) الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ (یعنی کیا ان کی وفات یا شہادت کو معاذ اللہ دین اسلام کے حق

(۱) آل عمران، ۳: ۱۴۴

نہ ہونے پر یا ان کے سچے رسول نہ ہونے پر محمول کرو گے)۔

اس آیتِ مبارکہ کے ذریعے اللہ رب العزت نے مسلمانوں کی تربیت کا اہتمام فرمایا اور مشن سے استقامت کے ساتھ جڑے رہنے کی تلقین فرمائی کہ اگر مصطفیٰ ﷺ شہید بھی ہو جائیں تو مشن کو کبھی نہیں چھوڑنا۔ تمہیں منزل کے حصول تک سفر جاری رکھنا ہے۔ پہلے بھی میرے کئی اَنبیاء و رُسل علیہم السلام آئے، کئی وفات پا گئے، کئی شہید ہوگئے، کئی ٹکڑے کر دیے گئے، کئی آرے سے چیر دیے گئے۔ اگر یہ رسول ﷺ شہید ہو گئے یا ان کی وفات ہوگئی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مقصد کھو گیا۔ ہرگز نہیں! تمہیں اللہ کے آخری رسول ﷺ نے جس مقصد پر لگا دیا ہے، حالات کیسے بھی ہوں تم نے اس پر گامزن رہنا ہے۔ رسولِ اقدس ﷺ نے تمہیں اپنی بعثت کے مقصد کے ساتھ ایک لگن اور تعلق سے آشنا کروایا ہے۔ اب حالات خواہ کچھ بھی ہو جائیں تم نے اس راہِ حق سے پلٹنا نہیں ہے۔

یاد رکھیں! زندہ رہنا یا شہید ہوجانا، ظاہری طور پر فتح پانا یا شکست ہو جانا، دشمن پر غالب ہو جانا یا دشمن کی تلوار سے مارا جانا، اس میں حق یا باطل کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص ایسی ظاہری اور وقتی فتح و شکست اور صورتِ حال کو دیکھ کر واپس کفر کی طرف پلٹنا چاہتا ہے تو وہ کل کے بجائے آج ہی پلٹ جائے کیونکہ اسلام کو مفاد پرست لوگوں کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام کو منافقانہ شعار رکھنے والے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ جو شخص مالِ غنیمت کی خاطر اسلام کے لشکر میں آتا ہے وہ واپس چلا جائے، جو جان قربان کرنے کی خاطر آتے ہیں وہ میرے مصطفیٰ ﷺ کے دل کے قریب ہیں۔ گویا اسلام کے نزدیک خودغرضی، مفاد پرستی، بزدلی اور قدموں کے ڈگمگا جانا کفر کی طرف پلٹ جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آیتِ مبارکہ نے واضح کر دیا کہ لشکرِ اسلام میں کسی کے آنے جانے سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اللہ کا دین غالب آنے والا ہے، ہرصورت ساری دنیا پر اس کا غلبہ ہو کر رہے گا۔ اللہ اور اس کے پیغمبروں کا مشن منزل مقصود تک پہنچ کر رہتا ہے، مگر حق کی جد و جہد میں اونچ نیچ، پریشانیاں اور مایوسیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔

کارکنانِ تحریک متوجہ ہوں!

یاد رکھیں! مسلمان وہ نہیں جو حالات کے بگڑے تیور دیکھ کر مایوس ہو جائے اور یہ تصور کرنے لگے کہ شاید ہمارا دین یا ہمارا مشن سچا نہ تھا۔ نہیں! نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہمارا دین بھی حق ہے اور ہمارا مشن بھی برحق ہے۔ اس کے سچے ہونے کی علامات یہ ہیں کہ قدم قدم پر اس مشن کے رفقاء اور کارکنان پر آزمائشیں آئیں گی۔ اللہ کے دین کی سربلندی کی آرزو لے کر نکلنے والے یہ سن لیں کہ ابھی تو مخالفت کی ہلکی سی ہوا چلی ہے۔ مزاحمت، رکاوٹ، دبانے اور گرانے کا ماحول بننا شروع ہوا ہے۔ ابھی تو آندھیاں آئیں گی، جھکڑ چلیں گے، طوفان برپا ہوں گے، شدید بارشیں آئیں گی، اولے بھی پڑیں گے، اندھیرے بھی آئیں گے، ہر طرف سے گھیرا جائے گا اور سرزمینِ پاک پر جینا دوبھر ہو جائے گا۔ اتنا مشکل ہوگا کہ شاید تمہیں ملک بدر کر دیا جائے، مگر جو مصطفیٰ ﷺ کے دین کی خاطر سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہے، صرف وہی مصطفوی انقلاب کی راہ پر چلے اور جسے یہ گوارہ نہیں ہے وہ کل کے بجائے مصطفوی انقلاب کا مشن آج ہی چھوڑ جائے۔

یاد رہے! ہمیں نہ تو مفادات کی تمنا ہے اور نہ ہی خود غرضیوں کی ضرورت۔ ہم نہ منافقانہ طرزِ عمل چاہتے ہیں اور نہ ہی جھوٹ اور دجل کے طلب گار۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ ہمارا جینا مرنا اللہ کے لیے ہے۔ ہم حضور نبی اکرم ﷺ کے دین کی سربلندی کے لیے جینا چاہتے ہیں اور موت کو بھی آقا ﷺ کے دین کے احیاء اور تجدید کی خاطر ہنس کر قبول کر لیں گے۔

عالم گیر مصطفوی مشن کا نام لینے والو! اپنی زندگیوں کو اللہ کے رنگ میں رنگ لو تاکہ تمہاری زندگیوں سے منافقت کا زنگ اتر جائے۔ تم اللہ کی بارگاہ میں جھک جاؤ، سجدہ ریز ہو جاؤ اور اپنا جان و مال اس کی راہ میں خرچ کرنے والے بن جاؤ۔ ہم اپنے لیے لاکھوں روپے کمائیں مگر اللہ کے دین کی سربلندی اور مصطفیٰ ﷺ کے دین کے لیے ہزاروں لاکھوں میں سے سو روپے قربان کرنے کا وقت آئے تو سو سو (۱۰۰) بار دائیں بائیں دیکھ کر اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالیں۔ معاذ اللہ! دینِ اسلام ہماری جیبوں کا محتاج ہرگز نہیں ہے۔

جس کو توفیق نصیب ہوتی ہے تو یہ ذاتِ باری تعالیٰ کا فضل ہے۔ ورنہ اس نے قارون کو بھی بہت کچھ دیا تھا، مگر اس کے خزانوں میں سے اپنی راہ کے لیے کچھ قبول نہ کیا اور وہ دھتکارا گیا۔ خوش بخت ہیں وہ لوگ جنہیں کھانے کو دو لقمے ملیں اور وہ اس میں سے ایک لقمہ اللہ کے لیے دے دیں اور دوسرے لقمہ سے اپنی بھوک مٹائیں۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جسے اللہ تھوڑا بھی دے مگر اپنی ضرورت کو اللہ کی ضرورت پر خرچ کر دے۔ محض گلے پھاڑ کر تقریریں اور وعظ کرنے سے معاشرے میں انقلاب نہیں آتے۔ انقلاب بپا کرنے کے لیے تو تن من دھن سب کچھ لٹانا پڑتا ہے، مفادات قربان کرنے پڑتے ہیں اور آزمائشوں کی چکیوں میں پسنا پڑتا ہے۔ مصائب کے پہاڑوں کے نیچے دبنا پڑتا ہے، آندھیوں اور جھکڑوں سے ٹکرانا پڑتا ہے۔ سو بار تراش خراش ہوتی ہے تو پھر کہیں جا کر ہیرا بنتا ہے۔

قارئین کرام! سودا بڑا آسان ہے۔ اگر ہم ہی ہمت ہار کر بیٹھ جائیں تو اللہ اپنا فضل اور نصرت نازل فرمائے تو کس لیے فرمائے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہمت ہار کر بیٹھ جانے والے بزدلوں پر کبھی اللہ کا فضل اور رحمت نہیں اترا کرتی۔ ہمیشہ اللہ کا فضل اور رحمت ان پر نازل ہوتی ہے جو لٹتے بھی ہیں، کٹتے بھی ہیں، زخموں سے چور چور بھی ہوتے ہیں، دنیاوی ساز و سامان سے محروم بھی ہوتے ہیں اور شہید بھی ہوتے ہیں؛ مگر جب اللہ کے دین کی طرف سے پکار آتی ہے تو وہ ہر چیز کو بھول کر ایمان کی قوت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولا! کچھ اور تو ہمارے پاس نہیں؛ بس ایک تن ہے، اسے بھی تیری راہ میں لٹاتے ہیں۔ اسے قبول کر لے۔ جو لوگ اپنا تن، من اور دھن بھی مولا کو سونپ دیتے ہیں، رب ذوالجلال کی طرف سے فضل اور نصرت کا نزول انہی کا مقدر ہوتا ہے۔ پھر ان نیک و سعید بندوں کو بالآخر فتح و نصرت اور کامیابی و کامرانی سے نوازا جاتا ہے۔

اللہ رب العزت نے مذکورہ آیاتِ قرآن کے ذریعے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اِسی انداز میں تربیت فرما کر ان کے حوصلوں کو بڑھایا اور پھر سابقہ اَنبیاء و اَولیاء کرام علیہم السلام کی اِستقامت کی مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوۡا لِمَاۤ اَصَابَهُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوۡا وَمَا اسۡتَكَانُوۡا ‌ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ ۝ (۱)

اور کتنے ہی انبیاء ایسے ہوئے جنہوں نے جہاد کیا ان کے ساتھ بہت سے اللہ والے (اولیاء) بھی شریک ہوئے، تو نہ انہوں نے ان مصیبتوں کے باعث جو انہیں اللہ کی راہ میں پہنچیں ہمت ہاری اور نہ وہ کمزور پڑے اور نہ وہ جھکے، اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ۝

الغرض اللہ تعالیٰ اُمتِ محمدی کی اس انداز سے تربیت فرما رہا ہے تاکہ وہ صبر کے دامن کو ہمیشہ تھامے رکھیں اور استقامت کے ساتھ منزل کی طرف گامزن رہیں۔ صحابہ کرام ﷺ کی تربیت کے لیے تو براہِ راست وحیِ الٰہی اترتی تھی۔ اِن آیات میں تربیت کا سامان اترتا تھا اور پھر اِن چیزوں کو حضور نبی اکرم ﷺ کے ذریعے ان صحابہ کی شخصیات کا حصہ بنایا جاتا تھا۔ ارشاد فرمایا:

كَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيۡكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ۝ (۲)

اسی طرح ہم نے تمہارے اندر تمہی میں سے (اپنا) رسول بھیجا جو تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں (نفسًا وقلبًا) پاک صاف کرتا ہے اور تمہیں کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت و دانائی سکھاتا ہے اور تمہیں وہ (اسرارِ معرفت وحقیقت) سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے ۝

ہادیِ برحق حضرت محمد ﷺ اپنے صحابہ کرام ﷺ کی اس طرح تربیت فرماتے تھے کہ ان پر آیات تلاوت کرتے۔ اُن کے نفس وقلوب کو پاک کرتے تاکہ ان کے نفس اور قلب و باطن اتنے صاف ستھرے ہو جائیں کہ شک کی گرد، بے یقینی، مایوسی اور ریب داخل نہ ہو سکے گویا

(۱) آل عمران، ۱۴۶:۳
(۲) البقرة، ۱۵۱:۲

قرآن مجید صحابہ کرام کی براہِ راست (direct) تربیت فرماتا۔ صحابہ کی زندگی میں بھی مشکل حالات آتے تھے۔ وہ بھی مشکلات میں سے گزرتے، ان پر بھی گمان اور خیالات حملہ آور ہوتے تھے۔ احمدِ مصطفیٰ ﷺ کے فرامین اور قرآن مجید نے انہیں بچا کر رکھا اور ان کی تربیت کر کے انہیں اس گرداب سے نکال لیا۔ یہ اندازِ تربیت قیامت تک اُمت کے اَہلِ حق کے لیے ہدایت کا سامان ہے۔

تمام انبیاء علیہم السلام تو حق کے دفاع میں باطل کے مقابل جہاد کرتے ہی تھے، مگر ان کی فوج میں بڑے بڑے اولیاء بھی ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ بڑے بڑے مشکل، پریشان کن اور طبیعتوں میں زلزلہ بپا کر دینے والے حالات آئے، مگر انہوں نے ان مصیبتوں پر ہمت نہ ہاری اور وہ ہر مشکل میں یقین اور استقامت کا پہاڑ بنے رہے۔

اللہ رب العزت نے مشکلات اور مصائب پر صبر کرنے والے اِن انبیاء و اولیاء کی دُعا کا بھی قرآن مجید میں تذکرہ فرمایا کہ وہ ان ساری مشکلات میں صبر، استقامت اور یقین کا پہاڑ بنے رہتے اور زبان پر شکوہ، شکایت اور گلہ نہ لاتے۔ کیسے بھی حالات ہوتے، شکوہ ان کی بولی نہ ہوتی تھی۔ ''کیوں، کب اور کیسے'' کے الفاظ کبھی بھی ان کی زبان پر نہ آتے تھے۔ اس لیے کہ یہ الفاظ تھکے ہارے اور مایوس لوگوں کے ہوتے ہیں۔ ایمان اور مایوسی کبھی دونوں ایک ساتھ نہیں چلتے۔ وہ ان الفاظ کے ساتھ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں عرض کرتے:

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ○ (۱)

اور ان کا کہنا کچھ نہ تھا سوائے اس التجا کے کہ اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کام میں ہم سے ہونے والی زیادتیوں سے درگزر فرما اور ہمیں (اپنی راہ میں) ثابت قدم رکھ اور ہمیں کافروں پر غلبہ عطا فرما○

الغرض وہ کٹھن حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی

(۱) آل عمران، ۳: ۱۴۷

بخشش اور ثابت قدمی کے لیے التجا کرتے رہتے۔

اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں غزوۂ احد کے واقعات ایک ربط کے ساتھ ایک مضمون میں بیان فرمائے ہیں۔ ان واقعات اور حالات کے ساتھ ایک باقاعدہ تعلق قائم کر کے ان حالات و واقعات کو دہرا کر، ان کی یادداشتوں کو مرتکز کر کے، درحقیقت اُمتِ محمدیہ کے اہل حق کو درسِ استقامت دینا اور ان کی تربیت کرنا مقصود ہے۔

(۶) کرب ناک کیفیت میں سکینت کا نزول

مسلمانوں نے مجتمع ہو کر حضور نبی اکرم ﷺ کی قیادت اور آپ ﷺ کے توسل و توسط سے ایک مرتبہ پھر کفار کے لشکر کو شکست دی اور اب کی بار وہ مکمل طور پر شکست کھا کر میدانِ جنگ سے بھاگ گئے۔

جب جنگ ختم ہوئی، کفار و مشرکین پلٹ گئے تو مسلمان دکھی اور غمزدہ ایک طرف پہاڑ کے دامن میں جا کر بیٹھ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس حالت میں آسمان سے ان پر غنودگی اتاری۔ ان حالات سے دوچار ہونے کے بعد بیٹھے بیٹھے کوئی سو نہیں سکتا اور نہ ہی اس حال میں کسی کو نیند آ سکتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جنگ کے بعد مسلمانوں پر غنودگی اتاری اور اس میں اپنی اطمینان، سکون اور امان عطا کر دی۔ ارشاد فرمایا:

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ.[1]

پھر اس نے غم کے بعد تم پر (تسکین کے لیے) غنودگی کی صورت میں امان اتاری۔ جو تم میں سے ایک جماعت پر چھا گئی۔

اللہ تعالیٰ نے غم سے نکالنے کے لیے ان پر غنودگی طاری کر دی۔ اللہ ہی جانے انہوں نے اس غنودگی میں کیا کچھ دیکھا ہو گا۔ شاید اللہ رب العزت نے اپنا جلوہ دکھایا ہو گا، انہیں جنت کے کچھ مناظر دکھائے ہوں گے، آقائے دو جہاں ﷺ کی معیت میں قربانیوں کا اجر اور آپ ﷺ

(۱) آل عمران، ۳:۱۵۴

کے زیرِ سایہ لڑنے، کٹنے اور مرنے کی سعادت دکھائی ہوگی۔ اللہ ہی جانے انہیں آنے والی کامیابیوں کے کیا کیا مناظر دکھائے ہوں گے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب اس غنودگی کی کیفیت سے باہر نکلے تو انہیں سکون اور اطمینان آ چکا تھا۔ وہ جو کچھ دیر پہلے غم سے نڈھال تھے، اب وہ کیفیت ختم ہو چکی تھی۔ لڑنے والی، زخم کھانے والی اور چوٹیں کھانے والی جماعت جن کا خسارہ اور شہادتیں ہوئی تھیں اور وہ غموں سے نڈھال ہو چکے تھے، اب اللہ تعالیٰ نے ان پر سکون اتار دیا تھا۔ وہ اپنے سارے غم بھول گئے، ان کا حوصلہ اور عزم بحال ہو چکا تھا۔ ان کے ارادوں کو پھر تازگی اور توانائی مل گئی، ان کے یقین کو پہلے کی طرح کامل کر دیا اور ان کے ایمان کو پھر درجۂ کمال پر پہنچا دیا۔

(۷) منافقینِ مدینہ کا پروپیگنڈہ

اس موقع پر اس دوسری جماعت کا حال بھی ملاحظہ کریں جو ان منافقوں کی تھی جو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ فرمایا:

وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ. (۱)

اور ایک گروہ کو (جو منافقوں کا تھا) صرف اپنی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی، وہ اللہ کے ساتھ ناحق گمان کرتے تھے جو (محض) جاہلیت کے گمان تھے۔

منافقین کی جماعت اس ظاہری شکست کو دیکھتے ہوئے ربِ دوجہاں کے بارے میں بھی زبان درازی کرنے لگی اور کہنے لگی کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (معاذ اللہ) حق کی کامیابی اور فتح یابی کا جھوٹا وعدہ کیا ہے۔ وہ یہ کہہ کر لوگوں میں افواہیں، پراگندگی اور انتشار پھیلانے لگے تو اللہ رب العزت نے فرمایا کہ یہ محض ان کے جاہلیت کے جھوٹے گمان تھے، جن کی بنا پر وہ افواہیں پھیلا کر مسلمانوں میں مایوسی پھیلا رہے تھے۔ وہ کہتے تھے:

هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ. (۲)

(۱) آل عمران، ۳: ۱۵۴

(۲) آل عمران، ۳: ۱۵۴

کیا اس کام میں ہمارے لیے بھی کچھ (اختیار) ہے؟

یعنی کیا فیصلہ کرنے میں ہمارا بھی کوئی اختیار ہے یا جو بات رسول اللہ ﷺ کہیں ہم بلا عذر مانتے چلے جائیں؟ رسول اللہ ﷺ کہیں بدر میں جاکر لڑائی کرو تب بھی ہم لڑائی کے پابند ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کہیں احد کے لیے نکلو اور جاکر لڑو، تب بھی ہم لڑائی کے لیے جائیں۔ ہم ہر بات رسول اللہ ﷺ کی مانیں، کیا ہمارا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے؟ کیا کوئی ہماری بھی رائے اور سوچ ہے کہ نہیں؟ ہماری کوئی بھی بات سنی نہیں جاتی۔

منافقین اس طرح کے جملے بولتے تھے کہ اگر ہماری بات مان لیتے تو آج ستر لاشیں نہ آتیں، آج اتنے زخمی نہ ہوتے، اتنے بڑے بڑے لوگ شہید نہ ہوتے اور اتنا دکھ نہ ہوتا۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ ہماری بات سنی نہیں گئی اور نہ ہی مانی گئی۔ ان کے طعنہ زنی سے عام مسلمانوں کے دل اور ذہن پریشان ہو جاتے۔ منافقین کے اس طرزِ عمل اور طعن و تشنیع پر اللہ رب العزت نے وحی اُتاری:

قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا.[1]

فرما دیں کہ سب کام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ باتیں چھپائے ہوئے ہیں جو آپ پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ کہتے ہیں کہ اگر اس کام میں کچھ ہمارا اختیار ہوتا تو ہم اس جگہ قتل نہ کیے جاتے۔

آقاے دوجہاں ﷺ اُحد سے پلٹ کر آرہے ہیں، لوگ اپنے زخموں کی مرہم پٹی کر رہے ہیں؛ ہر طرف خون ہی خون ہے، پریشان حالی ہے، دکھ اور درد ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں غنودگی کے ذریعے سکون فراہم کر رہا ہے۔ آقاے دوجہاں ﷺ انہیں مسلسل استقامت کا درس دے رہے ہیں جبکہ منافقین کہتے ہیں کہ اگر اس کام میں کچھ ہمارا بھی اختیار ہوتا اور اگر ہمارے مشورے پر عمل کرلیا جاتا تو تم اس جگہ قتل نہ کیے جاتے۔ عبد اللہ بن اُبی نے مشورہ دیا تھا کہ اُحد

(۱) آل عمران، ۳:۱۵۴

میں نہ جائیں اِدھر ہی رہیں۔ اب وہ اپنی بات دہراتا پھرتا تھا کہ اگر ہماری بات سن لی جاتی تو وہاں اس طرح ستر (۷۰) صحابہ شہید نہ کیے جاتے۔ منافقین جان بوجھ کر ایسے جملے بولتے تھے جس سے صحابہ کرام ﷺ کے ذہنوں کو منتشر کیا جا سکے۔ اس پر قرآن نے پھر کہا:

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○[1]

فرما دیں: اگر تم اپنے گھروں میں (بھی) ہوتے، تب بھی جن کا مارا جانا لکھا جا چکا تھا وہ ضرور اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل کر آ جاتے اور یہ اس لیے (کیا گیا) ہے کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اللہ اسے آزمائے اور جو (وسوسے) تمہارے دلوں میں ہیں، انہیں خوب صاف کر دے اور اللہ سینوں کی بات خوب جانتا ہے○

گویا اللہ رب العزت نے ان حالات میں دل میں آنے والے وسوسوں سے بھی مومنین کے دلوں کو صاف فرما دیا کہ جو موت کا وقت آ چکا تھا وہ ہر صورت آنا تھا اور اگر تم خود اپنے آپ کو موت سے اتنے ہی بچانے والے ہو تو گھروں میں چھپ کے بیٹھ جاؤ، دیکھیں گے جب موت آتی ہے تو تم کس طرح سے اپنے آپ کو موت سے بچاتے ہو۔ موت کا وقت تو مقرر تھا اور وہ تو ہر صورت آنا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمہاری بات مانتے تو گھروں میں بزدلی کی موت آتی اور حضور نبی اکرم ﷺ کی قیادت میں اُحد میں گئے تو جوانمردی اور شہادت کی موت آئی اور جنت کے مالک بنے۔ موت تو وہاں بھی آنی تھی اور یہاں بھی آنی تھی۔ تم کون ہوتے ہو کسی کی موت کو روکنے والے۔ کسی کو اختیار ہی نہیں کہ وہ اجل کے مقررہ وقت کو آگے پیچھے کر سکے۔ فرق صرف اتنا ہے کوئی بزدلی اور منافقت کی موت مرتا ہے تو کوئی جواں مردی اور شہادت کی موت کو ہنس کر گلے لگاتا ہے۔

---

(۱) آل عمران، ۳:۱۵۴

غزوۂ اُحد سے قبل بھی منافقین کا طرزِ عمل بزدلی کا عکاس تھا

منافقین کا غزوۂ اُحد سے قبل کا رویہ بھی منافقت اور بزدلی ہی کا عکاس تھا۔ مدینہ منورہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو غزوہ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے: اے کاش! ہم بھی کفر و اسلام کے اس اولین معرکہ میں شریک ہوتے۔ ہم بھی جہاد میں حصہ لیتے اور ہمیں بھی یہ سعادت نصیب ہوتی۔ وہ لوگ ایسی باتیں کرتے کہ اگر ہمیں موقع ملتا تو ہم اپنی جانیں لٹا دیتے، گردنیں کٹا دیتے، خون بہا دیتے اور اپنی جوانیاں لٹا دیتے۔ اسی دوران غزہ احد بھی آ گیا۔ کافروں کے مقابلے میں مسلمان تعداد میں بہت کم تھے۔ ہتھیار اور جنگی ساز و سامان وغیرہ کی بھی شدید قلت تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان حالات میں لڑنا تو کھلم کھلا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ نہ ہتھیار، نہ سواریاں، نہ فوجی، نہ تیاری اور نہ ہی جنگی ساز و سامان۔ اب موت کو سامنے دیکھ کر یہی لوگ کہنے لگے کہ یہ جنگ نہیں بلکہ یہ تو کھلم کھلا خود کشی ہے۔ ان حالات میں وہ ایسی باتیں کرنے لگے کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کی جائے، باہر نہ نکلیں۔ اللہ رب العزت نے فرمایا:

وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ص فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○[1]

اور تم تو اس کا سامنا کرنے سے پہلے (شہادت کی) موت کی تمنا کیا کرتے تھے، سو اب تم نے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا ہے○

یعنی بڑے بڑے دعوے اور حیلے بہانے کرنے والو بتاؤ! کیا تم وہی ہو جو آج سے پہلے اللہ کی راہ میں موت کی تمنا کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ کاش یہ موقع ہمیں ملتا تو ہم دکھا دیتے کہ کیسے گردنیں کٹائی جاتیں ہیں؟ کس طرح خون بہائے جاتے ہیں؟ کس طرح سے جوانیاں لٹائی جاتی ہیں اور کیسے اللہ کی راہ میں مال و جان کی قربانیاں دی جاتی ہیں؟ وہ روزانہ تمنا کیا کرتے تھے کہ ہمیں اللہ کی راہ میں موت آئے۔ لیکن جب کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں مر

(۱) آل عمران، ۳: ۱۴۳

مٹنے کا عہد کرنے والو! اللہ کی راہ میں جان لٹانے کا اب وقت آ گیا ہے، اب موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اٹھو، اب پتا چلے گا کہ تم میں سے سچا کون ہے اور دجل وفریب کرنے والا کون ہے؟ اب پہچان کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ لیکن آزمائش اور موت کو سامنے دیکھ کر وہ ڈگمگا گئے۔

غزوۂ اُحد کی عارضی شکست کے باعث اب یہی لوگ لڑنے والوں اور بقیہ لوگوں کے ذہنوں میں پریشانی اور وسوسہ پیدا کرنے لگے کہ حضور ﷺ کی موجودگی میں کیوں شکست ہوگئی؟ بعض نادان لوگوں نے معاذ اللہ اسلام کے بارے میں اور حضور ﷺ کی نبوت کے بارے میں وسوسے پیدا کرنا شروع کر دیے۔ لیکن ایمان جس کے اندر رچ بس چکا تھا وہ یقین و استقامت کی تصویر بنے حضور نبی اکرم ﷺ کے ہر حکم اور ہر نوید پر سرِ تسلیم خم کیے ہوئے تھے۔ غزوۂ اُحد کے واقعات نے ان کے یقین کو متزلزل نہ کیا بلکہ مزید بڑھا دیا تھا۔

۸۔ غزوۂ اُحد کے رِستے زخموں کے ساتھ اگلی مہم کا حکم

لشکرِ اسلام اُحد سے واپس مدینہ پلٹا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھروں میں مرہم پٹی کر رہے ہیں، مٹی اور راکھ سے زخموں کا خون بند کر رہے ہیں، جسم زخموں سے چور چور اور نڈھال ہیں۔ اسی دوران سرورِ کائنات ﷺ نے ایک صحابی کو پیغام بھیجا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آواز دو کہ کفار کا لشکر تازہ دم ہوکر مدینہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے لیے آ رہا ہے اور فلاں جگہ تک پہنچ چکا ہے، دوبارہ مقابلے کے لیے لشکر تیار کیا جائے۔ اُحد سے آئے ابھی ایک رات نہ گزری تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جونہی آقا علیہ السلام کا پیغام سنا وہیں مرہم پٹیاں چھوڑ دیں، خون رستے رہے، زخم بہتے رہے، خون میں لت پت، تھکے اور نڈھال زخموں سے چور چور اسی حال میں تازہ دم ہوکر لبیک یا رسول اللہ کہتے ہوئے لشکر لے کر دوبارہ چل پڑے۔ قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے اُن کی اس کیفیت اور اس استقامت ووفا کے اجر کو یوں بیان فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ

اَحۡسَنُوۡا مِنۡهُمۡ وَاتَّقَوۡا اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ۝[۱]

جن لوگوں نے زخم کھا چکنے کے بعد بھی اللہ اور رسول (ﷺ) کے حکم پر لبیک کہا، اُن میں جو صاحبانِ اِحسان ہیں اور پرہیزگار ہیں، ان کے لیے بڑا اَجر ہے۝

مسلمانوں کی کیفیت یہ تھی کہ جونہی انہوں نے صدائے رسول ﷺ سنی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایسے لگتا تھا کہ جیسے زخم لگے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اسی ادا کو دیکھتے ہوئے اُحد کے میدان میں حملہ کے وقت منتشر ہونے، بھاگنے اور راہ فرار اختیار کرنے کے عمل کو معاف فرما دیا۔ فرمایا: محبوب! یہ جو عوام بھاگ گئے تھے، منتشر ہو گئے تھے آپ کو زخم آئے تھے، بعضوں کی بزدلی پر آپ کا دل دکھی ہوا تھا۔ محبوب! اگر وہاں ایسا کچھ ہوا تو یہاں بھی دیکھیے کہ یہ آپ ﷺ کے اتنے وفادار اور جانثار ہیں کہ ایک رات بھی نہیں گزری، مرہم پٹی بھی نہیں کی، ابھی خون میں لت پت ہیں، زخم تازہ ہیں اور ابھی کپڑے بھی نہیں بدلے، آپ ﷺ نے بلایا تو تلواریں اٹھا کر پھر چل پڑے۔ اس ادائے دِل برانہ پر اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا۔ محبوب! آپ بھی انہیں معاف کر دیں۔

دوسری طرف کفارِ مکہ کے مدینہ پر حملہ آور ہونے کی خبر پر منافقین کا ردِّعمل کیا تھا؟ قرآن نے اس کو بھی واضح فرمایا:

اَلَّذِيۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَـكُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ اِيۡمَانًا ۖ وَّقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَنِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ۝[۲]

(یہ) وہ لوگ (ہیں) جن سے لوگوں نے کہا کہ مخالف لوگ تمہارے مقابلے کے لیے (بڑی کثرت سے) جمع ہو چکے ہیں سو ان سے ڈرو تو (اس بات نے) ان کے ایمان کو اور بڑھا دیا اور وہ کہنے لگے: ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ کیا اچھا کارساز ہے۝

(۱) آل عمران، ۳:۱۷۲

(۲) آل عمران، ۳: ۱۷۳

یعنی منافقین کو جب خبر ملی کہ کافر دوبارہ جمع ہو گئے ہیں تو انہوں نے مسلمانوں کو کافروں کی کثرت سے ڈرانا شروع کر دیا کہ اب تو وہ مدینہ پر حملہ کر کے قبضہ کر لیں گے۔ گویا انہوں نے خوف و ہراس پھیلانا شروع کر دیا۔ ایک طرف منافقین ڈرانے کے لیے گلیوں میں آوازیں لگا رہے تھے اور دوسری طرف آقائے دو جہاں ﷺ کے پیارے مسلمانوں اور اہل مدینہ کو بلانے کے لیے گلیوں میں گھوم رہے تھے کہ چلو دوبارہ معرکہ ہے۔ جب وفا کے پیکر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آواز سنی کہ کثرت سے لوگ جمع ہو گئے ہیں تو بجائے ڈرنے کے اس بات نے ان کے ایمان کو اور بڑھا دیا۔

اللہ تعالیٰ اس طرح آزمائش سے نکال کر ایمان کو پختہ کرتا ہے، صحابہ کا ایمان بھی بڑھ گیا۔ چونکہ یقین آ گیا تھا لہٰذا کہنے لگے:

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ○[1]

ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ کیا اچھا کارساز ہے○

وہ جتنے بھی جمع ہو کر آ گئے ہیں، پرواہ نہیں ہمیں اللہ کافی ہے۔ آقائے دوجہاں ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ اس مقام پر پہنچے تو وہاں کفار موجود نہ تھے۔ تحقیق کروائی تو پتا چلا کہ کفار واپس چلے گئے تھے کیونکہ اُن کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ تازہ دم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر آ رہے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ہم نے مسلمانوں کو نڈھال کر دیا ہے، ابھی تو وہ کئی دن تک بستروں ہی پر پڑے رہیں گے۔ لہٰذا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا جائے تو کامیابی ہوگی۔

قرآن مجید میں اس منظر کو یوں بیان فرمایا گیا:

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ○ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ ۖ فَلَا

---

(۱) آل عمران، ۳: ۱۷۳

تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○[۱]

پھر وہ (مسلمان) اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ واپس پلٹے، انہیں کوئی گزند نہ پہنچی اور انہوں نے رضائے الٰہی کی پیروی کی، اور اللہ بڑے فضل والا ہے○ بے شک یہ (مخبر) شیطان ہی ہے جو (تمہیں) اپنے دوستوں سے دھمکاتا ہے، پس ان سے مت ڈرا کرو اور مجھ ہی سے ڈرا کرو اگر تم مومن ہو○

۹۔ گردشِ ایام دراصل ایک کسوٹی ہے

غزوۂ احد میں مسلمانوں کو بہت بڑی شکست اور کئی طرح کے زخموں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کیفیت میں صحابہ کرام ﷢ پریشان حال دکھائی دیے۔ قرآن مجید نے غزوۂ اُحد کے اس پورے منظر کو ایک جملے میں بیان کیا اور فرمایا:

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ط وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ج وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ط وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ○[۲]

اگر تمہیں (اب) کوئی زخم لگا ہے تو (یاد رکھو کہ) ان لوگوں کو بھی اسی طرح کا زخم لگ چکا ہے، اور یہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں، اور یہ (گردشِ ایّام) اس لیے ہے کہ اللہ اہلِ ایمان کی پہچان کرا دے اور تم میں سے بعض کو شہادت کا رتبہ عطا کرے، اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا○

یہ اشارہ غزوۂ بدر کی طرف ہے کہ یاد کرو کہ ایک سال پہلے غزوۂ بدر میں انہیں بھی زخم لگا تھا، انہیں بھی شکست فاش ہوئی تھی اس مرتبہ تمہیں زخم لگ گیا تو کیا ہوا۔ اس کے بعد یہ ایک جملہ فرمایا:

---

(۱) آل عمران، ۳: ۱۷۴-۱۷۵

(۲) آل عمران، ۳:۱۴۰

وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ.[1]

اور یہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں۔

یعنی حالات کی دھوپ چھاؤں آتی اور جاتی رہتی ہے، کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر۔ ملکِ پاکستان کے حالات کے تناظر میں دیکھیں تو جو آج حکمران ہیں کبھی وہ جیل میں بھی قید تھے۔ جو آج غرور میں بدمست ہیں کبھی وہ کسی کے قدموں پر بھی گرے تھے اور معافی نامہ لکھ کر ملک سے فرار بھی ہو گئے تھے۔ اگر یہ پہلے ہو چکا ہے تو اب بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حکمران اپنے ظلم وستم اور آمریت کے سبب قیدی بن کر پھر کسی کے پاؤں میں پڑ سکتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے فرمایا: ہم لوگوں کے درمیان ان دنوں کو گھماتے رہتے ہیں۔ یعنی آسودگی کے علاوہ ہم نے کچھ دن مصیبتوں، آزمائشوں اور پریشانیوں کے متعین کر رکھے ہیں، جو انسان کے علم میں نہیں ہیں۔ یاد رہے کہ وہ ایام پردۂ غیب میں نہاں ہیں اور مشیتِ الٰہی ہیں۔ وہ کبھی انفرادی زندگی کی پریشانیاں ہیں، مثلاً کسی ایک گھر میں پے در پے اموات کا رُونما ہونا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے تجارت کے مال میں خسارے کی شکل میں پریشانی کا آنا، کبھی پے در پے بیماریوں کی شکل میں مصیبت آنا، کبھی اجتماعی طور پر کوئی پریشانی آجاتی ہے، مثلاً کبھی حق و باطل کے معرکہ میں اہل حق پریشان ہو جاتے ہیں، کبھی وہ لوٹ لیے جاتے ہیں، کبھی شہید کر دیے جاتے ہیں اور اس طرح انہیں خسارہ ہو جاتا ہے۔ بظاہر نتائج اہل حق کے خلاف نکلتے ہیں اور ان کی حسبِ منشا صورتِ حال پیدا نہیں ہوتی۔ وقتی طور پر اَہلِ حق کو اذیت، پریشانی اور ندامت ہوتی ہے۔ اس طرح انہیں دکھ اور حالات پر رونا آتا ہے۔

اللہ رب العزت فرماتا ہے کہ ہم نے اپنے نظام قدرت میں یہ دن مقرر کر رکھے ہیں اور یہ پردہ غیب میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہ مقررہ مدت ہم کسی کو دکھاتے نہیں ہیں۔ اِن حقائق کے پیچھے ہماری کچھ حکمتیں، مصلحتیں اور تدبیریں ہوتی ہیں۔ ہم ان آزمائش پر مبنی دنوں کو لوگوں میں گھماتے رہتے ہیں۔ جیسے لیلۃ القدر رمضان شریف کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں گھومتی

(۱) آل عمران، ۳:۱۴۰

رہتی ہے۔ یہ کبھی اکیسویں کی رات میں آتی ہے، کبھی پچیسویں شب میں ہوتی ہے، کسی سال تیئیسویں شب میں آمد ہوتی ہے، کسی سال ۲۷ ویں کی رات آتی ہے اور کسی سال ۲۹ ویں شب میں آجاتی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ خالقِ کائنات اس رات کو مختلف راتوں میں کیوں گھماتا ہے؟ اس لیے کہ اگر پتا چل جائے کہ یہی لیلۃ القدر ہے تو لوگ صرف اسی ایک رات کو شب بیداری کا اہتمام کریں گے اور باقی راتوں کو غفلت کی چادر تان کر گھوڑے بیچ کر سوتے رہیں گے۔ قدرت نے لیلۃ القدر کو اس لیے پردۂ غیب میں رکھا اور مختلف راتوں میں گھمایا تاکہ ہماری زندگی سے غفلت دور ہو جائے اور ہم رمضان کے آخری عشرے کی ساری طاق راتوں میں اس لیے جاگتے رہیں کہ شاید اس رات میں یہ مبارک گھڑی نصیب ہو جائے۔

اسی طرح یہ مصیبتوں، پریشانیوں اور تکلیفوں کے دن اگر ہمیں بتا دیے جائیں تو ہم ان دنوں میں سفر بھی نہ کریں اور کوئی ایسا کام بھی نہ کریں جس میں کسی نقصان، تکلیف یا گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس دوران تاجر ایسا سودا ہی نہ کریں جس میں خسارے کا خدشہ ہو اور کوئی اس دِن جنگ ہی نہ لڑے جس دن شکست کا اندیشہ ہو۔

ستاروں کی حرکت سے اپنے مقدر کا فیصلہ کرنے والے لوگ یہی تو کرتے ہیں۔ ان کا اعتقاد اللہ رب العزت اور اس کے نظام پر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے نجومیوں سے پوچھتے ہیں کہ میں نے فلاں کام کرنا ہے، بتائیں کہ ستارہ گردش میں تو نہیں ہے۔ اس دن اگر پتہ چل جائے کہ اس مہینے میں ستارہ نحس ہے تو اُس عرصے کے دوران وہ کاروبار بھی نہیں کرتے۔

اگر کسی کو موت کا پیشگی پتہ چل جائے کہ کل اتنے وقت پر عزرائیل علیہ السلام اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تشریف لائیں گے تو پھر بھلا اس بندے کی کیفیت کیا ہوگی؟ وہ کھانا پینا ترک دے گا اور دکان و دفتر چھوڑ دے گا۔ گویا اگر کوئی اس کیفیت میں مبتلا ہو جائے تو کاروبارِ دنیا معطل ہو جائے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ کچھ چیزیں پردہ غیب میں نہ رکھے اور وہ سب پر آشکار کر دے تو نظامِ حیات ہی ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک شخص کو ملک الموت نے گھور کر

دیکھا تو اس کے جانے کے بعد اس شخص نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے عرض کیا کہ یہ کون ہے؟ انہوں نے فرمایا: یہ ملک الموت ہے۔ اس نے عرض کیا کہ وہ مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا شاید میری روح قبض کرنا چاہتا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ اس نے عرض کیا کہ حضور! ہواؤں کو حکم دیں کہ مجھے سمندر سے پار ہزار ہا میل دور کسی ہندوستانی جزیرے میں پھینک دیں۔ اس پر آپ مسکرا دیے اور ہواؤں کو اسے دور کسی گم نام ہندوستانی جزیرے میں پہنچانے کا حکم دے دیا۔ ہواؤں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور اسے ہزاروں میل دور جزیرے میں جا کر پھینک دیا۔ وہ جیسے ہی وہاں پہنچا تو ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی۔

اگلے دن حضرت سلیمان علیہ السلام نے عزرائیل علیہ السلام سے سارا احوال پوچھا۔ وہ عرض کرنے لگے: حضور! میں اسے اس لیے گھور کر دیکھا تھا کہ میں نے فلاں جزیرے پر اُس کی روح قبض کرنی تھی۔ میں اس پر حیران تھا کہ وہ یہاں پھر رہا ہے، کل ہزاروں میل مسافت کا سفر طے کر کے وہاں کیسے پہنچے گا جہاں مجھے اس کی جان قبض کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ میں حیران تھا کہ یہ کیسا اَمر اِلٰہی ہے؟ پھر میں جب دن کے آخری حصے میں مذکورہ جزیرے پر پہنچا تو وہ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہاں میں نے اس کی روح قبض کر لی۔[1]

اِس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ اگر بندے کو آئندہ کل ہونے والی بات کا پتہ چل جائے تو کاروبارِ زندگی معطل ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ ظاہری شان وشوکت حق اور سچ کی علامت نہیں

کبھی یہ نہ سمجھا جائے کہ کسی ایک معرکے میں ہار اور جیت، فتح و شکست حق اور باطل ہونے کی علامت ہوتی ہے۔ اللہ رب العزت نے اس ظاہری فتح و شکست کو واضح کرنے کے لیے ہی یہ خوب صورت اسلوب اختیار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

(۱) ۱۔ أبو نعيم، حلية الأولياء، ۴: ۱۱۸
۲۔ أبو الليث سمرقندی، تفسير بحر العلوم، ۳: ۲۹
۳۔ بیضاوی، أنوار التنزيل وأسرار التأويل، ۴: ۳۵۳

وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ.[1]

اور یہ دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ باطل کا وقتی طور پر فتح یاب ہوجانا اُس کے حق ہونے اور اَہلِ حق کا ظاہری شکست سے دو چار ہونا باطل ہونے کی علامت نہیں ہے۔ صحت مند ہونا نیکی کی علامت نہیں اور بیماری کا شکار یا کمزور ہونا گناہ گار ہونے کی نشانی نہیں ہے۔ بہت اچھا کھانا پینا ولی ہونے کی علامت نہیں اور فاقہ کشی کا مسلسل طاری رہنا فاسق و فاجر ہونے کی نشانی نہیں۔ ہر وقت آرام و راحت سے رہنا اور کبھی سر میں درد بھی نہ ہونا اللہ کے محبوب ہونے کی علامت نہیں ہے اور ساری زندگی بیماری، پریشانی، خسارے اور اموات کے صدموں میں گزار دینا اللہ کی بارگاہ میں ناپسندیدہ ہونے کی نشانی نہیں ہے۔ اگر اللہ کی بارگاہ میں ظاہری فتح و شکست، ظاہری شان و شوکت اور ظاہری تکلیف و مصیبت قبولیت اور عدم قبولیت کا پیمانہ ہوتی تو یزید سے بڑا ولی کوئی نہ ہوتا۔ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اور خانوادۂ اَہلِ بیت علیہم السلام سے برگزیدہ نفوس انبیاء کے سوا انسانوں میں کبھی پیدا نہیں ہوئے اور نہ ہی ہو سکتے ہیں۔ وہ مقدس اجسام ناپاک یزیدی گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے روندے جاتے نہ ان کے خیمے جلائے جاتے۔ غور کیجیے! اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام کے مقدس سرتن مبارکہ سے جدا کر کے کوفہ سے دمشق تک کے بازاروں میں پھرائے جا رہے ہیں۔ یزید بدبخت تخت پر فرعون بن کر بیٹھا ہوا اپنی چھڑی حضرت سیدنا امام حسین علیہ السلام کے مقدس لبوں پر مار رہا ہے۔ یہ تکبر، شان و شوکت، جاہ و حشمت، تمکنت اور ظاہری مال و دولت اگر حق و سچ ہونے کی علامت ہوتی تو پھر ایمان کا سارا نظام بدل کر کفر میں تبدیل ہو چکا ہوتا۔

وہ انبیاء علیہم السلام جو کفار کی تلواروں سے شہید کر دیے گئے، آروں سے چیر دیے گئے اور مصلوب کیے گئے، وہ اللہ کے محبوب تھے۔ وہ قارون جن کے خزانوں کی چابیاں ستر ستر اونٹوں پر لادی جاتی تھیں، وہ بدبخت کافر، سرکش اور اللہ کے نافرمان لوگ تھے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا کہ یہ نظامِ قدرت ہے کہ کبھی ایک طرف پریشانیاں، مصیبتیں اور دوسری طرف ظاہری

(۱) آل عمران، ۳:۱۴۰

شان و شوکت، آرام و آسائش، جاہ و منصب اور ظاہری حکومت و سلطنت ہے لیکن یہ کبھی حق و باطل اور سچ و جھوٹ کا معیار نہیں رہے۔

یہ گردشِ ایام ہیں اور ہم انہیں لوگوں کے درمیان گھماتے رہتے ہیں۔ گھومتے گھومتے یہ کبھی کافروں کی طرف ہو جاتے ہیں اور کبھی مومنوں کے حصے میں آ جاتے ہیں۔ یہ کبھی اولیاء کو درپیش ہوتے ہیں تو کبھی فاسقین اور فاجرین کے حصے میں آتے ہیں۔ فرمانِ ربانی یہ ہے کہ یہ تو ہمارا نظام ہے جس کو ہم در پردہ چلاتے ہیں اور کسی کے سامنے آشکار نہیں فرماتے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ! یہ گردشِ ایام تو نے کیوں رکھی ہے؟ ایسا کیوں نہیں کرتا کہ اہلِ حق کی قربانیوں اور محنتوں کو دیکھتے ہوئے انہیں فتح یاب کر دے اور حق کی منزل تک پہنچا کر اس جدوجہد کو اس کے منطقی انجام سے ہمکنار کر دے۔ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں کہ نہیں! ایسا نہیں ہوتا بلکہ اس گردش ایام کو جاری رکھنے کی کئی حکمتیں ہیں:

(۱) اَہلِ ایمان کی پہچان

گردشِ ایام کی پہلی حکمت اسی آیتِ مبارکہ میں بیان فرمائی:

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا.(۱)

اور یہ (گردشِ ایّام) اس لیے ہے کہ اللہ اہلِ ایمان کی پہچان کرا دے۔

یعنی ہم ایسا اس لیے کرتے ہیں تاکہ پتہ چل جائے کہ پختہ ایمان والے کون ہیں؟ معلوم ہو جائے کہ کون ہیں جو اللہ کی راہ میں ثابت قدم رہ کر اپنا گھر بار چھوڑ جانے والے ہیں اور کون حالات کے بگڑے تیور دیکھتے ہوئے دبک کر بیٹھ جانے والے ہیں۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ہجرتِ مکہ کے موقع پر زوجہ محترمہ کو چھوڑ دیا، صاحبزادیاں چھوڑ دیں، بیٹے چھوڑ دیے، کاروبار چھوڑ دیے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حضور ﷺ کے ہمراہ ہو لیے۔ قربان جائیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمتوں پر، یقیناً آپ ہی عظمت کی رفعتوں کے حق دار تھے کہ تاجدارِ کائنات ﷺ نے

(۱) آل عمران، ۳:۱۴۰

دروازے پر دستک دی اور فرمایا کہ اے صدیق! اللہ کی جانب سے حکم آیا ہے کہ وطن چھوڑ کر مدینہ چلے جاؤ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں تو اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا تو سب کچھ آپ کے قدموں پر نچھاور ہے۔ اس سعادت میں وہ زار و قطار رونے لگے۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ خوشی میں بھی رونا آتا ہے۔(۱)

بلاتشبیہ و بلا مثال اسی طرح چشمِ فلک نے دیکھا کہ تحریک منہاج القرآن کے کارکنان ریاستی جبر کے مقابلے میں یقین و استقامت کی تصویر بنے رہے۔ مائیں، بہنیں اور بیٹیاں لڑتی رہیں، کٹتی رہیں، ان عفت مآب دخترانِ اسلام کو ظالم خونخوار بھیڑیے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے رہے، ان پر جبر ہوتا رہا، لاٹھیاں چلتی رہیں، گولیاں برستی رہیں، شہید بھی ہوئے، زخمی بھی ہوئے، قیدی بھی ہوئے۔ ظالم نے ظلم کا ہر حربہ دل کھول کر آزمایا مگر، نہ مائیں، بہنیں اور بیٹیاں گھبرائیں اور نہ ہی بزرگ، جوان اور بیٹے لڑکھڑائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ایسے حالات میں اَہلِ حق استقامت کا پہاڑ بن کر کھڑے رہتے ہیں تو میں دنیا والوں کو دکھاتا اور ان کی پہچان کرواتا ہوں کہ دیکھ لو! یہ اہلِ حق ہیں اور ان کو مومنین کہتے ہیں۔

(۲) مرتبہ شہادت سے سرفراز فرمانا

گردشِ ایام کو جاری رکھنے کی دوسری حکمت بھی اللہ رب العزت نے اسی آیت مبارکہ کے ذریعے واضح فرمائی:

وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَآءَ.(۲)

(۱) ۱۔ ابن هشام، السيرة النبوية، ۳: ۱۱
۲۔ ابن كثير، البداية والنهاية، ۳: ۱۷۸
(۲) آل عمران، ۳: ۱۴۰

اور تم میں سے بعض کو شہادت کا رتبہ عطا کرے۔

یعنی کئی ایک اہلِ حق کو میں نے شہادت کے درجے پر پہنچانا ہوتا ہے، اگر ایسے واقعات و لمحات نہ آئیں تو وہ شہید کیسے بنیں اور شہادت کے مرتبے تک کیسے پہنچیں جہاں ان لوگوں کے لیے قیامت کے دن عرش کے دائیں بائیں اور جنت میں کرسیاں لگی ہوں گی جن پر لکھا ہو گا کہ یہ شہداء کی جگہ ہے۔ لازمی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ظالموں کو تو شہید نہیں بنانا ہوتا۔ شہید تو اس نے ایمان والوں، اپنے محبوبوں اور وفاداروں کو بنانا ہوتا ہے۔ شہادت کا مرتبہ یزید کے لیے تو نہیں تھا بلکہ شہادت کا یہ منصب تو امامِ عالی مقام حضرت امام حسین علیہ السلام ہی کو دینا مقصود تھا۔ شہادت ابنِ زیاد کو تو نہیں دینی تھی بلکہ شہادت کے مرتبے سے تو علی اکبر علیہ السلام اور علی اصغر علیہ السلام ہی کو سرفراز ہونا تھا۔

یہاں ضمناً اس بات کا بھی ذکر کرتا چلوں کہ غالبًا اَسی کی دہائی (eighties) کی بات ہے کہ پاکستان کے بڑے نامور عالم دین جو کہ اب وفات پا چکے ہیں، نے بیان (statement) دیا کہ ہم اللہ کی راہ میں جان دینے والے کو جس معنیٰ میں شہید کہتے ہیں، قرآن مجید میں شہید کا یہ معنیٰ اس طرح سے نہیں آیا۔ یہ صرف حدیثِ مبارکہ سے ثابت ہے۔ میں نے اس وقت انہیں اسی آیت مبارکہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ آپ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۴۰ پڑھیے۔ شہید کو شہید کا یہ خطاب (title) اللہ تعالیٰ نے پہلے قرآن میں دیا ہے، پھر آقا علیہ السلام نے اسے بیان کیا ہے۔

(۳) مومنین کو مزید نکھارنا مقصود ہے

گردشِ ایام اور اَہلِ حق کو مصائب، آزمائشوں اور امتحانات سے گزرنے کی تیسری حکمت اللہ تعالیٰ نے اس سے اگلی آیت میں ارشاد فرمائی:

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ○ (۱)

---

(۱) آل عمران، ۳: ۱۴۱

اور یہ اس لیے (بھی) ہے کہ اللہ ایمان والوں کو (مزید) نکھار دے (یعنی پاک و صاف کر دے) اور کافروں کو مٹا دے○

یعنی گردشِ ایام اور امتحانات مشکلات کی بھٹی ہیں۔ اس میں پگھلا کر کھرے اور کھوٹے کو جانچتا ہوں۔ جس طرح زرگر اصلیت جاننے کے لیے لوہے کو نہیں بلکہ اپنی بھٹی میں صرف سونے ہی کو ڈالتا ہے۔ اسی طرح حالات کی دہکتی بھٹی میں غداروں اور بے وفاؤں کو نہیں وفاداروں کو پگھلایا جاتا ہے۔ گویا گردشِ ایام لا کر لوگوں پر واضح کرنا مقصود ہے کہ اس سے وفادار کو نمایاں کروں اور ان حالات کے ذریعے وفاداروں کی وفاداری اور مومنوں کے ایمان کو مزید نکھار دوں۔

تحریک کے کارکنان کو ریاستی جبر کے نتیجہ میں جب تک گولیاں نہیں لگی تھیں، آزمائشیں نہیں آئی تھیں تو سب وفادار تھے۔ جب صرف اعتکاف، میلاد، عشق و محبتِ رسول ﷺ کی باتیں، گوشۂ درود، عبادت اور تقویٰ تھا، اس وقت تک تو سب وفادار تھے۔ اللہ نے چاہا کہ اب ذرا گولیوں سے گزار کر، جانوں کے نذرانے دے کر، زخم دے کر، بھوک، پیاس اور مقدمات کی بھٹیوں میں پگھلا کر دیکھتا ہوں کہ ان کی وفاداری نکھری ہے یا نہیں؟

(۴) ثوابی کون اور انقلابی کون؟

گردشِ ایام دکھانے اور امتحانات و مصائب کی بھٹی سے گزارنے کی چوتھی حکمت و مقصد اگلی آیت میں بیان فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ.[1]

کیا تم یہ گمان کیے ہوئے ہو کہ تم (یونہی) جنت میں چلے جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو پرکھا ہی نہیں ہے۔

یعنی کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم بغیر آزمائش کے جنت میں داخل کر دیے جاؤ گے؟

(۱) آل عمران، ۳:۱۴۲

ابھی تو تمہارے ساتھ ہوا ہی کچھ نہیں اور تم سمجھتے ہو کہ یونہی سیدھے جنت میں چلے جاؤ گے اور یونہی تمہیں میری رضا اور میری بارگاہ سے اجر نصیب ہو جائے۔ ہرگز نہیں! ایسا نہیں ہوتا بلکہ میرا قانون یہ ہے کہ میں پرکھ کر، آزمائش دے کر اپنا بنانے کا فیصلہ کرتا ہوں۔ ابھی تو ہم پرکھنا چاہتے ہیں کہ جہاد کرنے والے اور باطل سے ٹکر لینے والے استقامت کے کس درجے پر فائز ہیں؟ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم کہاں تک چلتے ہو اور کس مقام پر جا کر تمہارا ضبط کا بندھن ٹوٹتا ہے۔ اگر دیسی گھی سے بنی چُوری کھانے کو ملے تو سب واہ واہ کہتے ہیں اور ذرا ترش و خشک چیز کھانے کو ملے تو اس مقام پر صبر اور شکر کرنے والا کون ہے؟

قابلِ غور بات ہے کہ تسبیح و اذکار کرنا قدرے آسان کام ہے۔ تہجد کے نوافل پڑھ لینا بھی زیادہ مشکل نہیں ہے۔ صدقہ و خیرات کر لینا بھی قدرے آسان ہے، مگر سیرتِ مصطفیٰ ﷺ پر چل کر خود کو مومن ثابت کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ہم پختہ ایمان والوں کی آزمائش کرتے ہیں۔ اگر ایک شخص کو اچھا کھانے کو ملے تو کیا یہ آزمائش اور پرکھ ہوگی؟ ہر وقت عزت افزائی اور صحت و تن درستی ملے تو کیا یہ پرکھ اور آزمائش ہے؟ یاد رکھیں کہ ایک شخص کی آزمائش تو اس وقت ہوگی جب اس کا سب کچھ چھن جائے۔ امتحان اس وقت ہوگا جب اللہ کی راہ میں جسم کا کوئی عضو ضائع ہو جائے۔ جب جان جاتی رہے، جب عزت چلی جائے، جب دشمن چاروں طرف سے حملہ آور ہو کر غالب ہو جائے اور جب ساری دنیا سے طعنے ملیں تو اس وقت پتا چلے گا کہ یار سے سچی یاری لگائی تھی یا محض دل لگی تھی۔ اگر دیکھنا مقصود ہے کہ کیسی یاری ہے تو عشق کی گہرائی کا اندازہ آزمائش کے بغیر نہیں ہوا کرتا۔ چُوری کھانے والے کبھی مجنوں نہیں بنا کرتے۔ خون دے کر ہی کوئی عاشقِ صادق کے مقام تک پہنچتا ہے۔

اگر بغیر آزمائے یہ درجے عطا کرنا ہوتے تو یہ مقام و مراتب امام حسین علیہ السلام کو سونپ دیے جاتے، علی اکبر علیہ السلام کو نواز دیے جاتے۔ خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیے جاتے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو دے دیے جاتے۔ اندازہ کرو کہ پورے شہر مدینہ میں چالیس دن تک باغیوں کا قبضہ رہا اور اس دوران تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر پانی بند رہا، حتیٰ کہ وہ ناحق شہید کر دیے گئے۔ آزمائے بغیر اگر یہ درجے عطا کرنے ہوتے تو تم بھلا اللہ رب

العزت کی نظر میں عمر ﷜، عثمان ﷜ اور علی ﷜ سے زیادہ پیارے ہو؟ کیا تم امام حسن مجتبیٰ ﷣ سے زیادہ پیارے ہو جنہیں ایسی زہر دی گئی، جس سے ان کے جگرِ اقدس کے ستر (۷۰) ٹکڑے ہوگئے۔ یہ تو حضور ﷺ کے وہ نواسے ہیں، جنہیں پہلی خوراک ہی حضور ﷺ کے مبارک لعابِ دہن کی نصیب ہوئی، گردنِ مقدسہ اور مبارک کندھے سواری کے لیے نصیب ہوئے اور جنہوں نے تاریخ میں 'راکبِ دوشِ رسول' کا عظیم اعزاز پایا۔

ایسے حالات و واقعات سے گزارنے سے مقصود یہ ہے کہ پتہ چلے کہ ان میں راہِ حق میں ڈٹ جانے والا مجاہد کون ہے اور بھاگ جانے والا کون ہے؟ جو کہتا ہے کہ ہم سامراجی نظام کے خلاف جہاد اور انقلاب کے لیے نہیں بلکہ صرف ثواب کے لیے آتے تھے، اللہ انہیں ضرور ثواب دے گا۔ اس لیے کہ جو جس نیت سے آتا ہے اللہ تعالیٰ اسے وہ عطا کرتا ہے، اللہ کسی بھی عمل کا ثواب ضائع نہیں فرماتا۔ آقا ﷺ پر درود و سلام پڑھنے کی مثال دے کر اس مسئلہ کو سمجھاتا ہوں۔ حضرت انس بن مالک ﷜ روایت بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ صَلَاةً وَاحِدَةً، صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ عَشْرَ صَلَوَاتٍ، وَحُطَّتْ عَنْهُ عَشْرُ خَطِيْئَاتٍ، وَرُفِعَتْ لَهُ عَشْرُ دَرَجَاتٍ. (۱)

جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے، اس کے دس گناہ معاف کیے جاتے ہیں اور اس کے لیے دس درجات بلند کیے جاتے ہیں۔

---

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۱۰۲، رقم: ۱۲۰۱۷

۲۔ نسائي، السنن، کتاب السهو، باب الفضل في الصلاة على النبي ﷺ، ۳: ۵۰، رقم: ۱۲۹۷

۳۔ بخاري، الأدب المفرد: ۲۲۴، رقم: ۶۴۳

۴۔ حاکم، المستدرك، ۱: ۷۳۵، رقم: ۲۰۱۸

۵۔ ابن أبي شيبة، المصنف، ۲: ۲۵۳، رقم: ۸۷۰۳

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ حضور نبی اکرم ﷺ پر درود پڑھو تو ثواب ملتا ہے اور اگر ہادیِ برحق ﷺ پر سلام پڑھو تو جواب ملتا ہے۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَا مِنْ أَحَدٍ يُسَلِّمُ عَلَيَّ إِلَّا رَدَّ اللهُ عَلَيَّ رُوحِي حَتّٰى أَرُدَّ عَلَيْهِ السَّـلَامَ.[1]

(میری اُمت میں سے کوئی شخص) ایسا نہیں جو مجھ پر سلام بھیجے مگر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر میری روح واپس لوٹا دی ہوئی ہے یہاں تک کہ میں ہر سلام کرنے والے (کو اُس) کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

یعنی مشرق سے مغرب تک میرا کوئی امتی ایسا نہیں جو مجھ پر سلام پڑھے اور میں اس سلام کا جواب نہ دوں۔ جو بھی امتی مجھ پر سلام پڑھتا ہے، قریب ہو یا بعید، مشرق سے پڑھے یا مغرب میں، میں اسے جواب دیتا ہوں۔

میں نے تو پہلے دن سے آج تک یہ ترغیب دی ہے کہ ثواب تو ملنا ہی ملنا ہے، وہ تو کہیں جانے والا نہیں ہے، یہ تو اللہ رب العزت کا وعدہ ہے۔ لہٰذا تم اس ثواب کے لالچ میں کیوں پڑھتے ہو؟ آقاے دوجہاں ﷺ پر درود و سلام پڑھتے وقت ہماری تمنا یہ ہونی چاہیے کہ امام الانبیاء ﷺ کے گلِ اقدس کی پتیوں والے لب ہلیں اور وہ ہمیں جواب عنایت فرمائیں۔ ہم کہیں: یا رسول اللہ! آپ پر سلام ہو۔ آقا ﷺ ارشاد فرمائیں: میرے غلام تجھ پر بھی سلام ہو۔

اسی مثال سے سمجھ لیں کہ جو ثواب کے لیے آتا ہے تو خالقِ کائنات اسے ثواب ضرور عطا فرماتا ہے لیکن وہ ثواب کے طلب گاروں کو نہیں پرکھتا بلکہ وہ پرکھتا ان کو ہے جو انقلاب کے طلب گار ہیں۔ جب حصولِ ثواب اور حصولِ انقلاب الگ الگ دو مقاصد ہیں تو لازمی بات

---

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۵۲۷، رقم: ۱۰۸۶۷

۲۔ أبوداود، السنن، كتاب المناسك، باب زيارة القبور، ۲: ۲۱۸، رقم: ۲۰۴۱

۳۔ طبرانى، المعجم الأوسط، ۳: ۲۶۲، رقم: ۳۰۹۲، ۹۳۲۹

ہے کہ اللہ کے ہاں بھی ثواب والوں اور انقلاب والوں کے درمیان کچھ فرق تو ضرور ہوگا۔

وہ انقلابی، جو حق کے راستے میں مر مٹنے، جان دے کر غریبوں کو سر بلند کرنے اور ظلم اور ظالموں دونوں کو مٹانے کے طلب گار ہیں، وہ آقا ﷺ سمیت ہر نبی کی جد و جہد اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی قربانیوں والی طرزِ زندگی کے طلب گار ہیں، اللہ رب العزت ان کو پرکھتا ہے، کیونکہ ان کے لیے بڑا اونچا درجہ ہے۔ صرف ثواب والا اس درجے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جب کسی کو بلند درجہ دینا مقصود ہو تو لازم ہے کہ اسے کڑے پیمانے پر پرکھا جائے۔ لہٰذا فرمایا: جنت میں یونہی نہیں جاؤ گے جب تک اللہ تعالیٰ پرکھ نہ لے۔ وہ پرکھتا ہے کہ ان میں مجاہد، باطل سے لڑنے والا اور حق کی خاطر باطل سے ٹکرا جانے والا کون ہے؟

(۵) اِستقامت کے اِمتحان میں سرخرو کون؟

گردشِ ایام اور آزمائشیں دینے کی پانچویں حکمت اور مقصد بھی اس آیت کریمہ کے دوسرے حصہ میں واضح فرمایا:

وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ○ (۱)

اور نہ ہی صبر کرنے والوں کو جانچا ہے○

جب جہاد کا مرحلہ گزر جاتا ہے تو پھر مشکلات کے نئے مرحلے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دوران میں مقدمات چلتے ہیں، فقر و فاقہ چلتا ہے، زخم رستے ہیں اور دکھوں کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت دیکھتا ہے کہ جہاد کے وقت میں جہاد کرنے والا کون ہے اور راہِ فرار اختیار کرنے والا کون ہے؟ جہاد کا مرحلہ گزر جائے تو بعد میں مصائب و آلام کے دور میں صبر کرنے والا کون ہے اور شکوہ کناں کون ہوتا ہے؟ جو شک میں پڑ گیا اور جس کے لبوں پر شکوہ اور دل و دماغ میں شک آ گیا، سمجھ لو وہ اس پرکھ میں ناکام ہوگیا۔ جو ہر حال میں صابر رہا، استقامت اور یقین پر قائم رہا اور جسے شک متزلزل نہ کر سکا، سمجھ لو وہ اس پرکھ میں کامیاب ہوگیا۔

(۱) آل عمران، ۳: ۱۴۲

اگلی آیت میں ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ص فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ○ (۱)

اورتم تو اس کا سامنا کرنے سے پہلے (شہادت کی) موت کی تمنا کیا کرتے تھے، سو اب تم نے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا ہے○

جب تک تمہارا سامنا شہادت سے نہیں ہوا تھا، جب تک تم نے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا نہیں تھا، اس وقت تک تو ساری عمر شہادت کی موت کی تمنا کیا کرتے تھے۔ فرمایا جس کی تم تمنا کرتے تھے، اسے تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ جو اس میں ڈگمگا گیا وہ خسارے میں رہا اور جو ثابت قدم رہا اور بعد ازاں ہمیشہ ہمیشہ صابر رہا، وہ بازی جیت گیا۔

۱۱۔ اِستقامت کا صلہ: دیدارِ اِلٰہی

اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مومنین کو استقامت کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ اللہ پر ایمان و یقین رکھنے والے، حق کی جد و جہد کرنے والے، مصائب و آلام کو برداشت کرنے والے اور اللہ کے لیے اپنی جان و مال کا سودا کر لینے والے اہلِ ایمان کے لیے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ احادیث مبارکہ میں اِس جنت کی بھی منظر کشی کی گئی ہے جس کے بارے قرآن فرما رہا ہے کہ کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے؟ کیا تمہیں پتہ ہے کہ وہ جنت کیسی جگہ ہے؟ کیا تم جنت کو معمولی چیز سمجھتے ہو؟

جو لوگ جنت میں جائیں گے، ان میں بھی درجات ہوں گے۔ ان میں ایسے بھی ہوں گے جنہیں ہر جمعہ کے دن اللہ کا دیدار ہوگا۔ اُس دن کو 'یوم مزید' کہا گیا ہے۔ جنتی افراد کی مجلس لگے گی۔ جنتی اصحاب اکٹھے ہو کر دائروں میں بیٹھیں گے۔ اللہ رب العزت اپنی شان و قدرت کے لائق عرش پر اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوں گے۔ حکم ہو گا کہ سارے پردے اٹھا دو۔

(۱) آل عمران، ۳:۱۴۳

سب پردے اٹھا دیے جائیں گے، بس اُس کی کبریائی کا ایک ہلکا سا پردہ رہ جائے گا تا کہ جنتی اُس کے آر پار مولیٰ کے حسن کا جلوہ کرسکیں۔

بخاری ومسلم کی متفق علیہ حدیث ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جنتی بیٹھے ہوں گے کہ اچانک اوپر سے اُنہیں 'السلام علیکم' کی آواز آئے گی۔ جنتی لوگ یہ آواز سن کر حیران ہو جائیں گے۔ وہ اوپر دیکھیں گے کہ ہمیں کس نے سلام کیا ہے؟ اوپر اللہ رب العزت کا حسن جلوہ گر ہوگا۔ اللہ رب العزت خود ارشاد فرمائے گا کہ میں تمہارا رب ہوں۔ قرآن مجید نے اسے یوں بیان فرمایا ہے:

سَلٰمٌ قف قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍO[1]

(تم پر) سلام ہو، (یہ) ربِّ رحیم کی طرف سے فرمایا جائے گاO

اللہ تعالیٰ جنتیوں سے اُن کی طلب وتمنا کے بارے سوال کرے گا کہ مانگو کیا مانگتے ہو جو میں تمہیں عطا کروں؟ جنتی عرض کریں گے مولیٰ! تو نے ہمیں بخش دیا اور دوزخ سے نجات دے کر جنت عطا کی، اس سے بڑھ کر تیرا لطف وکرم اور کیا ہوگا؟ ہم تو تیرے کرم اور عنایتوں کے سمندروں میں ہمہ وقت غوطہ زن ہیں، ہمیں تیری جناب سے بھلا اور کیا چاہیے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نہیں، میں تمہیں مزید بھی دینا چاہتا ہوں، مانگو کیا مانگتے ہو؟ جنتیوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا کہ اب اور مزید کیا ملے گا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: فرشتو! ان کے اور میرے درمیان سے پردوں کو اٹھا دو تا کہ یہ بلا حجاب میرا دیدار کرسکیں۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے منقول حضور نبی اکرم ﷺ کے الفاظ یہ ہیں:

إِذَا دَخَلَ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ، قَالَ: يَقُوْلُ اللهُ عزوجل: تُرِيْدُوْنَ شَيْئًا أَزِيْدُكُمْ؟ فَيَقُوْلُوْنَ: أَلَمْ تُبَيِّضْ وُجُوْهَنَا؟ أَلَمْ تُدْخِلْنَا الْجَنَّةَ وَتُنَجِّنَا مِنَ النَّارِ؟ قَالَ: فَيَكْشِفُ الْحِجَابَ فَمَا أُعْطُوْا شَيْئًا أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ إِلٰى رَبِّهِمْ. ثُمَّ

(۱) یس، ۳۶: ۵۸

تَلاَ هٰذِهِ الْآيَةَ: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾[1] [2].

جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے (تو) اللہ ﷻ فرمائے گا: تم کچھ اور چاہتے ہو جو میں تمہیں عطا کروں؟ وہ عرض کریں گے: (اے ہمارے رب!) کیا تو نے ہمارے چہرے منور نہیں کر دیے؟ کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کر دیا اور ہمیں دوزخ سے نجات نہیں دے دی؟ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کے بعد اللہ تعالیٰ پردہ اٹھا دے گا، تب انہیں (معلوم ہوگا کہ) اپنے پروردگار کے دیدار سے بہتر کوئی چیز نہیں ملی۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ 'ایسے لوگوں کے لیے جو نیک کام کرتے ہیں نیک جزا ہے (بلکہ) اس پر اضافہ بھی ہے'۔

اللہ کا حسن بے نقاب ہوگا۔ جنتی اللہ کو اور اللہ جنتیوں کو دیکھے گا۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ وہ منظر کیسا ہو گا؟ کئی افراد کو تو جنت میں اس طرح کبھی کبھی مولیٰ کا دیدار نصیب ہو گا۔ کچھ جنتی ایسے بھی ہوں گے کہ ہر جمعہ کو ایک مجلسِ دیدار منعقد ہو گی، جہاں سب کو دیدارِ الٰہی ہو گا۔ اس مجلس میں جنت کے لحاظ سے بیٹھنے کے لیے صوفے اور کرسیاں بھی ہوں گی۔ یعنی مختلف درجات کے مطابق الگ الگ نشستیں ہوں گی۔ جن پر سارے جنتی بٹھا دیے جائیں گے اور وہاں مولیٰ کا دیدارِ عام ہو گا۔

وہ جنتی جب جنت کے گھروں میں پلٹ کر واپس آئیں گے تو ان کی بیویاں کہیں گی کہ جب تم گھر سے گئے تھے تو اتنے حسین نہ تھے۔ سچ بتاؤ کہاں سے آئے ہو اور کیا کر کے

(۱) یونس، ۱۰: ۲۶

(۲) ۱۔ مسلم، الصحیح، کتاب الإیمان، باب إثبات رؤیة المؤمنین الآخرة ربهم، ۱: ۱۶۳، رقم: ۱۸۱

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴: ۳۳۲، رقم: ۱۸۹۵۵

۳۔ ترمذی، السنن، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة یونس، ۵: ۲۸۶، رقم: ۳۱۰۵

آئے ہو کہ تمہارا حسن بڑھ گیا ہے اور تمہارے چہرے چمک دمک رہے ہیں۔

جنت میں ایک سُوْقُ النُّوْر یعنی بازارِ نور بھی ہوگا۔ ان کا خیال ہوگا کہ شاید نور کے بازار میں گئے ہوں گے اور یہ وہاں کے اثرات کی وجہ سے چمک رہے ہیں۔ کیونکہ جب گئے تھے تو ایسے نہیں تھے، اب آئے ہیں تو یوں چمک رہے ہیں، جیسے چودھویں کا چاند دور دور تک اپنی چاندنی بکھیرتا ہے۔ وہ جواب دیں گے یہ کسی بازار کے اثرات نہیں بلکہ ہم تو صرف مجلسِ حسنِ الٰہی سے اٹھ کر آئے ہیں، مولیٰ کا دیدار کر کے آئے ہیں۔ جس محبوب کے لیے لُٹے تھے، پٹے تھے، کٹے تھے، قربانیاں دی تھیں اور شہید ہوئے تھے، آج اُسی رخِ جاناں کا دیدار کر کے آئے ہیں۔ قربانیوں، شہادتوں، گردنیں کٹانے، مال لٹانے، فاقہ کشی کرنے اور مقدمے بھگتنے کا آج ہمیں صلہ مل گیا۔ اب جی چاہتا ہے کہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ اور ہو۔ دیدارِ الٰہی ہر جمعہ کو نصیب ہوتا ہے۔ کاش! یہ دیدار ہر روز نصیب ہو۔

ہر جمعہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنے والوں اور سوق النور کی یہ خبر حضور نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظِ مبارکہ کے ذریعے دی۔ حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ان کی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

أَسْأَلُ اللهَ أَنْ يَجْمَعَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ فِي سُوْقِ الْجَنَّةِ، فَقَالَ سَعِيْدٌ: أَفِيْهَا سُوْقٌ؟ قَالَ: نَعَمْ، أَخْبَرَنِي رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: أَنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ إِذَا دَخَلُوْهَا، نَزَلُوْا فِيْهَا بِفَضْلِ أَعْمَالِهِمْ، ثُمَّ يُؤْذَنُ فِي مِقْدَارِ يَوْمِ الْجُمُعَةِ مِنْ أَيَّامِ الدُّنْيَا، فَيَزُوْرُوْنَ رَبَّهُمْ، وَيُبْرِزُ لَهُمْ عَرْشَهُ، وَيَتَبَدّٰى لَهُمْ فِي رَوْضَةٍ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ، فَتُوضَعُ لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُورٍ، وَمَنَابِرُ مِنْ لُؤْلُؤٍ، وَمَنَابِرُ مِنْ زَبَرْجَدٍ، وَمَنَابِرُ مِنْ ذَهَبٍ، وَمَنَابِرُ مِنْ فِضَّةٍ، وَيَجْلِسُ أَدْنَاهُمْ وَمَا فِيهِمْ مِنْ دَنِيٍّ عَلٰى كُثْبَانِ الْمِسْكِ وَالْكَافُورِ، وَمَا يَرَوْنَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَرَاسِيِّ بِأَفْضَلَ مِنْهُمْ مَجْلِسًا.

قَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ ﷺ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللهِ، وَهَلْ نَرٰى رَبَّنَا؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: هَلْ تَتَمَارُوْنَ فِي رُؤْيَةِ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ؟ قُلْنَا: لَا، قَالَ: كَذٰلِكَ لَا تُمَارُوْنَ فِي رُؤْيَةِ رَبِّكُمْ، وَلَا يَبْقٰى فِي ذٰلِكَ الْمَجْلِسِ رَجُلٌ إِلَّا حَاضَرَهُ اللّٰهُ مُحَاضَرَةً، حَتّٰى يَقُوْلَ لِلرَّجُلِ مِنْهُمْ: يَا فُلَانَ بْنَ فُلَانٍ، أَتَذْكُرُ يَوْمَ قُلْتَ: كَذَا وَكَذَا؟ فَيُذَكَّرُ بِبَعْضِ غَدْرَاتِهِ فِي الدُّنْيَا، فَيَقُوْلُ: يَا رَبِّ، أَفَلَمْ تَغْفِرْ لِي؟ فَيَقُوْلُ: بَلٰى، فَسَعَةُ مَغْفِرَتِي بَلَغَتْ بِكَ مَنْزِلَتَكَ هٰذِهٖ، فَبَيْنَمَا هُمْ عَلٰى ذٰلِكَ غَشِيَتْهُمْ سَحَابَةٌ مِنْ فَوْقِهِمْ، فَأَمْطَرَتْ عَلَيْهِمْ طِيْبًا لَمْ يَجِدُوا مِثْلَ رِيْحِهٖ شَيْئًا قَطُّ، وَيَقُوْلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالٰى: قُوْمُوْا إِلٰى مَا أَعْدَدْتُ لَكُمْ مِنَ الْكَرَامَةِ، فَخُذُوْا مَا اشْتَهَيْتُمْ. فَنَأْتِي سُوْقًا قَدْ حَفَّتْ بِهِ الْمَلَائِكَةُ فِيْهِ مَا لَمْ تَنْظُرِ الْعُيُوْنُ إِلٰى مِثْلِهٖ، وَلَمْ تَسْمَعِ الْأَذَانُ، وَلَمْ يَخْطُرْ عَلَى الْقُلُوْبِ، فَيُحْمَلُ لَنَا مَا اشْتَهَيْنَا، لَيْسَ يُبَاعُ فِيْهَا وَلَا يُشْتَرٰى. وَفِي ذٰلِكَ السُّوْقِ يَلْقٰى أَهْلُ الْجَنَّةِ بَعْضُهُمْ بَعْضًا، قَالَ: فَيُقْبِلُ الرَّجُلُ ذُوالْمَنْزِلَةِ الْمُرْتَفِعَةِ فَيَلْقٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ وَمَا فِيْهِمْ دَنِيٌّ فَيَرُوْعُهٗ مَا يَرٰى عَلَيْهِ مِنَ اللِّبَاسِ، فَمَا يَنْقَضِي آخِرُ حَدِيْثِهٖ حَتّٰى يَتَخَيَّلَ إِلَيْهِ مَا هُوَ أَحْسَنُ مِنْهُ، وَذٰلِكَ أَنَّهٗ لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ أَنْ يَحْزَنَ فِيْهَا، ثُمَّ نَنْصَرِفُ إِلٰى مَنَازِلِنَا، فَيَتَلَقَّانَا أَزْوَاجُنَا، فَيَقُلْنَ: مَرْحَبًا وَأَهْلًا، لَقَدْ جِئْتَ وَإِنَّ بِكَ مِنَ الْجَمَالِ أَفْضَلَ مِمَّا فَارَقْتَنَا عَلَيْهِ، فَيَقُوْلُ: إِنَّا جَالَسْنَا الْيَوْمَ رَبَّنَا الْجَبَّارَ، وَيَحِقُّنَا أَنْ نَنْقَلِبَ بِمِثْلِ مَا انْقَلَبْنَا.[1]

---

(۱) ۱۔ ترمذی، السنن، کتاب صفة الجنة، باب ما جاء في سوق الجنة، ۴: ۶۸۵، رقم: ۲۵۴۹

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو جنت کے بازار میں اکٹھا کردے۔ سعید کہنے لگے: کیا جنت میں بھی کوئی بازار ہوگا؟ انہوں نے کہا: ہاں مجھے رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے کہ جب جنتی جنت میں داخل ہوجائیں گے تو وہ اپنے اَعمال کی برتری کے لحاظ سے مراتب حاصل کریں گے۔ دنیا کے ایّام میں سے جمعہ کے دن کے (دورانیہ کے) برابر انہیں اجازت دی جائے گی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کرسکیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے اپنا عرش ظاہر کرے گا اور باغاتِ جنت میں سے کسی ایک باغ میں اپنی تجلّی فرمائے گا۔ جنتیوں کے لیے منبر بچھائے جائیں گے جو نور، موتی، یاقوت، زبرجد، سونے اور چاندی کے ہوں گے۔ ان میں سے ادنیٰ درجے والے مشک اور کافور کے ٹیلے پر بیٹھیں گے اور (حقیقت میں) وہاں کوئی شخص بھی ادنیٰ نہیں ہوگا۔ وہ کرسیوں پر بیٹھنے والوں کو اپنے سے افضل نہیں سمجھیں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم اپنے پروردگار کا دیدار کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، کیا تم سورج اور چودھویں کے چاند کو دیکھنے میں کوئی شک کرتے ہو؟ ہم نے عرض کیا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسی طرح تم اپنے پروردگار کے دیدار میں کوئی شک نہیں کرو گے۔ اس محفل میں کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا جس سے اللہ تعالیٰ براہِ راست گفتگو نہ فرمائے گا۔ حتیٰ کہ ان میں سے ایک سے فرمائے گا: اے فلاں بن فلاں! کیا تجھے وہ دن یاد ہے جب تو نے فلاں بات کہی تھی؟ پس وہ اسے اس کے بعض گناہ یاد دلائے گا۔ وہ شخص عرض گزار ہوگا: اے رب! کیا تو نے مجھے بخش نہیں دیا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہاں کیوں نہیں اور میرے

۲۔ ابن ماجه، السنن، کتاب الزهد، باب صفة الجنة، ۲: ۱۴۵۰، رقم: ۴۳۳۶

۳۔ ابن حبان، الصحیح، ۱۶: ۴۶۶، ۴۶۷، رقم: ۷۴۳۹

۴ ابن أبي عاصم، السنة، ۱:۲۵۸-۲۵۹، رقم:۵۸۵

۵۔ منذری، الترغیب والترهیب، ۴:۳۰۱-۳۰۲، رقم:۵۷۲۸

معاف فرمانے کی وجہ سے ہی تو اس مقام پر پہنچا ہے۔ لوگ اسی حال میں ہوں گے کہ ان پر ایک بادل چھا جائے گا اور (اس سے) ایسی خوشبو برسائی جائے گی کہ اس طرح کی خوشبو اس سے پہلے انہوں نے کبھی نہیں سونگھی ہو گی۔ پھر ہمارا پروردگار فرمائے گا: اس انعام و اکرام کی طرف اٹھو جو ہم نے تمہارے لیے تیار کر رکھا ہے اور اس میں سے جو تمہارا جی چاہے لے لو۔ پھر ہم بازار میں آئیں گے جہاں فرشتے ہی فرشتے ہوں گے۔ ایسا بازار نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی دل میں اس کا خیال گزرا ہو گا۔ جو چیز ہم چاہیں گے ہمیں مہیا کر دی جائے گی، (دنیا کی طرح) خرید و فروخت نہ ہوگی۔ اس بازار میں اہل جنت ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بلند مرتبے والے آگے بڑھ کر ادنیٰ درجے والوں سے ملیں گے، وہاں کوئی ادنیٰ نہ ہوگا پھر وہ (کم درجے والا) اس کا لباس دیکھ کر بڑا متعجب ہو گا۔ ابھی ان کی گفتگو ختم نہیں ہو گی کہ وہ اپنے جسم پر اس سے بھی زیادہ خوبصورت لباس دیکھے گا اور یہ اس لیے کہ وہاں کسی کو کوئی حزن و ملال نہ ہو گا۔ پھر ہم واپس اپنے گھروں میں آ جائیں گے۔ ہماری بیویاں ہمارا استقبال کریں گی اور کہیں گی خوش آمدید، خوش آمدید، آپ واپس آ گئے ہیں، آپ کا حسن و جمال اس وقت سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے جس وقت آپ ہم سے رخصت ہوئے تھے۔ وہ کہے گا: آج ہم اپنے ربِ جبّار کی مجلس میں بیٹھ کر آئے ہیں (جس کی وجہ سے) ہم ایسی ہی نورانی شکل وصورت میں تبدیل ہو جانے کے حق دار تھے۔

احادیث مبارکہ میں آتا ہے کہ کئی جنتی ایسے بھی ہوں گے جنہیں ہر روز اللہ کا دیدار نصیب ہوگا۔ ان جنتیوں کو بلا ناغہ بلایا جائے گا اور ہر روز ایک مرتبہ دیدارِ الٰہی کی محفل ہوگی۔ ایسے خوش نصیوں کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ أَدْنٰى أَهْلِ الْجَنَّةِ مَنْزِلَةً الَّذِى يَنْظُرُ إِلٰى جِنَانِهٖ وَنَعِيمِهٖ وَخَدَمِهٖ وَسُرُرِهٖ

مِنْ مَسِيرَةِ أَلْفِ سَنَةٍ، وَإِنَّ أَكْرَمَهُمْ عَلَى اللهِ، مَنْ يَنْظُرُ إِلٰى وَجْهِهِ غُدْوَةً وَعَشِيَّةً. ثُمَّ تَلَا هَذِهِ الْآيَةَ: ﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ○ إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ○﴾[1].[2]

ادنیٰ درجے کا جنتی اپنے باغات، بیویوں، خادموں اور تختوں کو ہزار برس کی مسافت تک دیکھے گا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہوگا جو صبح و شام دیدارِ الٰہی سے مشرف ہوگا۔ اس کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ نے یہ آیاتِ کریمہ تلاوت فرمائیں: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ○﴾ 'بہت سے چہرے اُس دن شگفتہ و تر و تازہ ہوں گے ○ اور (بلا حجاب) اپنے رب (کے حسن و جمال) کو تک رہے ہوں گے ○'۔

۱۲۔ کیا جنت بذاتِ خود مطلوب و مقصود ہے؟

جنت کے حوالے سے بھی ہر کسی کی اپنی اپنی طلب ہے۔ کوئی حوروں کے لیے، کوئی قصور، کوئی محلات، کوئی رواں نہروں، کوئی جاری چشموں، کوئی باغات، کوئی پھلوں، کوئی رزق اور کوئی آسائشوں کے لیے جنت میں جانا چاہتا ہے۔ کیا ہم بھی اسی حرص میں جنت جانا چاہتے ہیں؟ یاد رکھیں کہ چاہے یہ حرص کریں یا نہ کریں، وہاں یہ سب کچھ ملے گا، مگر اس موقع پر میں آپ کو کسی اور شے کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ہم مومنین نے دنیا میں اِس لیے آزمائشیں، امتحانات اور مظالم سہے اور صبر کیا کہ ہمیں حور و قصور ملیں؟

وہ کیسا سوداگر ہے جو حوروں کے لیے گردنیں کٹوائے، یہ کوئی بڑا سودا نہیں ہے۔ مالی

(۱) القيامة، ۷۵: ۲۳

(۲) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۶۴، رقم: ۵۳۱۷

۲۔ ترمذی، السنن، کتاب صفة الجنة، باب ما جاء فی رؤية الرب تبارک وتعالی (باب منه)، ۴: ۶۸۸، رقم: ۲۵۵۳

۳۔ عبد بن حمید، المسند، ۲۶۰، رقم: ۸۱۹

و جسمانی نقصان، زخمی ہو جانا، جسم چھلنی کروانا، اپنے بازو اور ٹانگیں کٹوانا، خون میں لت پت ہونا، چشموں اور باغات کے لیے جان دینا، حوروں اور محلات کے لیے شہید ہو جانا تو کوئی بڑا سودا نہیں ہے۔ یہ سب تو ہر صورت ملنا ہے۔ اگر یہ سب کچھ وہاں نہ ہو تو وہ جنت کیوں؟

اس دنیا میں بھی چند لوگوں نے نوجوانوں کی جوانیاں برباد کرنے کے لیے ایک جھوٹی جنت بنا رکھی ہے۔ میری آرزو ہے کہ امتِ مسلمہ کے نوجوان، پاکستان کا مستقبل، تحریک کے کارکنان و رفقاء اس بہکاوے میں نہ آئیں۔ اس بہکاوے سے بربادی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اس سے بہت زیادہ ملنے والا ہے۔ اگر ہم خود کو پاکیزہ رکھیں، تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کریں۔ تحریک منہاج القرآن کے کارکنان و رُفقاء نے حق کے لیے قربانیاں دیں، قیدی ہوئے، بھوک اور پیاس کاٹی، خاک و خون میں لت پت ہوئے اور جانیں دیں، یہ سب کچھ محض چشموں اور محلات کے لیے نہیں کیا۔ اگر کوئی سودا ہے تو وہ یہ ہے کہ جانیں قربان کی ہیں تو صرف اس لمحے کے لیے کہ جب پردہ اٹھے اور رُخِ یار کا دیدار نصیب ہو جائے۔

فقر و فاقہ اور پریشانی برداشت کرنے والو! لٹ پٹ جانے والو! قربانیاں دینے والو! استقامت کا پہاڑ بن کر رہنے والو! راہِ حق میں جانیں دینے والو! اگر وہ وقت آئے جب پردہ اٹھے تو اُس جمالِ باکمال کو دیکھ کر وجد کرنا اور کیف و مستی سے سرشار ہو کر یہ کہنا:

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جنت کوئی چھوٹی چیز نہیں بلکہ یہ فہم و ادراک سے ماورا مقام ہے۔ دورِ رسالت مآب ﷺ میں بھی کئی صحابہ کرام ﷡ شہید ہوئے۔ سرورِ کائنات ﷺ اُن شہدا کے ورثا کو جب شہادت کی خبر دیتے تو ان ورثا میں سے کبھی کسی کا باپ، کسی کی ماں، کسی کا بیٹا پوچھتا: آقا! شہادت کے مقام پر فائز ہونے کے بعد ہمارا باپ/ بھائی/ بیٹا کیسا ہے اور کہاں ہے؟ آقاے دو جہاں ﷺ فرماتے: تمہیں بتا دوں کہ اس وقت وہ کس حال میں ہیں؟ صحابہ کرام ﷡ کے یقین کا عالم دیکھیے کہ وہ عرض کرتے کہ آقا بتا دیں کہ وہ کس حال میں ہے؟ صاحبِ معراج ﷺ نے فرمایا: میں

دیکھ رہا ہوں کہ وہ اس وقت اپنے رب کے سامنے بیٹھا اپنے مولیٰ کا دیدار کر رہا ہے۔ انہوں نے پوچھا: آقا! مزید بتائیے۔ آپ ﷺ فرماتے کہ اللہ کے ساتھ باتیں بھی کر رہا ہے۔ کبھی کوئی پوچھتا: یا رسول اللہ! میرے باپ نے اپنے رب سے کیا بات کی ہے؟ آقا ﷺ فرماتے: تیرے باپ نے اللہ سے عرض کیا: اے مولیٰ! جو لذت تجھے تکنے میں آئی ہے، اسی لذت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے مجھے دنیا میں پھر بھیج، میں بار بار دنیا میں جاؤں اور اپنی گردن کٹواؤں، شہید ہو کر آؤں اور تیرا دیدار کروں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اللہ نے کیا جواب دیا؟ رسولِ مکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو ایک بار میرے پاس آ جائے میں اس کو پلٹ کر واپس دنیا میں نہیں بھیجتا۔ یہ موقع انسان کو صرف ایک بار ہی ملتا ہے۔

حضرت مسروق بیان کرتے ہیں: ہم نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اَمْوَاتًاؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَO[1]

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں انہیں ہرگز مردہ خیال (بھی) نہ کرنا، بلکہ وہ اپنے ربّ کے حضور زندہ ہیں انہیں (جنت کی نعمتوں کا) رزق دیا جاتا ہےO

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ہم نے یہی سوال حضور نبی اکرم ﷺ سے کیا تھا۔ آپ ﷺ نے جواب فرمایا:

أَرْوَاحُهُمْ فِي جَوْفِ طَيْرٍ خُضْرٍ لَهَا قَنَادِيْلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ، تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ، ثُمَّ تَأْوِي إِلٰى تِلْکَ الْقَنَادِيْلِ فَاطَّلَعَ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ اطِّلَاعَةً. فَقَالَ: هَلْ تَشْتَهُوْنَ شَيْئًا؟ قَالُوْا: أَيَّ شَيْءٍ نَشْتَهِي، وَنَحْنُ نَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شِئْنَا؟ فَفَعَلَ ذٰلِکَ بِهِمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ. فَلَمَّا رَأَوْا

(۱) آل عمران، ۳:۱۶۹

أَنَّهُمْ لَنْ يُتْرَكُوْا مِنْ أَنْ يُسْأَلُوْا، قَالُوْا: يَا رَبِّ، نُرِيْدُ أَنْ تَرُدَّ أَرْوَاحَنَا فِي أَجْسَادِنَا حَتّٰى نُقْتَلَ فِي سَبِيْلِكَ مَرَّةً أُخْرٰى، فَلَمَّا رَآى أَنْ لَيْسَ لَهُمْ حَاجَةٌ تُرِكُوْا.(۱)

ان کی روحیں سبز پرندوں کے جسموں میں رہتی ہیں اور ان کے لیے عرش میں قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں، وہ روحیں جنت میں جہاں چاہیں پھرتی ہیں اور پھر ان قندیلوں کی طرف لوٹ آتی ہیں۔ پھر ان کا رب انہیں نظر رحمت سے تکتا ہے اور پوچھتا ہے: کیا تمہیں کسی چیز کی خواہش ہے؟ وہ کہتے ہیں: ہمیں مزید کس چیز کی خواہش ہوسکتی ہے! ہم جہاں چاہتے ہیں جنت میں آزادی سے پھرتے ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ ان سے تین بار یہ دریافت فرماتا ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کو جواب دیے بغیر نہیں چھوڑا جا رہا تو وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں لوٹا دیا جائے حتیٰ کہ ہم دوبارہ تیری راہ میں شہید کر دیے جائیں۔ جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھے گا کہ انہیں کوئی حاجت نہیں ہے تو پھر انہیں جنّت میں آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔

ان احادیث سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ راہِ حق میں استقامت اور قربانیوں کے صلہ کے طور پر جنت اور جنت کی مذکورہ نعمتیں تو ملتی ہی ہیں مگر مردِ مومن کے لیے جنت بذاتِ

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب الإمارة، باب بيان أن أرواح الشهداء في الجنة وأنهم أحياء عند ربهم يرزقون، ۳:۱۵۰۲، رقم:۱۸۸۷
۲۔ ترمذی، السنن، أبواب التفسير، تفسير سورة آل عمران، ۵:۲۳۱، رقم:۳۰۱۱
۳۔ ابن ماجه، السنن، كتاب الجهاد، باب فضل الشهادة في سبيل الله، ۲:۹۳۶، رقم:۲۸۰۱
۴۔ دارمی، السنن، ۲:۲۷۱، رقم:۲۴۰۱
۵۔ طبرانی، المعجم الكبير، ۹:۲۰۹-۲۱۰، رقم/۹۰۲۳-۹۰۲۴

خود مطلوب و مقصود نہیں ہوتی بلکہ وہ دیدارِ الٰہی کے حصول کے لیے ہی دنیاوی آزمائشوں اور قربانیوں کے سفر پر کامیابی سے گامزن رہتے ہیں۔

۱۳۔ طبعی موت کے باوجود شہادت کا مرتبہ کیوں کر ممکن ہے؟

حضرت ابراہیم بن عبید بن رفاعہ کی روایت میں ہے کہ انہیں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد ابو محمد نے مرسلاً رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کی کہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں شہداء کا تذکرہ ہوا تو پیکرِ جود و سخا حضرت محمد ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ أَكْثَرَ شُهَدَاءِ أُمَّتِي أَصْحَابُ الْفُرُشِ، وَرُبَّ قَتِيلٍ بَيْنَ الصَّفَّيْنِ، اَللهُ أَعْلَمُ بِنِيَّتِهٖ. (۱)

میری اُمت کے شہداء کی اکثریت اَصحابِ فراش (یعنی بستر پر طبعی موت مرنے والوں) پر مشتمل ہو گی اور (مومنوں اور کافروں کی) دونوں جماعتوں کے مابین ہونے والی جنگ میں کئی مرنے والے محض مقتول ہی ہوتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک کی نیت کو بہتر جانتا ہے (کہ وہ اُس کی رضا کی خاطر نہیں لڑے تھے بلکہ ان کے کچھ اور مقاصد تھے)۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: آقا! یہ کس طرح ممکن ہے؟ بستر پر طبعی موت مرنے والا بھی درجہ شہادت کو پہنچ جاتا ہے؟ خاتم الانبیا و المرسلین ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیونکہ ان کی عمر شہادت کی آرزو میں کٹ گئی۔ عمر بھر اس آرزو کے ساتھ اللہ کی راہ میں لڑتے رہے کہ شہادت کے منصب سے سرفراز ہو جائیں۔ شہید کا منصب حاصل کرنے کے لیے یہ پابندی نہیں ہے کہ

---

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱: ۳۹۷، رقم: ۳۷۷۲
۲۔ ابن أبي شیبه، المصنف، ۱: ۲۷۰، رقم: ۴۰۳
۳۔ دیلمی، مسند الفردوس، ۱: ۳۶۲-۳۶۳، رقم: ۱۴۶۴
۴۔ حکیم ترمذی، نوادر الأصول، ۴: ۲۳۲

میدانِ جنگ کے معرکے ہی میں مرنے والے کو شہادت کے مرتبہ سے نوازا جائے۔ وہ شخص جو عمر بھر شہادت کی آرزو لے کر اللہ کے دشمنوں سے لڑتا رہا، اس کی موت خواہ بستر پر ہی کیوں نہ آئے وہ اللہ کے ہاں شہید ہے۔

راشد بن سعد سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

لَيْسَ كُلُّ قَتِيْلٍ شَهِيْدًا، رُبَّ قَتِيْلٍ بَيْنَ الصَّفَّيْنِ، اَللهُ أَعْلَمُ بِنِيَّتِهِ. (۱)

ہر مقتول شہید نہیں ہوتا، دونوں صفوں (یعنی مومنوں اور کافروں) کے درمیان ہونے والی جنگ میں کئی (مسلمان) محض مقتول ہوتے ہیں، اللہ اس (مسلمان مقتول) کی نیت کو بہتر جانتا ہے۔

حکیم ترمذی 'نوادر الاصول' میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

إِنَّ الشَّهَادَةَ لَيْسَتْ عَلَى الْقَتْلِ حَدَثَتْ، إِنَّمَا اسْمُ الشَّهَادَةِ لَزِمَهُمْ لِمَا وَصَفْنَا، وَالْكَرَامَةُ نَالُوْهَا مِنْ أَجْلِ أَنَّهُمْ رَفَضُوا الْحَيَاةَ وَآثَرُوا لِقَاءَ اللهِ، وَأَرَادُوهُ فَأَرَادَهُمْ. ...... وَلِذٰلِكَ قَالَ ﷺ: أَقْوَامٌ يَجْعَلُ مَوْتٰهُمْ عَلٰى فُرُشِهِمْ وَيَقْسِمُ لَهُمْ أُجُوْرَ الشُّهَدَاءِ. (۲)

شہادت (کا رُتبہ) صرف قتل ہونے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ شہادت نام ہے ان صفات سے متصف ہونے کا جنہیں ہم نے بیان کر دیا ہے۔ شہداء یہ مرتبۂ تکریم اس وجہ سے پاتے ہیں کہ وہ دنیاوی زندگی کی چاہتوں کی نفی کرکے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی کو چاہتے ہیں۔ اس لئے ذاتِ حق بھی ان کو چاہتی ہے۔ ...... اسی لیے آپ ﷺ کا فرمان ہے: کئی لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں ان کے

---

(۱) حکیم ترمذی، نوادر الأصول، ۴: ۲۳۱

(۲) ۱۔ حکیم ترمذی، نوادر الأصول، ۴: ۲۳۱-۲۳۲

۲۔ ہندی، کنز العمال، ۴: ۱۸۳، رقم: ۱۱۲۴۸

بستر پر (طبعی) موت دیتا ہے مگر اُن کے لئے اجر و ثواب شہداء جیسا لکھ دیتا ہے۔

مصطفوی انقلاب کی جدوجہد شہیدوں کی تحریک ہے۔ اس جدوجہد کے دوران جو کوئی موت کے ڈر سے بھاگا نہیں، وہ بھی شہید ہے۔ اس لیے کہ جذبۂ شہادت تو اس کے اندر موجود ہے۔ مذکورہ روایات میں شہادت کی اِسی دوسری قسم کو واضح فرمایا گیا ہے۔

۱۴۔ استقامتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تربیتِ اُمت کا باعث ہے

گزشتہ صفحات پر مذکور جملہ مضمون اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ اس لیے کہ وہاں یہ تمام حالات پیش آ چکے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انبیاء نہیں تھے کہ ان پر وحی آتی ہو، وہ بشر تھے۔ وہ رتبہ میں ولیوں، ابدالوں، قطبوں اور غوثوں سے بھی بلند تھے اور رتبے میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا مگر تھے تو آخر انسان۔ حالات جب پلٹا کھاتے بشری تقاضوں کی بناء پر مختلف سوچیں ان کے ذہن میں بھی آتی تھیں یہ الگ بات ہے کہ تربیت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باعث وہ ان سوچوں سے کیسے نبرد آزما ہوتے تھے۔ بارگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ان کی تربیت گاہ تھی اور قرآن اُن کا مربی تھا۔ ہماری اور ان کی تربیت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جب ہمیں تربیت کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں یا اس کا درس سنتے ہیں، اس طرح سے ہماری روحانی تربیت ہوتی ہے، ہمارے غلط گمانوں کی اصلاح، غلط خیالات اور تصورات کی درستگی ہوتی ہے۔ ہماری تربیت کا طریقہ قرآن میں آ چکا ہے۔

جنہیں دورِ رسالت نصیب ہوا، وہ افراد خوش نصیب تھے۔ ان کی تربیت کیسے ہوتی تھی؟ جب ایسی صورت حال پیدا ہوتی کہ بتقاضاے بشریت انہیں گھبراہٹ ہوتی، پریشانی آتی، طرح طرح کے وساوس، دشمن، یہودی، منافق، کافر اور عزیز واقارب طعنہ زنی کرتے، مخالفین کی باتیں سن کر پریشان ہو جاتے تو ان حالات میں انہیں تربیت کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ تربیت کے لیے بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آ کر بیٹھتے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے چہروں سے پڑھ لیتے تھے کہ ان کے ذہنوں میں کیا سوالات ابھر رہے ہیں؟ اسی وقت جبریل امین تازہ وحی لے کر آ جاتے۔ گویا ان کی تربیت کے لیے موقع پر ہی قرآن اترتا۔ ان کے وسیلے سے ہمیں بھی

سبق مل گیا اور ہماری بھی تربیت ہوگئی۔

مذکورہ صورتِ حال غزوۂ اُحد میں سامنے آئی تو قرآن مجید میں یہ مضامین آ گئے، کیونکہ صحابہ کرام ﷺ کی تربیت ہو رہی ہے اور انہیں دوبارہ مستحکم کیا جا رہا ہے کہ کوئی بات نہیں۔ اگر تمہیں زخم آ گئے تو کیا ہوا، انہیں بھی زخم آئے تھے، یہ دن بدلتے رہتے ہیں، گھبراؤ نہیں۔

وہ سوچتے تھے کہ اتنی شہادتیں کیوں ہوگئیں؟ اتنا نقصان و خسارہ کیوں ہوگیا؟ آقاے دو جہاں ﷺ زخمی ہوگئے، حضرت امیر حمزہ ﷺ کے جسدِ مبارک کی بے حرمتی کی گئی۔ ہندہ نے جگر نکال کر چبانے کی کوشش کی مگر کام یاب نہ ہوسکی تو اپنے ساتھ لے گئی۔[۱] ایک طویل روایت میں حضرت عبد اللہ بن مسعود ﷺ روایت کرتے ہیں: غزوۂ اُحد کے روز لوگوں نے دیکھا کہ حضرت حمزہ ﷺ کا پیٹ چاک کیا ہوا ہے۔ ہندہ نے چبانے کے لیے ان کا جگر نکال لیا لیکن وہ اسے کھا نہ سکی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا اُس نے اس میں کچھ کھایا ہے؟ صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

مَا كَانَ اللهُ لِيُدْخِلَ شَيْئًا مِنْ حَمْزَةَ النَّارَ.[۲]

اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ حمزہ کے جسم کا کوئی حصہ جہنم میں داخل کرے۔

الغرض شہید صحابہ کرام ﷺ کو بے ستر کیا گیا، ان کے اعضا کاٹے گئے۔ یہ سب کچھ غزوۂ اُحد میں صحابہ کرام ﷺ کے سامنے ہو رہا تھا۔ لہٰذا انسان اور بشر ہونے کے ناطے انہیں یہ سوچیں آتی تھیں کہ یہ سب کیوں ہوا؟

صحابہ کرام ﷺ کے بعد اگر اہلِ حق کو ایسے مشکل حالات درپیش ہوں اور اُن کے

---

(۱) دیار بکری، تاریخ الخمیس، ۱: ۴۲۰

(۲) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱: ۴۶۳، رقم: ۴۴۱۴
۲۔ ابن أبی شیبة، المصنف، ۷: ۳۷۱، رقم: ۳۶۷۸۳
۳۔ ابن سعد، الطبقات الکبری، ۳: ۱۳

ذہن میں اس طرح کے سوالات گردش کرنے لگیں تو یاد رکھ لیں کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ سوچیں ہر وقت ہر ایک کو آتی ہیں۔ صحابہ کرام ﷺ کی سوچوں کو سیدھی راہ پر ڈال کر تربیت کرنے کے لیے، ان کے ذہنوں میں موجود سوالات کے جوابات دینے اور ان کو رہنمائی دینے کے لیے کلامِ الٰہی نازل ہوتا تھا۔ اِس دور میں ہمارا فرض یہ ہے کہ جو رہنمائی قرآن نے دی اسے ہم بھی قیامت تک تھامے رکھیں۔ اپنی سوچ کو اس محور ومرکز سے ایک پل کے لیے نہ ہٹائیں تا کہ ہماری استقامت پر حرج نہ آئے۔

۱۵۔ شیطانی وساوس کا تدارک قوتِ یقین سے ممکن ہے

اللہ رب العزت نے فکر اور سوچ کا انداز بدلا ہے۔ ایک سوچ اُن کی تھی جو کہتے تھے کہ اگر ہماری بات مانتے تو اتنی شہادتیں نہ ہوتیں۔ اس سوچ کا سربراہ رئیس المنافقین عبد اللہ بن اُبی تھا۔ اللہ پاک اس سوچ کو وسوسہ کہتا ہے اور اسے نکال کر دوسری اُلوہی، قرآنی اور روحانی سوچ دینا چاہتا ہے۔ وہ سوچ یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو موت سے کیسے اور کب تک بچا سکتے ہو، موت تو ہر صورت آنا تھی، اختیار تمہارا ہے کہ بزدلی کی موت مرتے یا جوانمردی سے شہادت کی موت کو ہنس کر سینے سے لگاتے۔

فرمایا: موت کا جب وقت آئے گا تو تم محلات میں بھی بند ہو جاؤ محفوظ قلعوں کے حصار میں بھی بیٹھ جاؤ تو تمہاری طبیعتیں تمہیں خود بخود نکال کر قتل گاہوں میں لے جا کر قتل کروا دیں گی۔ یہ یقین پیدا کرو کہ موت کسی بھی صورت ٹل نہیں سکتی۔ اللہ رب العزت نے قرآن مجید کے ذریعے سوچوں کو بدلا اور وساوس کی جگہ یقین کو مستحکم کیا تا کہ ایمان کو کامل کرتے ہوئے یقین پیدا کیا جاسکے۔ لہٰذا گردش ایام کو سمجھنے اور اس کی حکمتوں اور مقاصد کو جاننے کی ضرورت ہے کہ یہ وفاداری کو ظاہر کرنے، ایمان کو مزید نکھارنے، شہادت کا رتبہ عطا فرمانے، وساوس سے نجات دلانے، ایمان والوں اور وفاداروں کا درجہ بلند کرنے اور بالآخر ہمیں فتح یاب اور کامیاب کرنے کے لیے ہے۔ بزدلی شکست ہے اور جوانمردی فتح اور نصرت ہے۔ یہ قرآن مجید کا درس ہے۔ وہ قرآن مجید جس نے غزوہ اُحد کے حالات وواقعات بیان کرنے سے پہلے کہا تھا:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ○[1]

یہ قرآن لوگوں کے لیے واضح بیان ہے اور ہدایت ہے اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہے○

جو سوچ قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے وہی سوچ حق ہے۔ اس کے علاوہ کیوں، کب اور کیسے سے متعلق جو بھی سوچ آئے گی وہ شیطانی وسوسہ ہوگا اور ایمان کے خلاف ہوگا۔ ایسا وسوسہ ہر صورت یقین کو متزلزل کرے گا اور اگر یقین کی دولت نہ رہی تو سمجھو کہ فتح چلی گئی۔ اَہلِ یقین کو کوئی نہ شکست دے سکا، نہ دے سکتا ہے اور نہ دے سکے گا۔ اَہلِ یقین و اَہلِ حق ہمیشہ کامیاب و کامران اور بامراد ہوتے ہیں۔

۱۶۔ وساوس کے نقصانات

وسوسہ یقین کو کیسے متزلزل کرتا ہے اور انسانی شخصیت و کردار کو کن نقصانات سے دو چار کرتا ہے؟ آیئے اِس کا جائزہ لیں تاکہ ہم خود کو اِس وسوسہ سے بچانے کا اہتمام کرسکیں۔ جب ہم وساوس کی بحث میں پڑتے ہیں تو اکثر یہ سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ ہم پر شیطان کا حربہ چل گیا ہے اور ہم ہدایت کی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ شیطان کا حملہ کیا ہے؟ دراصل وسوسہ ایک جرثومہ ہوتا ہے، جسے شیطان انسان کے قلب میں ڈالتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ جراثیم بڑھتے رہتے اور اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ تدریجاً سارے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور مسلسل انفیکشن کا سبب بنتے رہتے ہیں۔

شیطان لعین کا سب سے پہلا کام یقین کی جڑ کاٹنا اور اُس کی جگہ شک کا بیج بو دینا ہے۔ اس شیطانی عمل کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے اور پھر جیسے جیسے شک کا پودا تناور ہوتا رہتا ہے تو وہ بے مقصد سوالات پر سوالات اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال میں بندہ اُن سوالات در سوالات کی دلدل میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ بدنصیب شخص سیدھے راستے

(۱) آل عمران، ۳:۱۳۸

سے ہٹ جاتا ہے۔ منزل جہاں تھی، وہیں ٹھہری رہی اور مسافت جہاں تھی، وہیں پر جمی رہی۔ وہ بے چارہ شک و شبہات اور خدشات کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گیا۔ اب اُس شخص کی اپنے انقلابی مشن کے لیے خدمت یہی رہ گی کہ وہ بس سوالات پر سوالات اٹھائے چلا جا رہا ہے اور اس کارِ بے کاراں میں اپنا قیمتی وقت برباد کیے جا رہا ہے۔ شیطان اسے اِسی کام میں مشغول کر دیتا ہے۔ اس وسوسہ سے ترقی، جدوجہد اور منزل کی جانب اس کا سفر رک جاتا ہے اور وہ ہر وقت وساوس میں ہی مبتلا رہتا ہے۔

اگر وہ وساوس کی وجہ سے سوالات تک محدود رہتا تو اور بات تھی مگر قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ وہ اس سے بھی آگے ایک درجہ بڑھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے اخلاص کا عالم یہ ہے کہ میں تو ہر وقت مشن کے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہوں۔ میرا اوڑھنا اور بچھونا مشن ہے۔ یہ سچ ہے کہ مشن کے ہی بارے میں سوچتے ہو، مگر یہ بھی تو سوچو کہ آخر تم سوچتے کیا ہو؟

یقین کی قوت سے سوچتے ہو یا وسوسے سے سوچتے ہو؟ اگر رات دن وسوسہ ہی سوچتے رہتے ہو تو وہ شیطان کی سوچ ہے۔ مشن، ہدایت، ایمان اور ایقان کی سوچ ہرگز نہیں ہے۔ اُس رات دن کے سوچنے کا کچھ بھی فائدہ نہیں بلکہ جتنا سوچتے ہیں ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' کے مصداق مرض بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

اس چیز کو قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا:

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضاً. (۱)

ان کے دلوں میں بیماری ہے، پس اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا۔

وسوسہ بھی دل کا مرض ہے۔ دل کے اس مرض کی خاصیت یہ ہے کہ کبھی یہ کم نہیں ہوتا، بلکہ وقت کے ساتھ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ جس دل میں یہ موذی گھس گیا، کوئی خال خال ہی بچ کر واپس ہدایت پر گیا، ورنہ اس دلدل سے نکلنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اُس کا مرض اللہ اور اس کا رسول ﷺ ٹھیک فرما دیں تو فرما دیں ورنہ کسی اور معالج کے بس کی بات

(۱) البقرة، ۲: ۱۰

نہیں۔ اللہ اُن کے مرض کو بڑھاتا رہتا ہے۔ اب کس کی مجال ہے کہ وہ کہے کہ میں اس مرض کو ختم کر سکتا ہوں؟ اللہ اُس مرض کو بڑھاتا رہتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اب یہ بات فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ۔ اُن کے دلوں میں آ گئی ہے۔

یاد رکھ لیں کہ اَمراضِ قلب میں سب سے مہلک نفاق کی بیماری ہے۔ اس کی بنیاد وسوسہ ہے۔ شک کی ابتدا بھی یہیں سے ہوتی ہے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ بڑھتا رہتا ہے۔ ہم روز مرہ زندگی میں دیکھتے ہیں کہ اگر کسی آدمی کو وہم کا عارضہ لاحق ہو جائے تو وضو یا غسل کے وقت وہ بار بار ہاتھ ہی دھوتا رہتا ہے۔ وہ اسی عمل میں ایک گھنٹہ صرف کر دیتا ہے، اتنا وقت گزارنے کے بعد بھی وہ سمجھتا ہے کہ ابھی میری طہارت نہیں ہوئی ہے۔ شریعت میں تو تین مرتبہ ہاتھ دھونے کا حکم تھا، مگر وہ تین سو مرتبہ دھو کر بھی سمجھتا ہے کہ ابھی میرے ہاتھ صاف نہیں ہوئے۔ یہ صورتِ حال دراصل وہم کا مرض ہے۔ وسوسہ کو وہم بھی کہتے ہیں۔ اگر اِس سے پوچھیں کہ کیا کر رہے ہو؟ وہ جواباً کہے گا: الحمد للہ میں تو کامل وضو کرتا ہوں۔ آپ اُس سے کہیے کہ اتنا وقت تو اُس نے وسوسے میں گزار دیا، اس طرح کرنے سے طہارت بڑھتی نہیں بلکہ وقت اور پانی کا ضیاع ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت اور رسول اللہ ﷺ کے حکم سے تین بار دھونے سے ہی کاملاً طہارت آ جاتی تھی۔ آپ اُسے تین سو بار بھی دھو لیں تو اُس سے طہارت میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ وہ تو وسوسہ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ گویا وہ اپنے اس عمل کو کامل طہارت کا حصول سمجھتا ہے۔

اسی طرح تحریکی و جماعتی زندگی میں شک و شبہ کی بنیاد پر سوالات اُٹھانا اور پھر ان سوالات کے اُبھارنے کو مشن کے لیے خیر سمجھنا مشن کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ وسوسہ کو مضبوط کرنے کے مترادف ہے۔ یاد رہے کہ کسی بھی چیز کے معیار کا تعین اس کی سب سے چھوٹی اکائی کے معیار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تحریکوں کے معیار کا تعین بھی اس تحریک کی چھوٹی اکائی یعنی ان کے کارکنوں کی اپنے مشن سے خلوص، عزم و استقلال اور منزل کے حصول کے یقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۱۷۔ تحریکی زندگی میں یقین و اِستقامت کی اہمیت

تحریکوں اور جماعتوں کی عملی زندگی میں مشن کے برحق اور کامیاب ہونے کے یقین کی مثال ایسے ہی ہے جیسا کہ دین میں ایمان بالغیب ہے۔ جس طرح ایمان بالغیب میں جس ذات کو منوایا جا رہا ہے، اُسے نہ تو کسی انسان نے دیکھا ہے اور نہ ہی دور دور تک اُس کے نظر آنے کے اِمکانات موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا کبھی کسی نے اللہ کو دیکھا ہے اور کوئی امکان بھی ہے کہ آپ اُسے قیامت سے پہلے دیکھ سکیں گے؟ کیا جبرائیل امین علیہ السلام کو کسی نے وحی لاتے ہوئے دیکھا ہے؟ کیا اس دنیاوی زندگی میں جیتے ہوئے کسی نے برزخ کو دیکھا ہے؟ کیا بعث بعد الموت اور قیامت کے دن کو دیکھا ہے؟ کیا کسی نے پل صراط، میزان اور جنت و دوزخ کو دیکھا ہے؟ ہم آمَنْتُ بِاللهِ وَمَلٰئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ کے آغاز سے اختتام تک جتنے ارکانِ ایمان کا اقرار و تصدیق کرتے ہیں، اُن میں سے نہ تو کسی ایک جزو کو کسی نے دیکھا ہے اور نہ ہی مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے سے پہلے دیکھے جانے کا امکان ہے۔ گویا ہم جسے مان رہے ہیں، وہ چیز دکھائی نہیں دے رہی اور زندگی میں دکھائی دینے کا کوئی امکان بھی نہیں ہے، مگر ہم اُسے کامل یقین کے ساتھ بِن دیکھے مانتے ہیں۔ یہ مومن کی زندگی کا نکتہ آغاز ہے۔

یہ بات میں نہیں بیان کر رہا بلکہ اللہ رب العزت نے خود ارشاد فرمائی ہے۔ ہماری حیثیت تو صرف ایک ناقل کی سی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ توفیق ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی بلکہ جس پر یہ عطاے ربانی ہوتی ہے اسے ہی بطور خاص عطا ہوتی ہے۔ کلام الٰہی تو سب کے سامنے ہے، مگر ہماری حیثیت اس بحرِ علوم سے خیرات لے کر آپ کو پہنچانے والے کی ہے۔

ارشاد فرمایا:

الٓمّٓ ○ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ○ (۱)

الف لام میم (حقیقی معنی اللہ اور رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں) ○ (یہ) وہ عظیم کتاب

(۱) البقرۃ، ۲: ۱-۲

ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، (یہ) پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے○

اس آیتِ مبارکہ میں واضح فرما دیا کہ قرآنِ مجید کا پہلا سبق یہ ہے کہ اس سے اِکتسابِ فیض اور رہنمائی لینے سے پہلے طے کر لو کہ اِس کلامِ ربانی میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہے اور یہ لا ریب کتاب ہے۔ اگر شک کرنا ہے تو یہیں سے واپس لوٹ جاؤ۔ اس لیے کہ یہاں کامل یقین کے ساتھ چلنا پڑے گا۔ اِس نکتے کو سمجھ لینے کے بعد زندگی میں اس چیز کا فیصلہ کر لیں کہ یا اِدھر ہو جائیں یا اُدھر ہو جائیں، اس لیے کہ ایمان کی زندگی اس کے بغیر شروع نہیں ہوسکتی، باقی سب کچھ تو ایمان کے تابع ہی ہے۔

اِس قرآنی اُصول سے رہنمائی لیتے ہوئے ہمیں اپنی تحریکی زندگی میں بھی یقین کی اس منزل کو پہنچنا ہے۔ اگر شک آلود ہو کر مشن میں قیادت بھی کرنا ہے، کارکن اور ممبر بھی رہنا ہے، مشن کی نمائندگی بھی کرنا ہے، تقریر بھی کرنا ہے، رائے بھی دینا ہے، مشاورت میں بھی حصہ لینا ہے تو اس انداز سے یہ سب کچھ ناکارہ ہے۔ تحریکی اور جماعتی زندگی میں اگر شک، وسوسے اور ریب کی گرد ہو تو یہ سب ناجائز ہے۔ یہ اصول ہمیں قرآن کی مذکورہ آیت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

اللہ رب العزت نے ابھی کتاب پڑھائی نہیں، احکامات و تعلیمات کا آغاز نہیں کیا مگر پہلے جملے میں ہی اس کتاب کے متعلق ریب اور شک کو اذہان سے نکالنے اور اس کتاب کے متعلق یقین کے درس پر مبنی تعلیم دی ہے۔ بندہ کہہ سکتا ہے کہ باری تعالیٰ! کم از کم سورۃ البقرہ اور سورۃ آلِ عمران تو پڑھ لینے دیتے؛ سورۃ المائدۃ یا دس، پندرہ، بیس، تیس سورتیں پڑھ کر، یا اختتام پر جا کر کہتا کہ یہ جو قرآن پڑھ چکے ہو اِس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔ اُس نے فرمایا: یہ نہیں ہو گا کہ سارا مضمون پڑھا کر آخر پر کہوں کہ جو اُتارا ہے اِس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ یہ سودا پہلے طے کرو کہ آئندہ جو کچھ تمہیں بتایا جانے والا ہے اور جو کچھ اس کتاب اور دین کی صورت میں تمہیں عطا کیا جائے گا، اس پر کامل یقین رکھو اور ہر قسم کے ریب و شک کی بنیاد مسمار کر ڈالو۔

تحریکی و جماعتی زندگی میں بھی یہی ہے کہ اگر شک کرنا ہے تو پھر جا کر اپنا کام کریں! اپنا روزگار کمائیں اور اللہ کے دین کی ویسے ہی خدمت کریں، جہاں سے صرف ڈھیروں ثواب ہی مقدر بنے، غریبوں کی اعانت کریں اور صوم وصلوٰۃ کی ادائیگی کریں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ شک بھی ہو اور اُس جماعت میں بھی کام کریں۔

ایمان کھلے یقین کا نام ہے اور کفر برملا انکار کا نام ہے جبکہ درمیان کی کیفیت کو شک کہتے ہیں۔ ایمان، دل اور زبان کی تصدیق و اقرار کا نام اور اس کے برعکس دل اور زبان دونوں سے انکار کرنا کفر ہے۔ اس اقرار اور انکار کے درمیان کیا ہے؟ یعنی زبان سے ماننا اور دل میں شک میں رہنا یہ کیفیت شک ہے اور اِسے نفاق کہتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں اپنے آپ کو نفاق کی دلدل سے نکالنا چاہیے۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ نزولِ قرآن کے اعتبار سے یہ قرآنِ مجید کی پہلی آیت نہیں بلکہ جو آیت سب سے پہلے نازل ہوئی وہ تو اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ہے۔ گویا نزولِ قرآن کی ترتیب کچھ اور تھی، مگر اُمت کو جب قرآن دیا جا رہا ہے، تدوین میں اسے پہلی آیت بنا دیا گیا تا کہ قانون اور ضابطہ بن جائے کہ جب کسی بڑے مقصد میں شامل ہوں تو سب سے پہلے شک کی گرد کو ہٹا کر داخل ہوں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ قرآن کا کام ہی ہدایت دینا ہے۔ قرآنِ پاک کو نازل ہی اس لیے فرمایا گیا کہ آپ کو ہدایت عطا فرمائے۔ قرآن سے بڑا سرچشمۂ ہدایت کائنات میں نہیں ہے، مگر جو کوئی اسے شک کے ساتھ پڑھے گا، اُسے یہ ہدایت کی دولت عطا نہیں فرماتا۔ جب مشکوک ذہنیت رکھنے والے شخص کو قرآن مجید ہدایت نہیں دیتا تو منہاج القرآن کی بھلا کیا مجال کہ اسے ہدایت دے؟ یہ اللہ کا کام ہے، مگر اس نے ایک فیصلہ کر دیا ہے کہ سب سے پہلے شک کی گرد کو اپنے قلب ونظر سے ہٹانا ہوگا۔ قرآن مجید کی شرط واضح ہے کہ جو شک کے ساتھ آئے گا اُسے یہ ہدایت نہیں دیتا۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ایک زمانہ گزر گیا مگر ہم اپنے من کو تلاش نہیں کر پائے۔ ہم شک و ریب میں رہتے ہیں۔ نتیجتاً تاثیر سے محروم رہتے ہیں۔

۱۸۔تحریک میں کارکن کا کردار

کسی بھی تحریک کی مثال انسانی جسم کی مانند ہوتی ہے اور اس کے عہدے دار اعضاء کی مانند ہوتے ہیں۔ اگر چہ جسم کے ارکان بیسیوں ہوتے ہیں مگر سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف ایک عضو یعنی دماغ کے پاس ہوتا ہے۔ باقی تمام اراکین کو حکم ہے کہ دماغ جو فیصلہ کرے تم نے اس پر عمل کرنا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ کہ آنکھ دیکھ تو سکتی ہے مگر سوچ نہیں سکتی۔ کان سن تو سکتے ہیں مگر سوچ کر فیصلہ نہیں کر سکتے۔ دیکھنا آنکھ نے ہی ہے، سننا کان نے ہی ہے، یہ اپنا دیکھا اور سنا ہوا عقل کو پہنچا دیں گے اور ان کا کام یہیں ختم۔ آگے دماغ کا کام ہے کہ وہ ان کے دیکھے اور سنے پر کیا فیصلہ کرتا ہے۔ اسی طرح زبان چکھ تو سکتی ہے مگر فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ ہاتھ چُھو تو سکتا ہے مگر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ناک سونگھ سکتا ہے مگر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر جسم میں سوئی چبھ جائے تو وہ عضو اس درد کو محسوس نہیں کر سکتا، اس لیے کہ اسے درد محسوس کرنے کی اجازت نہیں ہے، جب تک عقل فیصلہ نہ کرے کہ فلاں جگہ درد ہو رہا ہے۔ اگر اس جسم کو anesthesia کے انجکشن لگائیں تو دماغ اپنی سوچ کا عمل معطل کر دے گا۔ وہ جسم جو سوئی چبھنے پر چیخ اُٹھتا تھا، اب اُس کا سارا پیٹ بھی چیرا جا رہا ہو، آپریشن ہو رہا ہے مگر اب تو نہ وہ چیختا ہے، نہ ہی روتا ہے اور نہ ہی درد کو محسوس کرتا ہے۔ کہاں گیا اس کا درد؟ کہاں گیا اس کا اِحساس؟ اور کہاں گیا اس کا چیخ اُٹھنا؟ یہ سب کچھ دماغ کے سبب تھا۔ دماغ جس کے پاس سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار تھا، وہ بتاتا تھا کہ درد ہو رہا ہے تو جسم محسوس کرتا تھا، اب جبکہ دماغ ہی سو گیا ہے، anesthesia انجکشن کے ذریعے اس کا نظام معطل ہو گیا ہے، لہٰذا سارے اعضاء (کارکنان) اپنی اپنی حس سے فارغ ہو گئے۔

یاد رہے کہ صرف دماغ کو ہی فیصلے کا حق دیا گیا ہے۔ وہ اپنے اعضاء سے مشاورت کے بعد جو فیصلہ صادر کرے گا، جسم کی جماعت کا ہر رکن بغیر سوچے سمجھے اس فیصلے کی تعمیل کے لیے چل نکلے گا۔ پاؤں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ حکم آ جائے کہ چلو اور وہ کہے کہ یہ چلنے کا مناسب وقت نہیں ہے۔ اگر ہر ایک عضو کو فیصلے کا اختیار دے دیا جاتا تو انسانی جسم تباہ و برباد ہو جاتا اور

کوئی عمل ممکن نہ رہتا۔ ایک پاؤں کہتا میں چلتا ہوں تو دوسرا کہتا میں نہیں چلتا۔ ہاتھ کو حکم ہوتا کہ اسے پکڑ لو، ایک ہاتھ کہتا کہ میں پکڑتا ہوں دوسرا ہاتھ کہتا کہ میں تو نہیں پکڑتا۔ دماغ، زبان کو کہتا کہ کہ چکھ لو، زبان کہتی کہ یہ تو کڑوا ہے میں اسے کیوں چکھوں؟ اگر ایسا ہوتا تو پھر نظام کیسے چلتا؟ اگر ہر کوئی سوچنے لگے اور فیصلے کرنے لگے تو نظام کسی بھی صورت نہیں چل سکتا۔

عقیدۂ توحید سے بھی اس امر کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب عقیدہ توحید کی بنیاد رکھی کہ صرف ایک خدا ہے، دوسرا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ تو سوال پیدا ہوا ہے کہ معاذ اللہ کیا اُسے دوسرے خدا سے خطرہ تھا؟ کیا اس نے توحید کا عقیدہ کسی خوف اور ڈر سے دیا اور – معاذ اللہ، استغفر اللہ – اسے کوئی ڈر تھا؟ کیا اس کی خدائی کو کوئی چیلنج کر سکتا تھا۔ نہیں! ہرگز نہیں! تو پھر اس نے توحید کا تصور کیوں دیا؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا.[1]

اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا اور (بھی) معبود ہوتے تو یہ دونوں تباہ ہو جاتے۔

یہاں اللہ رب العزت نے فرمایا: مجھے کسی سے خطرہ نہیں اور نہ ہی کوئی میری خدائی کو چیلنج کر سکتا ہے مگر اس طرح ہونے سے نظام نہ چلتا۔ اگر میرے سوا اور خدا بھی ہو جائیں تو زمین و آسمان ٹکرا جائیں۔ ایک کہتا کہ آج میں سورج کو مغرب کی طرف سے نکالنا چاہتا ہوں، دوسرا کہتا کہ مشرق سے طلوع ہوگا۔ ایک کہے کہ آج میرا جی چاہ رہا ہے کہ رات کو سولہ گھنٹے کی کر دوں، دوسرا کہے کہ میں تو چار گھنٹے کی کروں گا۔ فرشتہ جان لینے کے لیے پہنچے تو ایک رب کہے کہ جان لے لو اور دوسرا کہے کہ نہیں اسے دو سال تک مہلت دے دو۔ گویا اللہ رب العزت نے واضح فرمایا کہ کائنات کا یہ نظام اس وقت تک چل نہیں سکتا، جب تک فیصلہ ایک جگہ پر نہ ہو۔ اگر کئی پروردگار ہوتے تو سورج و چاند اور زمین و آسماں باہم ٹکرا جاتے۔ لہٰذا تحریکوں کی زندگی میں اسی بنیادی اصول کو سمجھایا گیا ہے اور اس کی روشنی میں اپنے معاملات کو آگے بڑھانے کا

---

(۱) الأنبياء، ۲۱:۲۲

حکم ہوتا ہے۔

اِس مثال سے سمجھانا مقصود یہ ہے کہ کارکنوں کا کام حکم کی تعمیل ہوتا ہے۔ ملکی سطح پر اس کی مثال دیکھنا چاہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ نتائج پیدا کرنے میں فوج سب سے اعلیٰ ادارہ ہے۔ اگر وہ ملکی حالات و واقعات کے تناظر میں عنانِ اقتدار سنبھال لے تو کوئی بھی اسے ہٹا نہیں سکتا۔ سیاسی جماعتوں کے اقتدار مختلف طریقوں سے ختم کیے جاسکتے ہیں مگر فوج سے اقتدار واپس لینا انتہائی مشکل اَمر ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ فوج ایک طاقت ور ادارہ ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اس کو طاقت ور کس نے بنایا؟ ان کے ہاں ایک تھنک ٹینک ہے۔ اُس اعلیٰ سطح پر سوچ بچار ہوتی ہے اور وہیں فیصلے کیے جاتے ہیں۔ بعد ازاں ان کے کیے گئے فیصلہ کا اطلاق اوپر سے لے کر نیچے تک ہوتا ہے۔ فوج میں ہر کوئی سوچتا نہیں بلکہ صرف عمل کرتا ہے۔ فیصلہ چاہے درست ہو یا غلط ہر کوئی اس پر بحث نہیں بلکہ عمل درآمد کرتا ہے۔ حکم ملتا ہے کہ اس محاذ پر پیش قدمی کرو، وہ یہ نہیں پوچھتے کہ کمانڈر صاحب اس سے بہتر ہماری سمجھ میں دوسرا محاذ بھی ہے، اُس محاذ پر دشمن کی طرف پیش قدمی کرنا اِس محاذ سے بہتر ہے۔ وہ اس طرح کی بحث میں نہیں پڑتا بلکہ بلا چون و چرا حکم پر عمل کرتا ہے اور کب، کیوں اور کیسے کا راگ نہیں الاپتا۔ گویا وہاں منصوبہ بندی کا ایک مقام اور سطح ہے۔ ان امور پر وہاں باقاعدہ ایک مجلس شوریٰ ہوتی ہے۔ وہ چاہے کور کمانڈر ہوں یا جنرلز کی اپنی باڈیز ہوں۔ ان کا اپنا نظام ہے، ایک سطح پر سوچ بچار ہوتی ہے اور اُس سوچ بچار کے لیے وہ نچلی سطح سے بھی درجہ بدرجہ فیڈ بیک لیتے رہتے ہیں۔ اُن پر واجب نہیں کہ سپاہیوں کو بھی اپنے فیصلوں سے آگاہ کریں۔ اگر وہ خفیہ معلومات بھی عام سپاہیوں کو بتانا شروع کر دیں تو ملک کا دفاع خطرے میں پڑ جائے گا۔

تحریک کا نظم و ضبط (descipline) فوج سے بھی زیادہ سخت ہونا چاہیے۔ اگر آپ مصطفوی انقلاب بپا کرنا چاہتے ہیں تو مشاورت کے بعد جب فیصلہ اوپر سے مقامی سطح تک پہنچے تو کارکنان اس پر عمل درآمد کرتے ہوئے فوری طور پر متحرک ہو جائیں۔ جاں باز سپاہیوں کی طرح میدان میں اترتے ہوئے تن من دھن کی بازی لگا دیں اور اپنا وقت، دماغ، توانائیاں بحث و تمحیص اور تکرار میں ضائع نہ کریں۔ گویا فیصلے کا اپنا ایک طریقہ ہوتا ہے، ایک مشاورت

ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ ہمیں دین سے ہی میسر آتا ہے۔

اگر تحریک منہاج القرآن، پاکستان عوامی تحریک اور مصطفوی انقلاب کے مشن سے نتائج لینے ہیں اور منزل کی طرف بڑھنا ہے تو کارکنان اپنے آپ کو جسم کے اَعضا کی مانند رکھیں، رائے اور مشاورت میں ضرور شریک ہوں، مگر عقل کی مانند مرکز کے فیصلہ کو ہی بلا چون و چرا حتمی و قطعی تسلیم کریں۔ وہ کارکنان جو مرکز کا فیصلہ آ جانے کے بعد بھی اپنے حلقوں میں گفت گو اور بحث و تکرار کرتے ہیں، وہ بلا شبہ نیک نیتی اور مشن کی بہتری کے لیے کرتے ہوں گے مگر اس سے مشن کی خدمت اور ترقی نہیں ہوتی۔

۱۹۔ قیادت کے درجات

نظامِ قدرت کے مطابق قیادت کے تین درجات ہیں:

۱۔ اُولی الامر

۲۔ مجلسِ شوریٰ

۳۔ کارکن

ایک نظامِ قیادت امارت ہے۔ اسے اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کہتے ہیں، جس کا اشارہ قرآن مجید میں بھی ہے:

اَطِیْعُوا اللهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ.(۱)

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اوراپنے میں سے (اہلِ حق) صاحبانِ اَمر کی۔

۱۔ تمہارے قائد، امیر اور رہنما ہیں، ان کی اطاعت کرو۔ قیادت کا کام فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔

---

(۱) النساء، ۴:۵۹

۲۔ قیادت کی ایک مشاورتی ٹیم ہوتی ہے جیسے حضور نبی اکرم ﷺ کی بھی ایک شوریٰ تھی۔ اسی طرح حضور ﷺ کے عمل کی اقتداء میں چاروں خلفاے راشدین کی بھی ایک شوریٰ تھی۔ مہاجرین و انصار کی بھی ایک شوریٰ تھی۔ شوریٰ کا بنیادی کام رائے اور مشاورت میں شریک ہونا ہوتا ہے۔ قائد کا کام ان سے مشاورت کر کے حتمی فیصلہ دینا ہے۔

۳۔ بقایا لوگوں کی حیثیت کارکن کی مانند ہوتی ہے۔ تمام صحابہ کرام ﷺ جو کارکنان کی طرح مصطفوی مشن میں شریک تھے ان سے جب کسی مسئلہ پر پوچھا جاتا تو وہ شوریٰ کو feed back بھیج دیتے، اس سے زائد ان کا کوئی اور کام نہیں ہوتا تھا۔ مشاورت کے بعد جب فیصلہ آ جاتا تو تمام کارکن صحابہ کرام ﷺ اس فیصلے پر گفت گو کیے بغیر اس حکم کو اُولی الامر کا فیصلہ سمجھ کر تکمیل کے لیے نکل پڑتے تھے۔ یہ وہ نظام ہے جس سے اسلام کی تحریک چلی اور اسی سے باقی تحریکیں بھی چلتی ہیں۔

کوئی بھی جماعت - خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی یا فوج کا شعبہ ہو - اگر discipline کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے تو اپنی افادیت کھو دیتا ہے اور ان کی کوششیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ نتیجتاً وہ اپنی منزل کو پانے میں ناکام ہوتی ہیں۔ کیونکہ اس طرح سے کارکن کا قیادت سے رشتہ کٹ جاتا ہے۔ اگر فیصلے discipline کے مطابق ہونے لگیں، نظام میں یکسوئی قائم رہے تو جو توانائیاں بحث و تمحیص میں ضائع ہوتی ہیں، ان سے بچا جا سکتا ہے۔ توانائیوں کو مجتمع کر کے تعمیر پر خرچ کیا جائے اور نتائج پر تن من دھن لگایا جائے تو جلد منزل مل جاتی ہے۔

اگر لوگ اپنے اپنے کام صدق و اخلاص سے کرنے لگیں اور دوسرے کے فرائض کو اپنا فریضہ نہ بنائیں تو اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ کام کی رفتار تیز ہو جائے گی اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح فکری پراگندگی بھی ختم ہو جائے گی۔

۲۰۔ صحابہ کرام ﷺ کا شعار اِطاعت ہے

آیئے! اب ان تمام چیزوں کا عملی مظاہرہ حضور ﷺ کی سنت اور صحابہ کرام ﷺ کے

عمل سے دیکھتے ہیں کہ آقا ﷺ نے ہمیں اس بابت کیا سنت دی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہمیں کیا اُسوہ دیا۔

یومِ عرفہ ۹ ذی الحج کا دن، حج کا موقع ہے اور آقا ﷺ سوا لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عظیم مجمع سے انقلاب آفریں خطاب فرما رہے ہیں۔ ان مقدس لمحات میں شمعِ رسالت ﷺ نے اپنے اردگرد منڈلاتے پروانوں سے استفسار کیا:

أَيُّ يَوْمٍ هٰذَا؟

یہ کون سا دن ہے؟

آقائے دو جہاں ﷺ کے اس سوال کا سادہ سا جواب ہے کہ حضور! آج یوم العرفہ ۹ ذوالحج ہے۔ آقا ﷺ نے جب یہ استفسار کیا تو وہاں سوا لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے، ان میں سے کسی کا کوئی جواب نہ آیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سوال کا جواب معلوم ہے، مگر سب خاموش ہیں۔ یہ تربیتِ مصطفیٰ ﷺ کا عملی اظہار ہے۔ سوا لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا:

اَللهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ.

اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔

آقا علیہ السلام نے شہر مکہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

أَيُّ بَلَدٍ هٰذَا؟

یہ کون سا شہر ہے؟

جواب تو یہ بنتا ہے کہ حضور! یہ مکہ مکرمہ ہے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پھر عرض کیا:

اَللهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ.

اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد آپ ﷺ نے پھر پوچھا:

أَيُّ شَهْرٍ هٰذَا؟

یہ کون سا مہینہ ہے؟

نہ دو مہینے تھے، نہ ہی دو شہر تھے اور نہ ہی دو دن تھے کہ مغالطہ لگنے کا احتمال ہوتا۔ ہر ایک کو معلوم تھا کہ ذوالحج ہے مگر صحابہ کرام ﷺ نے جواب دیا:

اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ.(۱)

اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔

یہ ادبِ مصطفیٰ ﷺ کی انتہا ہے۔ ادب اور نسبت کی ساری حدیں یہاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اطاعت کی تعمیل کیسے ہوتی ہے، صحابہ کرام ﷺ کے اس ایک عمل نے اس کو واضح کر دیا اور ایک نمونۂ عمل عطا کر دیا۔ اطاعت و فنائیت کے اس اظہار پر کائنات کی ساری مثالیں قربان ہو جائیں۔ یہ فنائیت کی انتہاء ہے، یہ فنائے تام ہے۔

برکت، فیض اور خیر کے حصول نیز تحریک کی کامیابی، بہتر حکمت عملی کا یہ ایک انمول درس ہے۔ تحریک کو ایک نئے دور میں داخل کر کے نئی تنظیمی حکمت عملی کے مطابق مصطفوی انقلاب کی منزل تک پہنچنے کے لیے تربیت کے اس نکتے پر چلنا ہوگا اور تب جا کر ہم انقلاب کی

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الحج، باب الخطبة أيام منى، ۲:۶۲۰، رقم:۱۶۵۴

۲۔ ایضاً، کتاب العلم، باب قول النبي ﷺ: رُبَّ مبلغ أوعى من سامع، ۱:۳۷، رقم:۶۷

۳۔ ایضاً، کتاب العلم، باب لیبلغ العلم الشاهد الغائب، ۱:۵۱، رقم:۱۰۴

۴۔ ایضاً، کتاب المغازي، باب حجة الوداع، ۴:۱۵۹۹، رقم:۴۱۴۴

۵۔ مسلم، الصحیح، کتاب القسامة والمحاربین والقصاص والدیات، باب تغلیظ تحریم الدماء والأعراض والأموال، ۳:۱۳۰۵–۱۳۰۶، رقم:۱۶۷۹

منزل تک پہنچیں گے۔ ہمیں سنتِ رسول ﷺ اور سنتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔

راوی صحابی کہتے ہیں کہ ہمیں علم تھا کہ یہ شہر مکہ ہے، مگر معلوم نہیں تھا کہ حضور ﷺ کا منشا کیا ہے اور آپ ﷺ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اگر ہم اپنے علم سے کہہ دیتے کہ یہ شہرِ مکہ ہے اور حضور ﷺ ہمارا جواب سن کر فرما دیتے کہ نہیں، یہ مکہ نہیں بلکہ مدینہ ہے، تو خدا کی قسم ہم ایمان و اطاعت میں اس مقام پر تھے کہ ہم مکہ کو مدینہ مان لیتے۔ اگر ہم کہہ دیتے کہ حضور! یہ ذو الحج کا مہینہ ہے اور حضور ﷺ فرما دیتے کہ نہیں، یہ ذو الحج نہیں بلکہ محرم ہے؛ تو خدا کی قسم! ہم اسی کو محرم تسلیم کر لیتے۔ اگر ہم کہہ دیتے کہ یارسول اللہ! یہ ۹ ذو الحج ہے اور آپ ﷺ فرما دیتے کہ نہیں، یہ ۱۲ ذوالحج ہے؛ تو خدا کی قسم ہم ویسے ہی مان لیتے جیسے حضور ﷺ فرما دیتے۔ ہم سمجھتے کہ ہماری سمجھ کی غلطی ہے۔

گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کی اطاعت میں اپنے علم کی ہی نفی کر دی اور **اَللهُ وَرَسُولُهٗ أَعْلَمُ** کہہ کر حضور نبی اکرم ﷺ کی منشاء و رضا کے طالب رہے۔

جب ایسی فنائیت، ایسی اطاعت اور تسلیم ہو تو پھر کہیں جا کر جان نثار کارکن بنتا ہے۔ جب نسبت پیغمبر کی ذات سے ہوتی ہے تو ایمان اور کفر کا درجہ اونچے درجے میں آ جاتا ہے، جیسے جیسے نیچے آتے چلے جائیں تو تقویٰ و وحدت کا روشن اصول ایک ہی رہتا ہے۔ جو آقا ﷺ کی مشاورت میں بیٹھے وہ حضور ﷺ کی سنت کے متبع ہو گئے اور وہ صحابہ تھے، پھر صحابہ کرام کے متبع تابعین بنے، صحابہ کرام کا رویہ یہ تھا کہ وہ فیصلوں پر پہلے اور نہ ہی بعد میں بحث کرتے تھے۔ فیصلے سے پہلے مشاورت اہل شوریٰ کا حق ہے۔ باقی ہزار ہا صحابہ کرام کا کردار یہ تھا کہ سرکارِ مدینہ ﷺ کا جو بھی فیصلہ آتا وہ اس کی من وعن تعمیل کرتے۔ اس طرزِ عمل کو اپنانے سے کام میں خیر، برکت، تسلسل اور سرعت و تیزی نصیب ہوتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اللہ کے فضل اور برکت سے نتائج بھی پیدا ہوتے ہیں۔

۲۱۔ حالات بدلنے سے حکمتِ عملی بدل جاتی ہے

انبیا کرام علیہم السلام کی مقدس زندگیوں سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ ہر پیغمبر نے اپنی امت کی اصلاح اور ان کے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے جب آوازِ حق بلند کی تو اس دور کے وڈیروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور طاقت ور طبقات نے ہمیشہ پیغمبرانہ جدوجہد کی مخالفت کی۔ طاقت ور طبقات کبھی بھی انقلاب نہیں چاہتے اور وہ ہمیشہ اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔ وہ خود کو ہر طرح سے منظّم (maintain) کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وقت آنے پر اپنے تمام اختلاف بھلا کر جتھے کی طرح ایک ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس غریب اور کمزور طبقات ہمیشہ ہر پیغمبر کی صداے اِنقلاب پر لبیک کہتے رہے۔

اگر سیدنا نوح علیہ السلام سے لے کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور پھر سیدنا ہود علیہ السلام، سیدنا یوسف علیہ السلام، سیدنا صالح علیہ السلام، سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تک انسانی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تمام پیغمبروں نے اپنی اپنی بعثت کے مقاصد کے حوالے سے جو جد و جہد اور اصلاح کی تحریک بپا کی، سوسائٹی میں انقلاب اور تبدیلی کے لیے اٹھے تو اس وقت کے حالات کے تناظر میں وہ اپنی منصوبہ بندی میں strategic تبدیلیاں بھی اَمرِ اِلٰہی سے کرتے رہے۔

یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ کسی بھی تحریک کا ایک مقصد اور منزل ہوتی ہے۔ پھر اس منزل کو حاصل کرنے کے لیے بنیادی عقائد، تعلیمات اور اساسی نظریات و افکار ہوتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں بنیادی ڈھانچہ ہوتی ہیں۔ یہ وہ بنیادی ستون ہوتے ہیں جن پر ان کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ انہیں fundamentals کہتے ہیں، جیسے اسلام کے اَرکانِ خمسہ ہیں۔

الغرض مذہبی، سیاسی، معاشی، اقتصادی یا ثقافتی، علمی یا کوئی بھی میدان ہو ان سب کے fundamentals ہوتے ہیں۔ وہ A، B، C، D اور ا، ب، ج، د کی طرح بنیادی حروف ہوتے ہیں، ان میں کسی بھی صورت تبدیلی کی اجازت نہیں ہوتی۔ جیسے اسلام کے اندر دو مصادر اور ماخذ ہیں:

۱۔ قرآن

۲۔ سنتِ نبوی

جو احکام متن میں آ جاتے ہیں، ان میں کبھی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہوتی، اُنہیں ساری امت مل کر بھی نہ منسوخ کر سکتی ہے اور نہ ہی تبدیل کر سکتی ہے۔ دنیا کے کسی بھی عالم دین سے پوچھیں کہ شریعت اور فقہ اسلامی میں کتنے مصادر اور مآخذ ہیں؟ اس ضمن میں ہر کوئی بتائے گا کہ چار ہیں۔ پہلے دو مصادر بدلے نہیں جا سکتے اور وہ قرآن و سنت ہیں، کیونکہ ان کی بنیاد وحیِ الٰہی پر استوار ہے۔ یاد رہے کہ جو احکام وحی پر مبنی ہوں ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد دو مصادر اور ہیں جو قرآن و سنت سے روشنی اور رہنمائی لے کر یا ان سے اخذ کر کے حاصل کیے جاتے ہیں:

۱۔ اجماع

۲۔ قیاس

جسے اللہ رب العزت کی جانب سے علمی قیادت و بصیرت حاصل ہوتی ہے، وہ علم کی دنیا میں اُولوا الامر ہوتے ہیں، ائمہ و مجتہدین ہوتے ہیں، امت کے رہبر اور رہنما ہوتے ہیں۔ یہ لوگ قرآن و سنت کی روشنی میں اجتہاد کرتے ہیں۔ اجتہاد پر سارے متفق ہو جائیں تو وہ اجماع بن جاتا ہے۔

جب اُمت کے سارے یا اکثر فقہاء متفق نہ ہوں، مجتمع نہ ہوں تو کسی عالم کی ذاتی تحقیق و اجتہاد ہو تو اسے قیاس کہتے ہیں۔ قیاس بھی شریعت اسلامیہ میں حجت، دلیل اور اتھارٹی ہوتا ہے۔ یہ اجتہاد کبھی قیاس کی شکل میں ہوتا ہے، امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاں 'اِستحسان' بھی اس کی ایک شکل ہے۔ امام مالک رضی اللہ عنہ کے ہاں مزید ایک شکل 'مصالح مرسلہ' کی نکلتی ہے۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ کے ہاں مزید ایک شکل 'استحقاق' کی نکلتی ہے۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے ہاں مزید ایک شکل

'استملاح' کی نکلتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ کبھی کئی احکام شریعت میں عرف و عادت بھی بطور ثبوت ہوتا ہے۔

علی ہٰذا القیاس قرآن و سنت کے متن کے بعد مزید بارہ (۱۲) مآخذ اور مصادر ہیں جن کے ذریعے اسلام کا فکری سرمایہ امت کی رہنمائی کے لیے تشکیل پاتا ہے۔ قرآن و سنت اور ان بارہ کو ملا کر کل چودہ (۱۴) بن جاتے ہیں جن سے دین کی فقہی و قانونی اور عملی رہنمائی ملتی ہے۔ یہ امت کے لیے سرمایۂ ہدایت ہیں۔ اس میں ائمہ آپس میں اختلاف کرتے ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ نے اور بات کہی، امام مالک، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی نے کچھ اور بات کہی ہے۔ اب اس کی چند مثالوں کا مطالعہ قرآن و سنت کی روشنی میں کرتے ہیں:

۱۔ نماز کی اہمیت اور فضیلت پر امت میں کوئی اختلاف نہیں مگر امام ابو حنیفہ نے کہا کہ پہلی رکعت میں اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ اُٹھائے جائیں اور پھر سلام پھیرنے تک ہاتھ نہ اٹھائے جائیں جب کہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل سب نے کہا کہ بعد میں بھی ہاتھ اٹھائیں گے۔ اس طرح نماز پر اختلاف نہیں بلکہ اس کی ادائیگی پر فرق آیا۔ ہر ایک کے پیروکاروں کو کہا کہ آپ اپنے اپنے امام کی پیروی کریں۔ فقہ جعفریہ میں بھی رفع یدین آ گیا، ان میں بھی امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے مختلف موقف سامنے آیا۔ یہ عمل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ جب حالات بدلتے ہیں تو کئی بار احکام بھی بدل جاتے ہیں۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ شریعت اسلامیہ ایسے مواد سے بھری پڑی ہے کہ ایک وقت میں ایک حکم تھا، حالت تبدیل ہوئی تو فقہاء نے حکم بھی بدل دیا۔

۲۔ چند ایک نہیں بلکہ ہزار ہا بنیادی مسائل ایسے ہیں۔ حضور ﷺ کے زمانے میں قرآن کتابی شکل میں لکھا ہوا نہیں تھا، حفاظ شہید ہونے لگے تو کہا گیا کہ قرآن کو کتابی صورت میں یک جا کیا جائے۔ کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ جو حضور ﷺ کا طریقہ تھا وہی رہے گا، لیکن کچھ نے کہا: نہیں، حالات بدل چکے ہیں اس کو محفوظ کر لینا چاہیے۔ یہ تبدیلی دراصل ایک تسلسل ہے۔ حالات کے بدلنے سے اس حکم کی روشنی میں جو تبدیلی لائی جاتی ہے، وہ تبدیلی انحراف نہیں

بلکہ اصل کے ساتھ ایک تسلسل ہوتا ہے۔ آقا ﷺ کی اپنی حیاتِ طیبہ بھی اس نظام سے اور ایسے عمل سے معمور ہے۔

۳۔ قرآن و حدیث میں بھی ناسخ اور منسوخ ہوتے ہیں۔ ایک وقت کے تقاضے کے مطابق اللہ تعالیٰ ایک آیت اتارتا ہے۔ جب وہ تقاضے تبدیل ہو جاتے ہیں تو نئی آیت اترتی ہے، جو پہلے حکم کو منسوخ کر کے نیا حکم نافذ کر دیتی ہے۔ اللہ کے احکام میں بھی ایک تدریج ہے۔ حکم میں تبدیلی آ جاتی ہے، مگر اسے انحراف نہیں کہتے، بلکہ یہ تبدیلی تسلسل کا حصہ ہوتی ہے۔ جب حالات اور اس کے تقاضے بدل جائیں تو بدلے ہوئے حالات میں پچھلی ہی strategy کو برقرار رکھنا اللہ کی سنت کے بھی خلاف ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کی بھی سنت کے خلاف اور اسلام کے بھی مزاج کے خلاف ہے۔ اسلام میں ناسخ ومنسوخ کا فلسفہ ہی یہی ہے۔

۴۔ اسی طرح حدیث میں بھی نسخ ہے۔ ایک وقت میں آقا ﷺ نے فرما دیا کہ کوئی قرآن کے سوا میری کسی حدیث کو مت لکھے۔ خبردار! قرآن کے سوا کچھ نہ لکھا جائے۔[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صرف سنتے اور یاد رکھتے۔ پھر ایک وقت آیا اور فرمایا: اب حالات بدل گئے ہیں، جو چیز میں چاہتا تھا کہ اس مقام پر پہنچ جاتے، اب وہ مرحلہ گزر گیا۔ لہٰذا اب اجازت ہے کہ جو میری زبان سے بات نکلے اسے لکھ لیا کرو۔[2]

اس میں حکمت یہ تھی کہ قرآن اور حدیث میں خلط ملط نہ ہو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب گھر جا کر دیکھیں تو کچھ پتہ نہ چلے کہ قرآن کیا ہے؟ یا حدیث کیا ہے؟ بعد ازاں چونکہ ان کے مابین امتیاز کا شعور پیدا ہو گیا تھا، لہٰذا اجازت دے دی کہ قرآن کو بھی لکھتے رہا کرو اور حدیث کو

---

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۱۲ رقم: ۱۱۱۰۰
۲۔ حاکم، المستدرك، ۱: ۲۱٦ رقم: ۴۳۷

(۲) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۱٦۲، ۱۹۲، رقم: ٦۵۱۰، ٦۸۰۲
۲۔ أبو داؤد، السنن، کتاب العلم، باب في کتابة العلم، ۳: ۳۱۸، رقم: ۳٦۴٦

بھی تحریر کرو۔

۵۔ اسی طرح آقا ﷺ نے فرمایا: کہ خبردار! کوئی قبروں کی زیارت کو نہ جائے۔ منع فرما دیا، لیکن ایک وقت آیا جب اسلام پھیل گیا تو آقا ﷺ نے خود فرمایا:

نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا.[1]

یعنی لوگو! تمہیں یاد ہے کہ میں تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا، آج سے قبروں کی زیارت کیا کرو کہ اِس سے آخرت یاد آتی ہے۔

حدیث میں ناسخ و منسوخ دونوں ہی آ گئے۔

٦۔ اوائل وقت میں آقا ﷺ ہر رکعت میں رفع یدین فرماتے تھے، رکوع میں جاتے، کھڑے ہوتے، سجدے میں جانے سے پہلے رفع یدین فرماتے۔ پھر ایک وقت آیا اور فرمایا: اب ہر وقت ہاتھ نہ اٹھایا کرو، پہلی بار ہاتھ اٹھانا پوری نماز کے لیے کافی ہے۔ گویا حالتِ نماز میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔[2]

نماز اللہ کی عبادت ہے۔ اس کا final model پہلے دن ہی دیا جانا چاہیے تھا۔ اس میں بھلا تبدیلیوں کی کیا ضرورت تھی؟ یاد رکھیں کہ جس چیز میں تحرک ہوتا ہے، اس میں فعالیت ہوتی ہے، اُس چیز کو آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ چونکہ حالات کے ساتھ ساتھ تقاضے بھی بدل رہے

---

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، باب بيان ما كان من النهي عن أكل لحوم الأضاحي بعد ثلاث، ۳: ۱۵۶۳، رقم: ۱۹۷۷

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱: ۱۴۵، رقم: ۱۲۳۵

(۲) ۱۔ بخاری، الصحيح، كتاب صفة الصلاة، باب إتمام التكبير فی السجود، ۱: ۲۷۲ رقم: ۷۵۳

۲۔ مسلم، الصحيح، كتاب الصلاة، باب إثبات التكبير فی كل خفض ورفع فی الصلاة، ۱: ۲۹۵ رقم: ۳۹۳

۳۔ أحمد بن حنبل فی المسند، ۴: ۴۴۴

ہوتے ہیں، لہٰذا حالات کے بدلنے کے ساتھ احکامات بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ تحرک نام ہی اسی چیز کا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ حکم بھی تبدیل ہوتا جائے۔ سوائے اُس اصل کے جس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے برقرار رکھا ہو۔

۸۔ ابتداء میں لوگ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے، وقت آیا تو روک دیا گیا اور فرمایا: اب امام صاحب کا پڑھنا ہی کافی ہے، پیچھے مقتدی مت پڑھا کریں۔[1]

یہ تو چند ایک نمونے دیے ہیں۔ متعدد احادیث اور آثارِ صحابہ، اَفعالِ صحابہ، فتاویٰ صحابہ رضی اللہ عنہم اس پورے حکم پر ہیں جس کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جس کا کوئی بھی فرد - جسے شریعت کا تھوڑا سا بھی علم اور مہارت ہے - انکار نہیں کر سکتا۔ اب تک یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جب عمل آگے آگے بڑھتا ہے تو تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

۲۲۔ حکمتِ عملی کی تبدیلی مقصد سے اِنحراف نہیں کہلاتی

آپ تحریک چلا رہے ہیں اور مشن کے ساتھ چل رہے ہیں، آپ تحرک والی زندگی میں ہیں، جامد زندگی میں نہیں۔ جب ماحول بدلتا ہے تو حالات اور factors بھی بدلتے ہیں۔ اگر آپ آنکھیں بند کر کے چلیں گے تو کبھی بھی متحرک اور فعال نہیں رہ سکتے اور آپ کو پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔ لہٰذا حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اساسی احکام کو چھوڑ کر اس کے نیچے جتنے احکام ہوتے ہیں یعنی تشریحی چیزیں اور پالیسیاں وقت کے ساتھ تبدیل کرنا پڑتی ہیں۔ یہ نکتہ سمجھنے والا ہے کہ یہ تبدیلی ہوتی ہے، انحراف نہیں ہوتا اور یہ تبدیلی بھی تسلسل ہی کا حصہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی ذہنی طور پر تبدیلی اور انحراف کا فرق نہ کر سکے تو وہ تبدیلی نہ کہے بلکہ تسلسل کہے۔

---

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب سجود التلاوة، ۱: ۴۰۶ رقم: ۵۷۷

۲۔ نسائی، السنن، كتاب الافتتاح، باب ترك السجود فی النجم، ۲: ۱۶۰ رقم: ۹۶۰

۳۔ نسائی، السنن الكبرى، ۱: ۳۳۱ رقم: ۱۰۳۲

اس پر فقہاء کرام اور ائمہ مجتہدین نے بحثیں کی ہیں، کتابیں لکھی ہیں اور کہا ہے کہ تبدلِ اَحکام کو تبدیلی بھی نہ کہو۔ حکم بدل گیا ہے مگر فرمایا کہ تبدیلی بھی نہ کہو کیونکہ یہ پچھلے حکم کا تسلسل ہے۔

تحریکی زندگی، پیغمبرانہ و نبوی زندگی اور اُمت کی زندگی میں بڑھوتری (development) ہوتی رہتی ہے اور حالات کے مطابق ناسخ اور منسوخ کا عملی نفاذ اور معطّلی کا عمل، تبدیلی کا عمل، تحرک کا عمل، تحرک اور فعالیت کی خاطر کرنا پڑتا ہے۔ اسے کبھی مقصد سے ہٹ جانا اور انحراف کرنا نہیں کہتے۔ جو اس کو انحراف قرار دے، دراصل وہ ایک فتنہ پیدا کر رہا ہوتا ہے۔ کارکن کو یہ زیب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو اس فتنے کا شکار کرے۔

۲۳۔ یکسو ہو کر منزل کی جانب گامزن رہیں!

تحریکی رُفقاء و کارکنان متوجہ ہوں! اگر ہم پیکر ایثار و وفا بن جائیں اور اطاعت کے خوگر بن جائیں تو ہم پر اللہ کی خوش نودی اور اس کی عطاؤں کے باب کھل جائیں گے۔ آسمانوں سے اللہ کی رضا، مدد اور نصرت نازل ہوگی۔ جب ہمارے اندر اجتماعیت، قوت، وحدت اور یک جہتی ہوگی تو یہ سارے ذاتی دشمن جاگیردار، سرمایہ دار، بدعنوان عناصر اور بیوروکریسی سمیت کوئی بھی انقلاب کا راستہ نہیں روک پائے گا۔ محلے کے ایک چھوٹے سے بدمعاش سے لے کر پورا سامراج اس مصطفوی مشن کے خلاف ہے۔ ہماری مدد کرنے والا صرف اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہے۔ اس مددِ الٰہی کو مزید یقینی بنانے کے لیے شرط یہ ہے کہ ہم ایک ہو کر ایمان، یقین اور استقامت اور وفا کے پیکر بن کر چلیں۔

اپنی وحدت کو پارہ پارہ کرنے سے مصطفوی منزل کا حصول ناممکن ہو جائے گا۔ اپنے دل و جان کو ہر گندگی سے پاک کر کے آگے بڑھتے چلیں۔ اسلام کی تاریخ کو ہمیشہ سامنے رکھا کریں، کبھی یہ نہ سوچا کریں کہ ہم سینئر ہیں اور ہم پر نئے لوگ مسلط کر دیے گئے ہیں۔ آپ اپنے اندر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسا جذبہ پیدا کریں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سینئر تھے مگر گورنر کسی اور کو بنا دیا گیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سینئر تھے، کتبِ احادیث ان کی روایات سے بھری پڑی ہیں مگر ان کو کبھی گورنر یا قاضی نہیں بنایا گیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت

اُبی بن کعب ﷺ جیسے عظیم صحابہ کو کسی قسم کے کوئی سیاسی عہدے نہیں دیے گئے۔ حضرت ابو ایوب انصاری ﷺ میزبانِ مصطفیٰ ﷺ ہیں، وہ مدینہ سے استنبول کی جانب عام سپاہی بن کر چلے اور اسی حالت میں شہید ہو گئے۔

حضرت ابو ذر غفاری ﷺ نے سرکاری عہدے نہیں لیے۔ حضرت انس بن مالک، ابو درداء، سلمان فارسی، جابر بن عبد اللہ انصاری، قتادہ، براء بن عازب اور ابو سعید خدری ﷺ کو دیکھیں۔ المختصر کتنے ہزار صحابہ کرام ﷺ ہیں جنہوں نے اسلام کی علمی و فکری تشخیص اور نظریاتی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا۔ یہ شخصیات حدیثوں کو روایت کرنے والی، سنتیں بیان کرنے والی، لوگوں کے دین کی حفاظت کرنے والی، امت کو فقہ، قرآن اور تفسیر دینے والی، زہد و تقویٰ دینے والی مقدس ہستیاں اور سب سے افضل تھیں مگر ریاستی، سیاسی اور تنظیمی عہدے سونپنے کا وقت آیا تو اِن کو یہ ذمہ داریاں نہ سونپی گئیں بلکہ دیگر صحابہ کرام ﷺ کو مقرر کر دیا جاتا تھا۔ ان کے نفس اتنے پاک تھے کہ انہیں اس بات کا ملال نہ ہوتا تھا اور وہ عام کارکن بن کے کام کرتے رہتے تھے۔

انقلابیو! اگر آپ انقلاب کا سفر طے کرنا چاہتے ہیں تو اس عظیم کردار کو اپنانا ہوگا۔ تابعین میں حضرت حسن بصری، حضرت سفیان ثوری، حضرت مجاہد، حضرت ضحاک، حضرت عکرمہ، حضرت عبد اللہ بن مبارک اور دیگر کبار تابعین ﷺ کو دیکھیں۔ دین کی فکری، علمی، نظریاتی، اخلاقی، عملی اور تربیتی بنیادیں ان عظیم ہستیوں کے پاس تھیں۔ انہوں نے اپنے حصے کے کام کیے مگر کوئی بھی سیاسی و ریاستی عہدہ ان کے پاس نہ تھا۔

یاد رکھ لیں! مخلص کارکنوں کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ کسی بات پر رنجیدہ ہوں۔ ان کی نگاہ و نظر خدا اور مصطفیٰ ﷺ کی رضا پر اور مشن کی صداقت پر ہر حال میں برقرار رہتی ہے۔

ان عظیم اور روشن مثالوں کے بعد مزید کسی اور مثال کی ضرورت نہیں رہتی۔ صرف یہ امر دھیان میں رہے کہ ہم کس کے بندے ہیں؟ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر گواہی دیں اور سوچیں کہ ہم کس کے غلام اور نوکر ہیں؟ سب اس بات کا شعوری و زبانی اقرار کریں کہ اے اللہ اور

اس کے رسول! گواہ ہو جائیں کہ ہم آپ کے غلام ہیں۔ اس بات کا اقرار ہمیشہ ہماری زندگیوں میں شامل حال رہے کہ ہمیں صرف اللہ کی بندگی اور مصطفیٰ ﷺ کی غلامی کی طلب ہے۔ تاجدارِ کائنات ﷺ کی کملی کا سایہ اور اللہ رب العزت کی رضا ہمارا مطلوب و مقصود ہے۔ واللہ! کوئی بھی عہدہ اور منصب اس اعزاز سے بڑھ کر نہیں ہے۔

۲۴۔ اَہلِ یقین کی اِبتداء اِیمان اور اِنتہا اِیقان ہے

وسوسہ کے ساتھ جد و جہد کرنے والے کو کچھ حاصل نہیں ہوتا، چاہے کوئی زندگی بھر بھی لگا رہے۔ مشن کے لیے جو عرصہ گزارا، اگر وہ وسوسہ کے ساتھ تھا تو وہ سارا وقت اکارت گیا۔ یاد رکھیں کہ وسوسے سے سفر بھی طے نہیں ہوتا اور نہ ہی ہدایت ملتی ہے۔ اس ضمن میں چاہے جتنی مرضی جد و جہد کر لیں منزل یعنی ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ نیکیوں کا اجر و ثواب تو ملتا رہے گا، اللہ رب العزت ثواب کو رائیگاں نہیں جانے دیتا، مگر هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کا وعدہ حاصل نہیں ہوتا۔

اللہ رب العزت وسوسے والوں کو منزل تک نہیں پہنچاتا، کیونکہ یہ اُن کا حق ہی نہیں ہے۔ اس کا شیوہ یہ ہے کہ وہ یقین والوں کو ہی منزل تک پہنچاتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○[1]

اور اسی طرح ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمین کی تمام بادشاہتیں (یعنی عجائباتِ خلق) دکھائیں اور (یہ) اس لیے کہ وہ عین الیقین والوں میں ہو جائے ○

یعنی ابراہیم علیہ السلام کو بھی زمین و آسمان کی نشانیاں دکھانے کا مقصد اُنہیں یقین والوں میں سے کرنا تھا۔ اللہ رب العزت نے متقین کی تعریف کا آغاز يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (بن دیکھے ماننے) سے کیا اور اختتام وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ سے کیا۔ اللہ رب العزت نے یہ نہیں فرمایا کہ آخرت پر ایمان لاتے ہیں؟ بلکہ فرمایا: آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یقین کے لفظ کو شد و مد سے کیوں

(۱) الأنعام، ٦:٧٥

بیان کیا گیا؟ ایقان یقین سے اونچا ہوتا ہے۔ اِس لیے کہ یہ وہ حقیقت ہے جو زندگی بھر نظر نہیں آتی۔ اسی لیے وضاحت فرما دی کہ جو نظر نہیں آتی اُس پر کامل یقین رکھو، وہ ہدایت ضرور بالضرور آ کر رہے گی۔

بصورتِ دیگر ساری زندگی اگر ظاہر کے پیچھے پڑے رہے کہ 'آثار کچھ اور ہی داستان سنا رہے ہیں'، 'سارے منظر نامے پر دوسرے لوگ چھائے ہوئے ہیں' اگر ان منظر نامے کو دیکھتے اور اسی پر سوچتے رہیں گے تو پھر کبھی بھی ہدایت نہیں پا سکیں گے۔ فکری، نظریاتی اور انقلابی تحریک کے حاملین اور روایتی سیاسی جماعتوں کے کام میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔ مفاد پرست اور ابن الوقت قسم کے لوگ مختلف سیاسی جماعتوں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ کام بھی کرتے ہیں اور ان کی ہار جیت بھی ہوتی رہتی ہے۔ جبکہ ایمان و یقین کے ساتھ نظریاتی اور فکری تحریکوں میں کام کرنے والوں کی ابتدا بھی بِن دیکھے ایمان سے ہوتی ہے اور اُن کی انتہا بھی بِن دیکھے ایقان پر ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی ابتدا ایمان ہے اور ان کی انتہا ایقان ہے۔ یہ دو لفظ ذہن نشین کر لیں کہ اہلِ یقین کی ابتدا ایمان ہے اور انتہا ایقان ہے۔ ان کا آغاز ایمان بالغیب سے ہوتا ہے اور ان کا اختتام بن دیکھے یقین پر ہی ہوتا ہے۔

باب سوم

مصائب و مشکلات میں ثابت قدمی

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ مقدس میں مصائب و مشکلات اور آزمائشوں پر صبر کا موضوع بارہا بیان فرمایا ہے۔ یہ تکرار لا حاصل اور بلا مقصد ہرگز نہیں ہے بلکہ لوگوں کی ضرورت کے پیشِ نظر اور اُنہیں اس قسم کے حالات ہر دور میں پیش آنے کی وجہ سے اس مضمون کو قرآن مجید میں بارہا دہرایا گیا ہے۔ اس تکرارِ قرآنی کا مقصد ان حالات کا سامنا کرنے والوں کو تقویتِ ایمانی فراہم کرنا ہے۔ پھر یہ کہ ایک ہی پیغام (message) کو مختلف الفاظ میں بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بشری خصلتوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ بھلے وہ آج کا انسان ہو یا ہزار، دو ہزار سال پہلے کا یا آج سے تین چار ہزار سال بعد کا انسان، الغرض انسان خواہ کسی بھی زمانے کا ہو لیکن اَزل سے اَبد تک اس کی فطرت ایک ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بنایا ہے اور انسان اس کی خلقت و صنعت ہے۔ جس طرح مختلف فیکٹریوں میں مختلف اشیاء بنتی ہیں، بنانے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کس ماڈل میں کون کون سے خصائص اور کون کون سے نقائص ہیں؟ اللہ سے بڑا خالق اور صانع بھلا کون ہے؟ اس نے انسان کو بنایا ہے، اسے بخوبی علم ہے کہ انسان میں کیا اچھائیاں اور کیا کمزوریاں ہیں۔ (میں برائی کو کمزوری سے تعبیر کرتا ہوں۔ ہمیں اسی طرح کہنا چاہیے کہ یہ اچھائیاں اور یہ کمزوریاں ہیں۔) کن حالات میں اس کی سوچ کے انجن میں کون سا کچرا آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے کہ انسان مصائب و مشکلات اور آزمائشوں میں پریشان ہو کر سوچنے لگ جاتا ہے کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ کیوں ہوا؟ خلوص اور للٰہیت کے باوجود میں اپنی منزل اور مقصد کے حصول میں ابھی تک کامیاب کیوں نہیں ہوا؟ اسی سوچ کے تناظر میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مصائب و مشکلات اور آزمائشوں پر صبر کرنے کو متعدد مقامات پر مختلف پیرائے میں بیان فرمایا تاکہ انسان پریشانیوں کا شکار ہو کر مایوسی کی چادر نہ اوڑھ لے بلکہ ایمان، یقین اور استقامت کے ساتھ

سوئے منزل گامزن رہے۔ اللہ تعالیٰ اگر انسانوں کو نقص سے پاک پیدا کر دے تو پھر وہ بشر ہی نہیں رہیں گے، بلکہ فرشتے بن جائیں گے۔

۱۔ ملائکہ کا بشر کی حقیقت بیان کرنا

اللہ رب العزت نے جب اس امر کا اظہار فرمایا کہ میں انسان کو زمین پر اپنا نائب بنا رہا ہوں تو فرشتوں نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا:

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِکُ الدِّمَآءَ ج وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ.(۱)

انہوں نے عرض کیا: کیا تُو زمین میں کسی ایسے شخص کو (نائب) بنائے گا جو اس میں فساد انگیزی کرے گا اور خونریزی کرے گا؟ حالاں کہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور (ہمہ وقت) پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔

اس آیت میں فرشتوں نے ایک طرف انسان کے دنگا فساد، شر، لڑائی جھگڑا اور خون خرابہ کی بات کر دی کہ یہ تیری زمین پر فساد بپا کر دے گا اور دوسری طرف اسی بہانے اپنا استحقاق بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھ دیا کہ باری تعالیٰ! ہم تیری تسبیح، عبادت، ذکر اور تحمید بجا لاتے ہیں، دن رات تیری عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ لہٰذا تو انسان کو اپنا خلیفہ بنانے کے بجائے ہمیں اپنا خلیفہ بنا۔ خالقِ کائنات نے نہ تو فرشتوں کی بات کو رد کیا اور نہ ہی ان کی بات مانی۔ اللہ رب العزت نے یہ بھی نہیں کہا کہ تم میری عبادت کا حق ادا نہیں کرتے، تسبیح و تذکیر نہیں کرتے؛ مگر یہ بھی نہیں فرمایا کہ انسان دنگا فساد نہیں کرے گا۔ ایسا کیوں نہ فرمایا؟ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ فرشتے تسبیح و تذکیر کرتے ہیں جبکہ اِس انسان نے تو ایسا ہی کرنا تھا جس کا اظہار فرشتے کر رہے تھے، کیونکہ اس نے یہ سب انسان کی فطرت میں رکھا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کی نفی نہیں کی اور صرف یہ فرمایا:

---

(۱) البقرة، ۲: ۳۰

اِنِّیٓ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ○[۱]

میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے○

ربِ دوجہاں نے ملائکہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جو کچھ تم نے دیکھا ہے تم اپنی جگہ سچ بول رہے ہو لیکن میں نے بہت کچھ اس کے اندر ایسا رکھا ہے جو تم سے پوشیدہ ہے۔ 'جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے'، اس جملے میں یقینِ محکم کا اظہار نمایاں ہے۔

۲۔ اِنسان میں پوشیدہ اَوصاف

بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے آدم کی فضیلت کا اظہار دنگے فساد سے نہیں بلکہ 'علم' سے کروایا۔ خالقِ کائنات نے اپنے خلیفہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ○[۲]

اور اللہ نے آدم (علیہ السلام) کو تمام (اشیاء کے) نام سکھا دیے پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا، اور فرمایا: مجھے ان اشیاء کے نام بتا دو اگر تم (اپنے خیال میں) سچے ہو○

اللہ رب العزت نے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر علم کی صورت میں فضیلت کے اظہار سے یہ واضح فرما دیا کہ جو علم میں فائق و برتر ہے، وہی خلافت کا حق دار ہے۔ انسان کی فضیلتِ علم کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت نے اپنے اس فرمان کے ذریعے انسان میں موجود اس کے دیگر اوصاف کی طرف بھی اشارہ فرما دیا۔ انسان کی تخلیق اور اُسے خلیفہ بنانے پر اعتراض کرنے والے فرشتو! انسان کے لڑائی جھگڑے کو نہ دیکھو۔ اگر میں اسے لڑائی جھگڑے کے قابل نہ بناؤں تو وہ بزدل بن جائے گا۔ صرف اللہ اللہ کا وِرد کرتا رہے گا۔ اس کے سامنے

(۱) البقرۃ، ۲:۳۰

(۲) البقرۃ، ۲:۳۱

جب بھی حق کے لیے لڑنے اور عملی جد و جہد کا مرحلہ آئے گا تو وہ ظالموں کے ظلم سے بچنے کے لیے اُن کا مقابلہ کرنے کے بجائے تسبیح سمیت اندر بھاگ جائے گا۔ وہ جا کر کسی الماری میں چھپ جائے گا، یا تالا لگا کر مصلے پر بیٹھ کر اللہ اللہ اللہ کا ورد کرتا رہے گا۔ میں نے ایسے انسان کو بھلا کیا کرنا ہے جو حق و سچ کا علم بلند نہ کر سکے؟ اگر سارے انسان ہی ایسے ہو جائیں کہ محض زبان سے اللہ اللہ کرتے رہیں تو پھر نظام نہیں چلتا۔

خلافت و نیابت انسان کے سپرد اس لیے کی کہ یہ لوگ امن کے زمانہ میں تو فرشتوں جیسے بن جائیں گے، دن رات ذکرِ الٰہی سے اپنا ایمان پختہ کریں گے، اللہ کی رضا کے لیے تہجد، تراویح اور قرآن حکیم کی تلاوت کریں گے مگر جب بھی حق و سچ کی خاطر عملی جد و جہد کا وقت آئے گا تو میری حقیقی تعلیمات کے مطابق زمانے میں اپنا کلیدی کردار ادا کریں گے۔ میرے دین کی حفاظت کے لیے، میری مخلوق کے حقوق کے تحفظ کے لیے اور امن و سلامتی کے فروغ کے لیے وہ ہر ممکن کاوشیں کرتے نظر آئیں گے:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

۳۔ لفظ ’کیوں‘ نے عزازیل کو اِبلیس بنا دیا

اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو صرف اتنا کہا کہ ’تم نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں‘، تمام فرشتے اتنی سی بات پر مان گئے اور حکمِ الٰہی پر آدم علیہ السلام کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔ اسے کہتے ہیں یقین!

ان میں سے ایک نے کہا کہ ایسے بن دیکھے اور بن سمجھے میں تو ماننے والا نہیں ہوں، وہ اسی بات پر اکڑ گیا۔ اللہ رب العزت نے اس سے پوچھا کہ تم نے میری حکم عدولی کیوں کی اور آدم علیہ السلام کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ وہ کہنے لگا: باری تعالیٰ! تیری یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کیوں کہ

اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍO[۱]

میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو تو نے مٹی سے بنایا ہےO

گویا وہ اللہ رب العزت ہی کو اپنے اعلیٰ اور آدم علیہ السلام کے ادنی ہونے پر دلائل دینے لگا۔ اللہ رب العزت نے فرمایا:

فَاخْرُجْ اِنَّکَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَO[۲]

پس (میری بارگاہ سے) نکل جا، بے شک تو ذلیل وخوار لوگوں میں سے ہےO

اس کے دلائل کی وجہ یہ تھی کہ اسے اللہ کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ 'کیوں'، 'کب' اور 'کیسے' میں پڑ گیا۔ وہ عقل کی بات پر یقین کرنا چاہتا تھا کہ اگر میری سمجھ میں آئے گا تو سجدہ کروں گا۔ میں محض تیرے اس فرمان کہ 'تم نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں' کی بنیاد پر تیری بات نہیں مان سکتا۔

اُسی دن سے دو راستے ہوگئے۔ ایک یقین سے مزین راستہ جبکہ دوسری شک آلود روش۔ مومن کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ صاحبِ یقین ہوتا ہے۔

۴۔ ہر ایک کی ایمانی کیفیت یکساں نہیں ہوتی

غزوۂ اُحد میں شریک مسلمان مجاہدین کی تعداد سات سو تھی، جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور عوام دونوں طبقے شامل تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم استقامت کا پیکر بن کر لڑنے والے تھے جبکہ عوام ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ حق پر اسلام قبول کیا تھا۔ ابھی ان میں سے کئی کچے اور کئی پکے تھے۔ زیادہ تر لوگ شروع میں کچے ہوتے ہیں، رفتہ رفتہ پختہ ہو جاتے ہیں۔ ہر کوئی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، عثمان غنی رضی اللہ عنہ، علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

(۱) الأعراف، ۷: ۱۲

(۲) الأعراف، ۷: ۱۳

اور بلال حبشی رضی اللہ عنہ جیسا نہیں ہوتا۔ کئی ایسے ہوتے ہیں کہ جب عشق کا بھانبڑ بھڑکتا ہے تو پہلے ہی دن سے درِ جاناں پر بِک جاتے ہیں اور پھر ان دیوانوں اور مستانوں کے قدموں میں کوئی بھی لرزش نہیں لا سکتا۔ کئی ایسے ہوتے ہیں کہ دیکھا دیکھی کلمہ پڑھتے ہیں، آتے جاتے رہتے ہیں، پھر حالات کا بغور جائزہ لیتے ہیں اور اس اثنا میں کئی کئی مہینے اور کئی سال بھی گزار دیتے ہیں۔ مدینہ کے اردگرد رہنے والے ان دیہاتی لوگوں کو قرآن مجید میں کئی جگہ 'الاعراب' کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے لیے الگ لفظ استعمال کیا۔ دھوکہ باز، غدار اور سازشی لوگوں کو منافقین کہا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مومنین کہا اور جو ابھی کچے پکے تھے، ان کے لیے 'اَعراب' کا لفظ استعمال کیا۔ اس وقت مدینہ منورہ تو چھوٹا سا شہر تھا اور اردگرد کئی بستیاں اور دیہات تھے۔ ایمان میں استقامت کے حوالے سے ان دیہاتوں کے رہنے والوں نے حالتِ یقین و استقامت تک آتے آتے کئی مرحلے طے کیے۔

میدانِ جنگ سے بھاگنے والے عوام تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لشکرِ اسلام لے کر چلے تو ان کی دیکھا دیکھی یہ عوام بھی ساتھ چل نکلے۔ اب عوام اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں بنیادی فرق یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسلام کے سچے کارکن تھے۔ انہوں نے اپنے رب سے جان و مال کے سودے کیے ہوئے تھے۔ دوسری جانب عوام بھی دیکھا دیکھی، انقلاب آتا دیکھ کر، جیت کے گمان اور مالِ غنیمت کے حصول کے لیے ساتھ چل پڑے تھے۔ بعد ازاں جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ماحول نہیں بنا، جس کی امید پر وہ آئے تھے تو وہ میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ جب بھی انقلاب اور حق و باطل کے معرکے کی آواز بلند ہوتی ہے تو ازل سے انسانوں کا یہ طریقہ رہا ہے۔ اس لیے ایسے معرکوں میں اس طرح کے لوگوں پر ناراض نہیں ہوتے۔ یہ بھی آخر انسان ہیں، اُن کے اندر بھی کمزوریاں ہیں۔ اُحد کے میدان میں ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے والوں کو بھی اللہ رب العزت نے معاف فرما دیا تھا۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝(۱)

(۱) آل عمران، ۳:۱۵۵

بے شک جو لوگ تم میں سے اس دن بھاگ کھڑے ہوئے تھے جب دونوں فوجیں آپس میں گتھم گتھا ہوگئی تھیں تو انہیں محض شیطان نے پھسلا دیا تھا، ان کے کسی عمل کے باعث جس کے وہ مرتکب ہوئے، بے شک اللہ نے انہیں معاف فرما دیا، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا بڑے حلم والا ہےo

تحریک منہاج القرآن کے رفقاء و کارکنان کو اس موقع پر نصیحت کر رہا ہوں کہ مصطفوی انقلاب کی تگ و دو میں اگر کوئی ڈٹ کرنہیں لڑا تو اس سے خفا نہیں ہونا بلکہ ہم خود شکر ادا کریں کہ اللہ نے ہمیں توفیق دی اور اسے نہیں دی۔ بس یہیں پر بات ختم ہوگئی۔

۵۔ اَہلِ حق دوسروں پر طعنہ زنی نہیں کرتے

انقلاب مارچ ۲۰۱۴ء کی عظیم جد و جہد کے بعد جب ہم پلٹ کر آئے تو ایسے بہت سے لوگ تھے جو ہم پر طعنہ زنی کرتے کہ 'تمہیں کیا ملا؟ ہم نے تمہیں پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ اس انقلابی تگ و دو سے کچھ حاصل نہیں ہوگا؟'

ایک بات واضح کر دوں کہ اسی طرح کی باتیں مدینہ منورہ میں منافقین نے بھی کی تھیں، جب مسلمانوں کو غزوہ اُحد میں مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مگر اِن کی باتوں اور طعنوں سے جاں نثار و وفادار صحابہ کرام ﷺ کے یقین و استقامت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ہم بھی حق و سچ کے راستے پر گامزن ہیں۔ اسلام کے تحفظ اور انسانوں کے حقوق کی بازیابی کے لیے آئینی و قانونی جد و جہد کر رہے ہیں۔ صحابہ کرام ﷺ کی یہ استقامت و یقین ہمارے لیے روشنی ہے۔ ہم نے نصرتِ دین کے لیے اِسی سے اِکتساب کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہنا ہے۔ جو لوگ ہماری اِنقلابی جد و جہد میں ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوئے، مجھے ان پر کبھی غصہ نہیں آیا۔ میں انقلاب مارچ کے لیے نکلنے والوں پر بہت خوش ہوں مگر نہ نکلنے والوں سے ناراض نہیں ہوں۔ کسی ایک سے کوئی کیا گلہ کرے! یہاں تو ساری قوم نے ہی ایسا کیا ہے۔ کیا ہم لوگ اپنی روٹی یا اپنے ذاتی مفادات کے لیے نکلے تھے؟ ہرگز نہیں! ہم میں سے تو بہت سوں کو اللہ نے اتنا نواز رکھا ہے کہ انہیں معاش کی فکر سے آزاد کر دیا ہے مگر اس کے باوجود وہ اس انقلابی جد و جہد

میں شریک ہوئے، وہ ساری قوم اور اُمت کے لیے نکلے تھے۔ جس محروم طبقے کے لیے ہم نکلے تھے، وہ حکومتی جبر و بربریت، ظلم و ستم، جان و مال اور روزگار کے خوف سے گھروں سے باہر نہ آئے، اس پر مستزاد یہ کہ حکومتی پروپیگنڈہ کے باعث ہمیں اپنوں نے طعن و تشنیع کا نشانہ بھی بنایا۔ اللہ رب العزت کی سنت یہ ہے کہ اُس نے غزوۂ اُحد میں شریک 'الاعراب' یعنی عوام کو میدانِ جنگ سے خوف زدہ ہونے کے باعث بھاگنے کے باوجود معاف کر دیا۔ کیوں؟ اِس لیے کہ انہیں شیطان نے پھسلا دیا تھا۔

ہم بھی اُن لوگوں سے کوئی گلہ اور شکوہ و شکایت نہیں کرتے اور نہ ہی جھگڑا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ آج اگر وہ ہمارے ساتھ نہیں چلے تو کیا ہوا؟ ممکن ہے آئندہ ہمارے ایجنڈے کی وسعت کو دیکھتے ہوئے ملی و قومی مفادات کے پیشِ نظر اور نسلوں کا مستقبل بہتر بنانے کے لیے ہماری آواز پر لبیک کہتے ہوئے باہر نکل آئیں۔ اس لیے کہ آئے روز حکومتی پراپیگنڈا کے باوجود ہمارے مؤقف کی صداقت ہر خاص و عام پر مزید عیاں ہوتی چلی جا رہی ہے۔

منزل نہ ملنے کی صورت میں طعن و تشنیع کے نشتر چلانا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ طعنے دینے والے خود اِس جد و جہد میں شریک نہیں ہوتے اور ظاہری ناکامی پر تنقید و اِعتراضات کرنے میں بھی سب سے آگے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف اگر منزل اور مقصد مل جائے تو پھر تنقیدیں نہیں کرتے، کیونکہ مقصد مل گیا۔ پھر تو ہر طرف سے 'واہ! واہ!' ہی ہوتی ہے، 'کمال ہوگیا! جی کمال ہوگیا!' کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ ہر طرف سے داد و تحسین اور ستائش کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر مقصد نہ ملے تو پھر ہر طرف پریشانی کا دور دورہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے پر تنقیدوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ 'یہ ہوا'، 'وہ ہوا'، 'اِس نے کیا'، 'اُس نے کیا'، 'فلاں نے کیا'، 'ایسے نہ ہوتا'، 'ویسے ہوتا'؛ الغرض ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ قرآن مجید اور تاریخِ اسلام کے قرطاس بتاتے ہیں کہ حضور ﷺ کی جد و جہد کے دوران بھی یہ سب کچھ ہوا ہے، مگر اللہ کا یہ شیوہ ہے کہ ان کو بھی معاف کر دیا۔

۶۔ مومن جمال و جلال کا پیکر ہوتا ہے

معلمِ انسانیت ﷺ نے اپنی سنت سے صرف اللہ اللہ کرنے، تسبیح کرنے، درود پاک پڑھنے اور استغفار کرنے کا سبق نہیں سکھایا۔ اس ضمن میں فیصلہ ہم نے کرنا ہے کہ زندگی کی کون سی روش صحیح ہے اور کون سا راستہ غلط ہے۔ ہم نے اس ضمن میں ہدایت کی روشنی قرآنِ مقدس اور رسول پاک ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہی سے لینی ہے۔ تسبیح، اللہ اللہ، ذکر و اَذکار، نیکی، میلاد شریف اور گوشۂ درود سب بڑی فضیلت اور عظمت کے کام ہیں۔ آقاے دو جہاں ﷺ نے بھی ایک گوشہ بنا رکھا تھا، جسے اصحاب صفہ کا گوشہ کہا جاتا تھا۔ وہاں روزے رکھے جاتے تھے اور بعض اوقات افطار میں آٹھ آٹھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صرف ایک کھجور ملتی تھی اور وہ روزہ پانی ہی سے افطار کرتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسلام کا یہ چمن کوئی آسانیوں کے ساتھ نہیں سینچا۔

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

بعض اوقات اَصحابِ صفہ کو اتنی کمزوری آ جاتی تھی کہ جب امام الانبیاء ﷺ حالتِ نماز میں قراءَت کر رہے ہوتے تو بھوک کی وجہ سے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غش کھا کر گر پڑتے تھے۔ مدینہ منورہ میں منافق اور یہود رہتے تھے۔ وہ ان مناظر کو دیکھتے تھے کہ کئی دن کے بھوکے نماز میں قیام نہیں کر سکتے، گر پڑے ہیں اور بے ہوش ہو گئے ہیں۔ ان مناظر کو دیکھتے ہوئے وہ حیرانگی سے کہتے:

هٰؤُلَاءِ مَجَانِيْنَ.(۱)

یہ پاگل ہیں۔

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۶: ۱۸، رقم: ۲۳۹۸۳

۲۔ ترمذی، السنن، کتاب الزهد، باب ما جاء في معيشة أصحاب النبی ﷺ، ۴: ۵۸۳، رقم: ۲۳۶۸

۳۔ بزار، المسند، ۹: ۲۰۵، رقم: ۳۷۵۰

گویا صحابہ کرام ﷺ کے ہاں عبادت میں یہ کیفیات بھی ہوتیں۔ خاتم الانبیاء ﷺ انہیں تہجد میں بھی اٹھاتے، حلقۂ علم اور حلقۂ ذکر بھی ہوتا اور ان کی تربیت کا اہتمام بھی فرماتے۔ دورِ رسالت میں ہر کام اپنے وقت پر ہوتا تھا۔ ایک ہی مسجد میں بیک وقت دو حلقے ہو رہے ہوتے۔ اِدھر حلقۂ ذکر ہو رہا ہوتا اور اُدھر علم کا حلقہ ہو رہا ہوتا۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو ﷺ بیان کرتے ہیں:

خَرَجَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ مِنْ بَعْضِ حُجَرِهِ فَدَخَلَ الْمَسْجِدَ. فَإِذَا هُوَ بِحَلْقَتَيْنِ: إِحْدَاهُمَا يَقْرَأُوْنَ الْقُرْآنَ وَيَدْعُوْنَ اللهَ وَالْأُخْرٰى يَتَعَلَّمُوْنَ وَيُعَلِّمُوْنَ. فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ : كُلٌّ عَلَى خَيْرٍ. هٰؤُلَاءِ يَقْرَئُوْنَ الْقُرْآنَ وَيَدْعُوْنَ اللهَ. فَإِنْ شَاءَ أَعْطَاهُمْ وَإِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ. وَهٰؤُلَاءِ يَتَعَلَّمُوْنَ وَيُعَلِّمُوْنَ. وَإِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا. فَجَلَسَ مَعَهُمْ. (۱)

ایک روز رسول اللہ ﷺ اپنے ایک حجرہ مبارک سے باہر تشریف لائے اور مسجد میں داخل ہوئے۔ وہاں آپ ﷺ نے (صحابہ ﷺ کے) دو حلقے دیکھے۔ ایک حلقہ کے لوگ قرآن کی تلاوت کر رہے تھے اور اللہ سے دعا مانگ رہے تھے اور دوسرے حلقہ کے لوگ تعلیم و تعلم میں مصروف تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ دونوں نیکی کا کام سر انجام دے رہے ہیں۔ اس حلقہ والے قرآن پڑھ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے ہیں۔ وہ اگر چاہے تو انہیں عطا فرما دے اور اگر چاہے تو عطا نہ فرمائے۔

---

(۱) ۱۔ ابن ماجه، السنن، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ۱:۸۳، رقم:۲۲۹
۲۔ دارمی، السنن، ۱:۱۱۱، رقم:۳۴۹
۳۔ طیالسی، المسند، ۱:۲۹۸، رقم:۲۲۵۱
۴۔ بیهقی، المدخل إلى السنن الكبرى، ۱:۳۰٦، رقم:۴٦۲
۵۔ ابن المبارک، الزهد، ۱:۴۸۸، رقم:۱۳۸۸

دوسرے حلقہ والے لوگ تعلیم و تعلم میں مشغول ہیں۔ اور میں معلم بنا کر ہی مبعوث کیا گیا ہوں۔ (یہ فرما کر) آپ ﷺ ان (تعلیم و تعلم والے اَصحاب) کے ساتھ تشریف فرما ہو گئے۔

امام الانبیاء ﷺ نے حلقۂ علم میں شرکت فرما کر اس کی اہمیت واضح فرمائی۔ قابلِ غور بات ہے کہ ایسا کیوں؟ یہ اس لیے کہ علم کے حصول سے فکر درست ہو گی۔ علم کے حصول سے جب یقین آئے گا تو تصور درست ہوگا اور تصور کے درست ہونے سے ذکر کرنے کے قابل بھی ہوں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا صرف یہی ایک پہلو نہیں تھا بلکہ جب انقلاب، حق و باطل کے معرکے اور دفاع کا وقت آتا تو پھر خندقیں بھی کھودتے اور جان و مال کی پروا کیے بغیر میدانِ کارزار کو بھی خوب گرماتے تھے۔

۷۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے

اللہ تعالیٰ نے مومنین کی تربیت کا اس قدر اہتمام فرمایا کہ اُن کی سوچ میں سے شک کی کلیتاً بیخ کنی کر دی اور واضح کر دیا کہ اگر کسی کی حق کی خاطر جان بھی چلی جائے تو یہ مت سمجھنا یا کہنا کہ اگر وہ اِس جنگ یا جد و جہد میں شامل نہ ہوئے ہوتے تو موت سے بچ جاتے۔ یہ سوچ کافرانہ اندازِ فکر ہے۔ ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ (1)

اے ایمان والو! تم ان کافروں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے ان بھائیوں کے بارے میں یہ کہتے ہیں جو (کہیں) سفر پر گئے ہوں یا جہاد کر رہے ہوں (اور وہاں مر

(۱) آل عمران، ۳: ۱۵۶

جائیں) کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے، تاکہ اللہ اس (گمان) کو ان کے دلوں میں حسرت بنائے رکھے، اور اللہ ہی زندہ رکھتا اور مارتا ہے، اور اللہ تمہارے اعمال خوب دیکھ رہا ہےo

اِس آیتِ مبارکہ میں اللہ رب العزت ایمان والوں سے مخاطب ہے کہ تم اُن کافروں کی طرح نہ ہو جاؤ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن کو مخاطب کیا جارہا ہے کیا وہ اسلام کا کوئی عقیدہ چھوڑ رہے تھے؟ معاذ اللہ کیا وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، قرآن یا حضور ﷺ کی نبوت کا انکار کر رہے تھے؟ اگر ایسا نہ تھا تو پھر وہ کون سا نکتہ تھا جس پر اس آیت میں حکم صادر فرمایا کہ اُن کافروں کی طرح نہ ہو جاؤ۔ یاد رکھیں! اس حکم سے انہیں سوچ میں کافروں جیسا نہ ہونے کا کہا گیا تھا کہ تم شک میں پڑ کر ایسے نہ سوچنے لگ جانا جس طرح کافر سوچتے ہیں بلکہ تمہاری سوچوں کا رخ بہرصورت آقا ﷺ، یقین اور ایمان کی طرف ہونا چاہیے۔ شکوک اور وسوسے کی جانب تمہاری سوچیں اور خیالات کسی صورت نہ جائیں۔ اُن کافروں کی طرح یہ مت سوچنا کہ اگر وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد پر نہ جاتے تو وہ نہ مرتے اور نہ ہی یوں قتل کیے جاتے۔

کسی کو موت سے بچا لینے والے یہ کون ہوتے ہیں۔ زندگی اور موت صرف اللہ ہی دیتا ہے اور اس پر ایمان ہونا چاہیے۔ اگر موت آنی ہے تو آ کر رہے گی، لہٰذا جب موت ایک اٹل حقیقت ہے تو کوشش کرنی چاہیے کہ بزدلی کی نہیں بلکہ جواں مردی کی موت آئے۔

موت کے بارے میں اس اٹل حقیقت کو واضح کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے راستے میں مارے جانے کی فضیلت اور مقام و مرتبہ کو اللہ رب العزت نے اس طرح بیان فرمایا:

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَo وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِ الَى اللهِ تُحْشَرُوْنَo[1]

اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کر دیے جاؤ یا تمہیں موت آ جائے تو اللہ کی مغفرت اور رحمت اس (مال و متاع) سے بہت بہتر ہے جو تم جمع کرتے ہوo اور اگر تم مر جاؤ یا

(۱) آل عمران، ۳:۱۵۷–۱۵۸

مارے جاؤ تو تم (سب) اللہ ہی کے حضور جمع کیے جاؤ گے ○

یعنی سب نے اللہ ہی کی طرف جانا ہے تو پھر وہ جان لے گا کہ اس کی راہ میں لڑ کر کون مرا ہے، یا راہِ حق میں جدو جہد کرنے والا کون ہے؟ کون ہے وہ جس کے اندر مقامِ شہادت کے حصول کی تمنا مچل رہی تھی، مگر اسے بستر پر موت آ گئی؟ مالکِ دو جہاں اس کی اس نیت کے سبب اس کا نام بھی شہداء کی فہرست میں شامل کر دے گا۔

۸۔ انسان کا کام اپنا فریضہ ادا کرنا ہے

مالکِ کُل اہلِ ایمان سے فرماتا ہے کہ جو تمہاری ڈیوٹی (فریضہ) ہے، تم اپنا کام مکمل کرو۔ اس جد و جہد کا انجام کیا ہو گا اور کب ہو گا، یہ سب میرا کام ہے۔ تم میرا کام اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے اپنا فریضہ بطریقِ احسن سرانجام دو۔ ارشاد فرمایا:

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ.(۱)

اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔

یعنی اگر اللہ تمہاری مدد فرمانے پر آ جائے اور مدد فرما دے تو بھلا تم پر کسی بھی معرکے میں کوئی اور کس طرح غالب آ سکتا ہے؟ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ تمہاری تربیت نکھار اور بلندی درجات کے لیے تمہیں ابتلاء سے گزارے اور تمہیں اپنے حال پر چھوڑ دے یہاں تک کہ تمہارے مخالف دشمن لوگ تم پر غالب آ جائیں تو کوئی ایسا ہے جو تمہاری مدد کر سکے گا؟ اللہ رب العزت نے فرمایا:

وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ○(۲)

اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے○

میاں محمد بخش بھی کہتے ہیں:

(۱) آل عمران، ۳:۱۶۰

(۲) آل عمران، ۳: ۱۶۰

مالی دا کم پانی دینا، بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھل پھول لانا لاوے یا نہ لاوے

مالی کبھی اپنے مالک سے شکوہ نہیں کرتا۔ اگر اللہ فیصلہ کر لے کہ اسی معرکے میں تمہیں غالب کرنا ہے تو کوئی تمہارے سامنے جم نہیں سکتا اور اگر اللہ کسی حکمت کی وجہ سے فیصلہ کر لے کہ ہم نے مزید آزمانا اور تربیت کے مراحل سے گزارنا ہے، تو کیا کوئی اور ہماری مدد کر سکتا ہے؟ لہٰذا ہمیں اپنا کام کرنے کا حکم ہے کہ مالی بنیں، مالک نہ بنیں۔

۹۔ اَہلِ یقین ہی حقیقی اَہلِ ایمان ہیں

ایمان والوں میں سے جس کا اپنے رب پر توکل قائم ہو جائے، اسے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ توکل، یقین سے جنم لیتا ہے اور یقین شک کی جڑوں کو کاٹ کر حاصل ہوتا ہے۔ جب بندے میں یقین آتا ہے تو دور دور تک شک کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ مومن بخوبی جانتا ہے کہ شک بے صبری پیدا کرتا ہے اور بے صبری بندے کا حوصلہ کمزور کر کے اسے ختم کر دیتی ہے۔ شک اپنے ساتھ بے صبری اور وسوسہ لاتا ہے اور بے صبر ہونے سے بندہ ہمت ہار جاتا ہے۔ یہ ایک الگ راستہ ہے۔ ایمان شک کی جڑ کو کاٹتا اور یقین کا درخت تناور کرتا ہے۔ جب یقین محکم ہوتا ہے تو یقین کے شجر پر رضا اور توکل کے شیریں ثمرات لگتے ہیں۔ یہ سب کچھ یقین کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے مومنوں کو حکم ہے کہ وہ توکل و یقین کو کبھی نہ چھوڑیں۔ جب توکل کی دولت حاصل ہو تو فتح سامنے نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان واضح ہے:

اِنَّ حِزْبَ اللهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ○ (۱)

اللہ کی جماعت (کے لوگ) ہی غالب ہونے والے ہیں○

لہٰذا یہ وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ 'کب'، 'کیوں' اور 'کیسے' میں نہیں الجھنا، ان میں

(۱) المائدة، ۵: ۵٦

الجھنا شکوک اور وساوس کو لانے کا باعث بنے گا۔ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ○[1] کے فرمانِ خداوندی کے مطابق ہر حال میں اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے آگے بڑھتا رہتا ہے۔

۱۰۔ اُحد کے بعد حنین میں پھر کڑی آزمائش

غزوۂ حنین میں حضور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بارہ ہزار افراد کا لشکر تھا۔ دس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم اور دو ہزار عوام یعنی وہ لوگ شامل تھے جو نئے نئے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے اور ایمان و اسلام کے حوالے سے ابھی ان میں تربیت کی کمی تھی۔ غزوۂ حنین فتح مکہ کے صرف پندرہ دن بعد وقوع پذیر ہوا۔ فتح مکہ کی صورت میں نئے شہر کو فتح کیے ابھی پندرہ دن ہوئے تھے اور اتنے دنوں میں تو منصوبہ بندی بھی مکمل نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے بعد صرف دو ہفتے آرام کر سکے تھے کہ حنین کی وادی میں اسلام دشمنوں کی ساری فوجیں جمع ہونا شروع ہوگئیں۔ آقاے دو جہاں ﷺ کو خبر ملی تو لشکر لے کر مکہ مکرمہ سے نکل پڑے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پچھلی تھکاوٹ اترتی نہیں تھی اور آقا ﷺ انہیں لے کر اگلے محاذ کی طرف چل پڑتے تھے۔ دس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم تھے جو فتح مکہ میں آئے تھے۔ اس لشکر میں خواص صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تھے اور عوام صحابہ رضی اللہ عنہم بھی۔ جس نے بھی آقا ﷺ کو دیکھ کر کلمہ پڑھ لیا، اسے صحابی ہی کہیں گے مگر اس میں بھی کئی درجے ہیں۔ آہستہ آہستہ سنبھلنے والے بھی بہت صحابہ ہوئے ہیں اور پہلے دن ہی سے پکے اور پختہ بھی بہت صحابہ رضی اللہ عنہم ہوئے ہیں۔

غزوۂ حنین میں موجود تمام صحابہ اولو العزم صحابہ نہیں تھے۔ ان کے درجات میں فرق تھا۔ جس طرح مدینہ منورہ فتح مکہ کے لیے آتے ہوئے عوام بھی لشکرِ اسلام کے ہمراہ چل پڑے تھے، اسی طرح جب مکہ سے حنین کے لیے چلے تو دس ہزار کا وہ لشکر جو مدینہ سے آیا تھا اور دو ہزار مکہ کے عوام بھی مالِ غنیمت کے حصول کے لیے ہمراہ چل پڑے۔ اس لیے کہ جب کسی مشن پر روانہ ہوا جاتا ہے تو دیکھا دیکھی جوش و جذبے میں کئی کچے افراد بھی ساتھ چل پڑتے ہیں۔

---

(۱) آل عمران، ۳: ۱۶۰

ایسی صورت حال ہو تو پھر بھگدڑ بھی مچتی ہے۔ غزوۂ حنین کے موقع پر بھی مسلمانوں کو پہلے مرحلہ میں ظاہری شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس شکست پر بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایمان، یقین اور استقامت کا درس دیتے ہوئے انہیں ابتلاء و آزمائشوں میں صبر کرنے کی تلقین کی اور ڈھارس بندھانے کی خاطر مسلمانوں کو ایک بار پھر غزوۂ بدر کی یاد دلائی۔ ارشاد فرمایا:

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا.(۱)

کیا جب تمہیں ایک مصیبت آ پہنچی حالاں کہ تم اس سے دو چند (دشمن کو) پہنچا چکے تھے۔

اللہ رب العزت نے غزوۂ اُحد کے بعد غم سے نڈھال مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم پر یہ مصیبت آ گئی ہے تو پریشان کیوں ہوتے ہو؟ کیا تم اس سے دوگنا نقصان غزوۂ بدر میں دشمن کو نہیں پہنچا چکے؟ حالانکہ اس وقت تو فرشتے بھی تمہاری نصرت کے لیے اترے تھے۔ اس وقت اللہ کی بارگاہ میں حضور ﷺ عرض کر رہے تھے کہ باری تعالیٰ کائنات میں میری کل جمع پونجی یہی لوگ ہیں، اگر یہ شکست کھا گئے تو تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

یہ اللہ تعالیٰ اور حضور ﷺ کے آپس کے پیار و محبت کے تعلق کی بات ہے۔ کسی اور کی اتنی جرات نہیں ہے کہ کُنْ فَیَکُوْن کی حامل ذاتِ الٰہی سے ایسی بات کر سکے اور کہے: 'اگر میرے بندے اس معرکے میں ہار گئے تو پھر تیری کبھی عبادت نہیں ہوگی'۔ اُس بے نیاز کی بھی شانِ بے نیازی دیکھیں کہ جواب میں یہ نہیں کہا کہ محبوب! کیا کہہ رہے ہو؟ کیا میں اپنی عبادت کروانے کے لیے ان کا محتاج ہوں؟ رب کسی کا محتاج نہیں ہے مگر اس نے بھی اپنے محبوب ﷺ کے لاڈ کی لاج رکھ لی۔ فرمایا: فرشتو! میرے محبوب کہہ رہے ہیں کہ اگر شکست کھا گئے تو میری عبادت ہی نہیں ہوگی۔ فرشتوں نے عرض کیا: باری تعالیٰ! ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا: جاؤ، تلواریں لو اور مسلمانوں کے ہمراہ کفار سے جنگ کرو۔

غزوۂ بدر کے بعد کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور نبی اکرم ﷺ سے پوچھتے تھے: آقا! یہ بات

(۱) آل عمران، ۳: ۱۶۵

سمجھ میں نہیں آئی کہ میں فلاں کافر سے لڑ رہا تھا، میں نے تلوار چلائی، ابھی میری تلوار ہوا ہی میں تھی کہ کافر کی گردن پہلے ہی کٹ گئی۔ حضرت ابو امامہ بن سہل روایت کرتے ہیں:

قَالَ لِي أَبِي: يَا بُنَيَّ، لَقَدْ رَأَيْتُنَا يَوْمَ بَدْرٍ، وَإِنَّ أَحَدَنَا يُشِيرُ بِسَيْفِهٖ إِلٰى رَأْسِ الْمُشْرِكِ، فَيَقَعُ رَأْسُهٗ عَنْ جَسَدِهٖ قَبْلَ أَنْ يَصِلَ إِلَيْهِ.(۱)

مجھے میرے والد گرامی نے فرمایا: اے بیٹے! غزوۂ بدر کے روز ہم نے مشاہدہ کیا، جب ہم میں سے کوئی شخص اپنی تلوار سے کسی مشرک کے سر کی طرف اشارہ کرتا تو وہ اس کا سر تلوار کے وار سے قبل ہی خود بخود جسم سے کٹ کر علیحدہ ہو جاتا تھا۔

در اصل یہ رب کریم کی اپنے محبوب ﷺ پر اتاری گئی مدد و نصرت کا اظہار تھا کہ فرشتے ان مشرکین کو مار رہے تھے۔

خاتم المرسلین حضرت محمد ﷺ نے غزوۂ بدر کی طرح غزوہ حنین میں بھی اسی قسم کی عرض ربِّ کائنات کی بارگاہ میں پیش کی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ حنین کے موقع پر حضور نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگی:

اللّٰهُمَّ إِنْ تَشَأْ أَنْ لَا تُعْبَدَ بَعْدَ الْيَوْمِ.(۲)

باری تعالیٰ اگر تو چاہتا ہے کہ آج کے دن کے بعد تیری عبادت نہ ہو (تو پھر بے شک ان مسلمانوں کو شکست دلوا دے)۔

ربِ دوجہاں سے ایسی باتیں بھلا کون کر سکتا ہے؟ کئی نادان سمجھتے ہیں کہ فخرِ

---

(۱) ۱۔ حاكم، المستدرك، ۳: ۴۶۳، رقم: ۵۷۳۶
۲۔ طبرانی، المعجم الكبير، ۶: ۷۴، رقم: ۵۵۵۶
۳۔ ابن كثير، البداية والنهاية، ۳: ۲۸۱

(۲) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۱۲۱، رقم: ۱۲۲۴۲
۲۔ ابن أبي شيبة، المصنف، ۶: ۷۵، رقم: ۲۹۵۸۴

موجودات ﷺ ہمارے جیسے بشر ہیں۔ غور طلب بات ہے کہ کسی بندے کی اتنی جرأت ہے کہ وہ اللہ کے حضور اس طرح کی باتیں کر سکے۔ الفاظ پر غور کیجیے! 'اگر تو چاہتا ہے کہ تیری عبادت ہو تو پھر انہیں شکست نہ ہونے دینا'۔ غزوۂ حنین میں بھی غزوۂ بدر جیسی صورتِ حال بن گئی تھی، حتیٰ کہ آقاے دو جہاں ﷺ کو کنکریاں اٹھا کر خود مارنا پڑی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اس عمل سے کفار منتشر ہو گئے۔

'مصنف ابن ابی شیبۃ' میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی طویل روایت میں ہے:

ثُمَّ رَمَاهُمْ بِحَصَاةٍ كَانَتْ فِي يَدِهِ، فَوَلَّوْا مُدْبِرِينَ. (۱)

پھر آپ ﷺ نے لشکر کفار کی طرف اپنے دستِ اَقدس میں موجود کنکر پھینکے تو وہ پیٹھ دکھاتے ہوئے منتشر ہو گئے۔

۱۱۔ آزمائش مِن جانبِ اللہ ہوتی ہے

ان واقعات کے ذریعے اللہ تعالیٰ لوگوں کو بار بار استقامت اور یقین کا ہی تصور راسخ کرا رہا ہے تا کہ وہ راہِ حق میں مصائب و مشکلات کو برداشت کرتے ہوئے مضبوطی سے حق پر جم جائیں اور ان میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ بندہ تلاوتِ قرآن کے دوران یہ سوچتا ہے، پریشان ہو جاتا ہے کہ آزمائشوں پر صبر اور استقامت کا مضمون تکرار کے ساتھ ساتھ قرآن میں کیوں بیان کیا جا رہا ہے؟ جان لیں کہ اس تکرار کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں میں سے اس پریشانی کو نکالنا چاہتا ہے تا کہ بار بار ذکر کروں اور پریشانی کی کیفیت ختم ہو جائے۔ وہ یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ ظاہری ناکامی اور وسائل کی عدم دست یابی کے باوجود اَہلِ حق ہی اصل میں جیتے، فتح یاب ہوئے اور غالب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے حوصلوں اور استقامت کو قائم دائم رکھنے کی غرض سے ان مضامین کا تکرار فرماتا ہے۔ فرمایا:

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَo وَلِيَعْلَمَ

(۱) ابن أبي شيبة، المصنف، ۷: ۳۹۹، رقم: ۳۶۹۰۰

الَّذِيْنَ نَافَقُوْا.(۱)

اور اُس دن جو تکلیف تمہیں پہنچی جب دونوں لشکر باہم مقابل ہوگئے تھے، سو وہ اللہ کے حکم (ہی) سے تھی اور یہ اس لیے کہ اللہ ایمان والوں کی پہچان کرا دےo اور ایسے لوگوں کی بھی پہچان کرا دے جو منافق ہیں۔

یعنی دراصل یہ تکلیف اللہ کے اذن سے تمہیں پہنچی تھی۔ تم اللہ کے اذن کو مٹانے والے کون ہوتے ہو؟ کوئی ہے جو اللہ کے اذن کو منسوخ کر سکے؟ اگر اللہ کے اذن کو منسوخ کرنے کا عمل ہوتا تو کیا امام حسین ؑ کا سر کٹ کر نیزے پر چڑھتا؟ کبھی سوچا کہ وہ ذات، جن کی کرامت کا عالم یہ ہے کہ نیزے پر کٹا سر قرآن کی تلاوت کر رہا ہے، اگر وہ چاہتا کہ میں کٹوں ہی نہ تو کیا کوئی کاٹ سکتا تھا؟ کیا انہیں کوئی شہید کر سکتا تھا؟ نہیں، نہیں، کبھی نہیں! لیکن شان یہ ہے کہ ادھر وہی سر تلوار سے کٹ رہا ہے اور اپنے آپ کو شہید ہونے سے بچاتا نہیں اور وہی سر کٹ کر نیزے پر چڑھ کر قرآن سناتا ہے۔ یہ سب اللہ کی شانیں ہیں اور اللہ رب العزت كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ(۲) کے مصداق ہر آن نئی شان میں ہوتا ہے۔ مومن اللہ تعالیٰ کی ہر شان میں کہتا ہے: 'سبحان اللہ! مولیٰ تیری حکمتیں ہیں، تیرے ہر کام میں خیر ہے۔' بس! یہی ایمان ہے۔

اس آیت میں اللہ جل شانہٗ فرما رہا ہے کہ اس دن تمہیں جو تکلیف پہنچی تھی وہ یاد ہے؟ مومن کامل عرض کرتا ہے: باری تعالیٰ! یاد ہے۔ فرمایا: غم زدہ مت ہونا۔ یہ دراصل اللہ کا اذن تھا۔ اہلِ ایمان اللہ کے اذن پر غم زدہ نہیں ہوتے۔ اور یہ تکلیف تمہیں اس لیے پہنچی تھی کہ

وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَo(۳)

اور یہ اس لیے کہ اللہ ایمان والوں کی پہچان کرا دےo

---

(۱) آل عمران، ۳: ۱۶۶-۱۶۷

(۲) الرحمٰن، ۵۵: ۲۹

(۳) آل عمران، ۳: ۱۶۶

یعنی تمہیں بھٹی میں اس لیے پکایا جاتا ہے تاکہ پرکھا جائے کہ مومن کون ہیں؟

اگلی آیت میں فرمایا کہ اللہ اِس وقتی ظاہری شکست و ناکامی کے ذریعے صرف مومن کی پہچان ہی نہیں کراتا بلکہ یہ بھی دکھاتا ہے کہ منافق کون ہیں؟ واضح فرما دیا کہ اس مقام پر جو چھوڑ کر بھاگ گئے، فرار ہو گئے اور طعنہ زنی کر رہے ہیں وہ منافق ہیں۔ فرمایا: وہ ایمان کو بھی ظاہر کرنا چاہتا ہے اور نفاق کو بھی عیاں کرنا چاہتا ہے۔

اللہ رب العزت پھر ارشاد فرماتا ہے کہ منافقوں والی سوچ کی طرف نہ جانا۔ گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی ایسی سوچوں سے ٹکراؤ ہوتا تھا۔ ان کا بھی ایسے لوگوں سے پالا پڑتا تھا۔ مقام غور ہے کہ اگر جیت کر آ جاتے، احد میں نقصان نہ ہوتا، شہادتیں نہ ہوتیں، زخمی نہ ہوتے، تو بھلا کوئی باتیں کرتا؟ طعنہ زنی کرتا؟ پھر طعنہ کس نے دینا تھا۔ پھر تو پیچھے ہٹنے والوں اور منافق لوگوں نے بھی نعرے لگا کر مال غنیمت سمیٹنے اور اچھل کود کرنے کے انداز میں لشکر میں شامل ہو جانا تھا کہ پتہ چلتا کہ صف اول میں لڑنے والے یہی ہیں۔ اس ظاہری اور وقتی شکست سے اللہ تعالیٰ انہیں عریاں کرنا چاہتا ہے۔ یہ اللہ کی تدبیر تھی کہ ان کے چہروں پر ڈالے گئے نقاب ہٹ جاتے اور وہ مومنوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتے۔ فرمایا:

وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ اَوِ ادْفَعُوْا. قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ.(۱)

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا (دشمن کے حملے کا) دفاع کرو تو انہوں نے کہا اگر ہم جانتے کہ (واقعتاً) لڑائی ہوگی (یا ہم اسے اللہ کی راہ میں جنگ جانتے) تو ضرور تمہاری پیروی کرتے۔

منافق کہتے کہ یہ کوئی مقابلہ نہیں ہے، تمہارا نقصان ہی نقصان ہونا ہے، مارے جاؤ گے اور تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ اگر جنگ ہوتی تو ہم ضرور جاتے لیکن یہ مقابلے کا کوئی ماحول دکھائی نہیں دیتا۔

(۱) آل عمران، ۳:۱٦۷

۱۲۔ شیطانی پراپیگنڈے کا رحمانی توڑ

اللہ رب العزت نے فرمایا: ایسی باتیں کرنے والے مومنوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے یہ باتیں کرتے تھے۔ ان کا حال یہ ہے:

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا.[۱]

(یہ) وہی لوگ ہیں جنہوں نے باوجود اس کے کہ خود (گھروں میں) بیٹھے رہے اپنے بھائیوں کی نسبت کہا کہ اگر وہ ہمارا کہا مانتے تو نہ مارے جاتے۔

غزوہ اُحد میں بہت بڑے نقصان کی وجہ سے اب ان لوگوں کو بات کرنے کا موقع ملا جو کہتے تھے کہ اگر ہماری بات مان لیتے تو یہ سب کچھ اس طرح نہ ہوتا اور نہ مارے جاتے۔ اُن لوگوں کے طعن کو ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○[۲]

فرما دیں: تم اپنے آپ کو موت سے بچا لینا، اگر تم سچے ہو○

یہ فرما کر یقین پختہ کیا جا رہا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو پھر اپنی جانوں کو موت سے بچا کر دکھاؤ۔ دیکھتے ہیں کہ جب تمہاری موت کا وقت آئے گا تو گھروں میں بیٹھ جانے کے سبب تمہیں موت کیسے نہیں آئے گی؟ گویا اِن آیات میں کبھی اللہ تعالیٰ منافقوں کی سوچ کو مخاطب کرتے ہوئے اسے مسترد کرتا ہے، کبھی کافروں کے طعنوں کو رد کرتا ہے، کبھی عوام کی بزدلی اور وسوسہ اندازی کو رد کرتا ہے اور کبھی مومنوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں مختلف انداز سے حوصلے دیتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ط بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ

---

(۱) آل عمران، ۳:۱۶۸

(۲) آل عمران، ۳: ۱۶۸

یُرْزَقُوْنَo[1]

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں انہیں ہرگز مردہ خیال (بھی) نہ کرنا، بلکہ وہ اپنے ربّ کے حضور زندہ ہیں انہیں (جنت کی نعمتوں کا) رزق دیا جاتا ہےo

ان شہداء کو حیاتِ جاودانی کی نعمتوں کی خوش خبری سناتے ہوئے مزید فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ط لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌo[2]

جن لوگوں نے زخم کھا چکنے کے بعد بھی اللہ اور رسول (ﷺ) کے حکم پر لبیک کہا، اُن میں جو صاحبانِ اِحسان ہیں اور پرہیزگار ہیں، ان کے لیے بڑا اَجر ہےo

۱۳۔ کڑے امتحان میں اللہ تعالیٰ کی اپنے حبیب ﷺ کو ڈھارس

آقاے دو جہاں ﷺ پریشان نہیں ہوتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ اس پریشانی سے ماورا تھے، مگر جب آپ ﷺ اپنے غلاموں کو حالات کے زیر و بم سے پریشان دیکھتے تو ان غلاموں کو پریشان، دکھی اور تکلیف زدہ دیکھ کر قلب اَطہر پر ملال طاری ہوجاتا تھا۔ جب کفار حضور ﷺ کی نبوت و رسالت، قرآن اور ایمان کا انکار کرتے، اسلام کا مذاق اڑاتے، تکذیب کرتے تو اس سے رسول اللہ ﷺ کا دل دکھی ہوتا۔ اس موقع پر اللہ رب العزت حضور ﷺ سے پیار کی بات کرتا:

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِo[3]

(۱) آل عمران، ۳: ۱۶۹
(۲) آل عمران، ۳: ۱۷۲
(۳) آل عمران، ۳: ۱۸۴

پھر بھی اگر آپ کو جھٹلائیں تو (محبوب آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں) آپ سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کو جھٹلایا گیا جو واضح نشانیاں (یعنی معجزات) اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھےo

حضور ﷺ کی ڈھارس بندھانے کے بعد اللہ رب العزت پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہوا اور فرمایا: یہ منافق لوگ تمہیں کہتے ہیں کہ تمہیں مروا دیا۔ خبردار! انہیں بتا دو!

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ. (۱)

ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے۔

فرق یہ ہے کہ کس کو کیسے موت آتی ہے؟ بزدلی کی موت آتی ہے یا جواں مردی کی موت؟ گویا یقین کو دل میں بٹھا دیا کہ موت تو ہر ایک کو آنی ہے لہٰذا ڈر کس بات کا ہے؟

اگلی آیت میں فرمایا:

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا. (۲)

(اے مسلمانو!) تمہیں ضرور بالضرور تمہارے اموال اور تمہاری جانوں میں آزمایا جائے گا اور تمہیں بہر صورت ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ان لوگوں سے جو مشرک ہیں بہت سے اذیت ناک (طعنے) سننے ہوں گے۔

گویا اللہ نے نظام ایسا بنایا ہے کہ جو اذیت دیتے ہیں، اُن کی طرف سے تمہیں ضرور بالضرور طعنے بھی سننے کو ملتے ہیں۔ قرآن مجید نے حق کی راہ میں ہونے والی جدوجہد کے ظاہری نتائج کے بعد کی صورتِ حال بالکل واضح کر دی کہ اہل حق کو اگر کبھی ظاہری شکست کا سامنا کرنا پڑا تو انہیں اِن حالات سے ہر صورت دو چار ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا اِن سوالات پر دِل برداشتہ نہ

---

(۱) آل عمران، ۳: ۱۸۵

(۲) آل عمران، ۳: ۱۸۶

ہونا؛ شکوک وشبہات اور وساوس کا شکار نہ ہونا۔

قرآن مجید نے اپنے اس اسلوب سے کسی سوال کو تشنہ نہیں چھوڑا؟ اللہ رب العزت نے فرمایا: یہودی، کفار ومشرکین اور دین کے دشمنوں سے تم ضرور بالضرور یہ طعنے سنو گے۔ بلا شبہ اس سے دکھ بھی ہوگا اور اذیت و پریشانی بھی ہوگی، مگر:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِo(۱)

اور اگر تم صبر کرتے رہو اور تقویٰ اختیار کیے رکھو تو یہ بڑی ہمت کے کاموں سے ہےo

۱۴۔ پیغامِ اِستقامت

قرآن مجید کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ مومن کا کام اپنے اندر یقین پیدا کرنا ہے۔ کیسے بھی کڑے حالات ہوں، مومن کا یقین کبھی متزلزل نہیں ہوتا۔ وہ صبر و استقامت کا پہاڑ بن کر توکل پر قائم رہتا ہے۔ ایسی صورت ہی میں فتح اس کے قدم چومتی ہے۔ اَہل حق کے سفر میں مشکلات آتی ہیں، مصائب آتے ہیں، دشمنوں کے طعنے بھی سننے کو ملتے ہیں، لیکن مومن کا کام یہ ہے کہ وہ ہرگز ملال کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ اپنا کام کرتے رہیں اور تم اپنا کام کرتے رہو۔ مالکِ کائنات کے امور کو کبھی اپنے ہاتھ میں نہ لینا۔

اللہ رب العزت نے تحریک منہاج القرآن کو حق کی عظمت اور فتح یابی کے لیے چنا ہے، لہٰذا تحریک کے کارکنان اپنے اندر ایمان و یقین کی پختگی، تقویٰ اور عبادت کی کثرت پیدا کریں۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنے، اپنے اخلاق کو سنوانے اور اللہ پر توکل و یقین کو مزید پختہ کرنے پر محنت کریں۔ یہاں تک کہ ہمارے اعمال اور اخلاق میں یقین و ایمان کی خوشبو آئے۔

اس صورتِ حال میں ہماری زندگی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام اور اَئمہ حق کی پیروی کا نمونہ بن جائے۔ یہ تحریک حق کی تحریک ہے، یہ مشن حق کا مشن ہے، یہ جد و جہد حق

(۱) آل عمران، ۳:۱۸۶

کی جد و جہد ہے۔ بشارت ہو کہ تحریک کے کارکنان اَہلِ حق ہیں اور اَہلِ حق کو غلبہ مل کر رہے گا اور ان شاء اللہ مصطفوی اِنقلاب آ کر رہے گا۔ ہم فتح یاب ہوئے، فتح یاب ہوں گے اور ہمیشہ فتح یاب رہیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں شکست نہیں دے سکتی۔ اسی لیے کہ ربِ دو جہاں کا فرمان ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○[1]

اورتم ہمت نہ ہارو اور نہ غم کرو اورتم ہی غالب آؤ گے اگرتم (کامل) ایمان رکھتے ہو○

تحریک کی انقلابی جد و جہد میں ہمیں اُنہی حالات کا سامنا کرنا پڑا اور کرنا پڑ رہا ہے جن حالات سے صحابہ کرام ﷢ اور اسلام کے جملہ اَئمہ گزرے۔ اِنہی حالات کی طرف قرآن مجید کی مذکورہ آیات اور اُسوۂ رسول ﷺ میں اشارہ کیا گیا ہے اور اِن حالات سے نبرد آزما ہونے بارے رہنمائی عطا کی گئی ہے کہ اور ان حالات و واقعات کا سامنا کرنے کے لیے صبر و یقین اور استقامت کا دامن ہمیشہ تھامے رکھیں۔ فتح تمہارا ہی مقدر ہوگی۔

(۱) آل عمران، ۳: ۱۳۹

باب چہارُم

آزمائشیں
اِیمان میں اِضافہ کا باعث ہیں

قرآن مجید سے بہتر سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ قرآن مجید آقا ﷺ کی سیرت کا بیان بھی ہے۔ چونکہ وہ وحی الٰہی پر مبنی ہے اس لیے جداگانہ انداز میں ہے۔ قرآن مجید میں ہمیں جگہ جگہ انبیاء کرام علیہم السلام اور مومنین کا آزمائشوں، مصائب اور مشکلات کا شکار ہونے کا بیان نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح کے سنگین حالات سے دو چار ہوئے اور کیسے ان حالات میں صبر، یقین اور استقامت کے ساتھ حق پر قائم رہے۔ گزشتہ ابواب میں ہم غزوۂ اُحد اور غزوۂ حنین کے حوالے سے تفصیلی مطالعہ کر چکے۔ اس باب میں ہم قرآن مجید کے مزید اُن مقامات کا مطالعہ کریں گے جن میں ایمان، یقین اور استقامت کے حوالے سے اَہلِ ایمان کی تربیت کا سامان موجود ہے۔

تاریخِ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ کفار و مشرکین کی جانب سے حضور نبی اکرم ﷺ پر طعنہ زنی بھی ہوئی، پتھراؤ بھی ہوئے، جسد اقدس پر ایسے حملے بھی ہوئے کہ لہولہان کر دیا گیا اور دندان مبارک کو شہید کیا گیا۔ اَوائلِ اِسلام میں مشرکین کی جانب سے شہرِ مکہ کے داخلی راستوں کی ناکہ بندی کر دی جاتی، ہر راستے پر قریش کے شریر جتھوں کی صورت میں اکٹھے ہو کر بیٹھ جاتے۔ باہر سے جو بھی شخص مکہ میں داخل ہوتا، اس کے سامنے حضور ﷺ کی نسبت غلط بیانیاں کرتے۔ اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا کہ اگر وہ آپ ﷺ کی زیارت کا ارادہ لے کر حاضر ہو رہا ہے تو وہ اس ارادے کو ترک کر دے۔ یوں مشرکینِ مکہ اپنا حسد، بغض اور عناد ظاہر کرتے تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس مخالفت کا اثر یوں رُونما ہوتا کہ باہر سے آنے والے جس شخص کا پہلے ملاقات کا ارادہ نہ بھی ہوتا، کفارِ مکہ کی شدید مخالفانہ باتیں سن کر خواہش کرتا کہ ایک بار جا کر آپ ﷺ کو دیکھوں اور سنوں تو سہی کہ آخر آپ کہتے کیا ہیں؟ گویا دوسرے لفظوں میں مشرکینِ مکہ اپنی دانست میں مخالفت کرتے ہوئے بھی مصطفوی مشن کا کام کر رہے تھے، یعنی ان کے

پراپیگنڈہ سے لوگوں کو بہر طور ترغیب مل رہی تھی۔

آقاے دو جہاں ﷺ نے شعبِ ابی طالب میں تین سال تک محاصرہ اور مقاطعہ کی صعوبتیں بھی جھیلیں اور ہر طرح کے مصائب کا سامنا بھی کیا۔ آپ ﷺ کے گھر کا محاصرہ ہوا، شہید کرنے کی کوششیں کی گئیں، طعنہ زنی کی گئی، الزام تراشی کی گئی۔ الغرض وہ کچھ کیا گیا جس کا عام انسان تصور بھی نہیں کرسکتا۔ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ بھی ایسے واقعات سے لبریز ہے۔ قرآن مجید شاہد ہے کہ ایسے حالات میں بتقاضاے بشریت حضور ﷺ کے قلب اَطہر پر اگر کچھ اثر انداز ہوتا اور کچھ گراں گزرتا تو اللہ رب العزت ایسی صورتِ حال کے پیشِ نظر اپنے حبیب ﷺ کی طرف پیغامات اور احکامات نازل فرماتا۔ ان پیغامات میں سے ایک یہ تھا:

وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا.[1]

اور (اے حبیبِ مکرّم! اِن کی باتوں سے غمزدہ نہ ہوں) آپ اپنے رب کے حکم کی خاطر صبر جاری رکھیے بے شک آپ (ہر وقت) ہماری آنکھوں کے سامنے (رہتے) ہیں۔

یعنی اے محبوب! آپ ان کے مظالم، ریشہ دوانیوں، مخالفتوں، مزاحمتوں، سازشوں اور طعنہ زنیوں کو نہ دیکھیں بلکہ میرے حکم کی لاج رکھیں اور میری خاطر صبر کیا کریں۔ آپ اس بات پر خوش رہیں کہ ہم ہر وقت آپ کو اپنی نگاہوں اور اپنے دھیان میں رکھتے ہیں۔

گویا قرآنِ مقدس کی اس آیت کریمہ میں دو سمتیں دکھائی جا رہی ہیں:

۱۔ ایک طرف مخالفین کے دیے گئے مصائب، ان کے طعنہ زنی، مخالفت اور دل کو شکستہ کر دینے والے حالات کی اِنتہاء تھی۔

۲۔ دوسری جانب اللہ رب العزت کے لطف و کرم اور اِحسان و اِنعام کی یہ انتہا تھی کہ وہ ہمہ وقت محبوب ﷺ کو اپنی نگاہِ محبت کے ساتھ تکتا رہتا تھا۔

---

(۱) الطور، ۴۸:۵۲

آیتِ کریمہ میں یہ اشارہ کیا جا رہا ہے کہ اے محبوب! آپ ان کی طعنہ زنی کو کیوں دیکھتے ہیں؟ آپ اُدھر کیوں دھیان کرتے ہیں؟ آپ ﷺ ہماری طرف دھیان کریں، ہم ہر وقت آپ ﷺ کو تکتے رہتے ہیں۔ ایک طرف مخالفین کی زیادتیاں ہیں اور دوسری جانب رب کریم کی لطف و کرم کی یہ انتہا ہے کہ وہ شفقت کی نگاہ سے ہمہ وقت آپ ﷺ کو دیکھ رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جسے اللہ کی نگاہوں میں اتنی قربت حاصل ہو، اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیے جائیں تو اسے کوئی ہرا نہیں سکتا۔ دشمنانِ اسلام کی طعنہ زنیاں اور مخالفین کی مزاحمتیں ربِ کائنات کی طرف سے حاصل ہونے والی توجہات کے مقابلے میں تو معمولی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظامِ مخالفت، نظامِ عداوت، نظامِ مزاحمت اور اس کے تحت جو بھی مظالم ڈھائے جاتے، حضور ﷺ اُنہیں غبارِ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آپ ﷺ انہیں لمحہ بھر میں ہی بھول جاتے اور ہمہ وقت اللہ رب العزت کے لطف و کرم، عنایت اور شفقت و محبت پر مطمئن اور صابر و شاکر رہتے۔

۱۔ صبرِ مصطفیٰ ﷺ کا عظیم اِظہار

حضور ﷺ پر جو مظالم ڈھائے گئے، تکالیف آئیں، مصائب آئے، الزام تراشیاں ہوئیں، تہمتیں لگائی گئیں، سازشیں کی گئیں، اذیتیں دی گئیں اور اتنا پریشان کیا گیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی خاطر رُوئے زمین پر جتنا مجھے ستایا گیا ہے اتنا کسی کو نہیں ستایا گیا۔[1]

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! جب غزوہ اُحد کے دن آپ پر کافروں نے سنگ باری کی، گلاب کی پنکھڑیوں سے زیادہ نرم و نازک رخسار زخمی ہو گئے، دندان مبارک شہید ہو گئے اور جسدِ اقدس سے خون بہنے لگا۔ کیا آپ ﷺ کی زندگی میں اس سے بڑھ کر بھی کوئی تکلیف کا مقام آیا ہے؟ اِس پر آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے

---

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۱۲۰، رقم: ۱۲۲۴۳

۲۔ ترمذی، السنن، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع، باب: (۳۴)، ۴: ۶۴۵، رقم: ۲۴۷۲

عائشہ! تم غزوہ اُحد کی تکلیف کی بات کرتی ہو، اللہ کی عزت کی قسم! اس سے بھی کئی گنا بڑھ کر تکلیف وہ تھی جو طائف کے بازاروں میں پتھروں کی بارش میں ہوئی۔ مجھ پر اتنی سنگ زنی کی گئی کہ میرے لیے قدم اُٹھانا دشوار ہوگیا تھا۔ جیسے ہی میں قدم اُٹھاتا تو کفار میرے ٹخنوں کا نشانہ لے کر پتھر برساتے۔ (۱)

سفرِ طائف میں حضورِ نبی اکرم ﷺ سرِ انور سے قدمِ متبرک تک لہو میں نہا گئے اور زخموں سے اس قدر چور چور ہوئے کہ ایک طرف ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اس دوران میں شہر طائف کے اُمرا نے غنڈوں، بدمعاشوں اور اوباشوں کے ہاتھوں میں پتھر تھما کر راستے کے دونوں طرف کھڑا کر دیا تھا۔ وہ لوگ حضور ﷺ کو پتھر بھی مارتے اور ساتھ میں نازیبا کلمات بھی کہتے۔ پیغمبرِ اخلاق ﷺ اس دشمنی اور عداوت سے بھرے ہوئے ماحول میں صبر و استقامت کا لازوال پیکر بن کر ڈٹے رہے، تا آنکہ غیرتِ الٰہیہ جوش میں آ گئی اور سیدنا جبریل امین علیہ السلام اور ان فرشتوں کو بھیجا گیا جن کے سپرد پہاڑ ہیں۔ اُنہوں نے بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، آپ پر ظلم کی انتہا ہوگئی ہے، ہم اس سے بڑھ کر آپ پر ظلم و ستم ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔ اگر آپ اجازت دیں تو طائف کی بستی کو بلندی پر لے جا کر اُلٹ دیں یا دو پہاڑوں کے درمیان اِسے یوں پیس دیں کہ پھر قیامت تک اس بستی میں کوئی متنفس پیدا نہ ہو سکے اور نہ ہی یہاں کوئی زندہ رہ سکے۔ ان کی اس پیش کش پر حضور ﷺ نے تبسم ریز ہوتے ہوئے فرمایا: تمہارے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا ہے لیکن محمد تو ابھی صبر کرنے والا

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکة، ۳:۱۱۸۰، رقم: ۳۰۵۹

۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب الجهاد والسیر، باب ما لقي النبي ﷺ من أذی المشرکین والمنافقین، ۳:۱۴۲۰، رقم: ۱۷۹۵

۳۔ نسائي، السنن الکبری، ۴:۴۰۵، رقم: ۷۷۰۶

۴۔ ابن حبان، الصحیح، ۱۴:۵۱۶، رقم: ۶۵۶۱

۵۔ طبراني، المعجم الأوسط، ۸:۳۷۰، رقم: ۸۹۰۲

ہے۔

آپ ﷺ نے اِن حالات میں بھی صبر، استقامت اور یقین کا دامن نہ چھوڑا۔ آپ ﷺ اِن حالات میں بھی پُر اُمید رہے کہ ان شاء اللہ ایک دن آئے گا کہ یہ لوگ مصطفوی انقلاب کے جاں نثار سپاہی بنیں گے۔ فرمایا:

بَلْ أَرْجُو أَنْ يُخْرِجَ اللهُ مِنْ أَصْلَابِهِمْ مَنْ يَعْبُدُ اللهَ وَحْدَهُ، لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا.(۱)

مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن کے اَصلاب سے ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو خدائے واحد کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ ایسے دل سوز واقعات سے لبریز ہے۔ اللہ جل مجدہٗ نے آقا ﷺ پر اپنی نگاہِ شفقت کو جمائے رکھنے کا یہ کرم بے شک پہلے بھی فرمایا تھا، مگر بطور خاص ایک آیتِ کریمہ ایسی ہے جو بتاتی ہے کہ یہ حضور ﷺ کے اُس صبر کا اجر تھا جو انہوں نے دشمنوں کی طعنہ زنی اور مصائب و آلام پر فرمایا تھا۔ یہ اس صبر کا صلہ ملا ہے کہ اللہ رب العزت کی شفقت بھری نگاہیں ہر وقت حضور ﷺ پر جم گئیں۔ آپ ﷺ جدھر بھی تشریف لے جاتے اللہ تعالیٰ کی نگاہِ شفقت میں محصور رہتے۔ جب حضور ﷺ استراحت فرماتے تو اللہ تبارک تعالیٰ تب بھی انہیں تکتا اور جب جاگتے تب بھی مولا کی نگاہِ شفقت حضور ﷺ پر ہی ہوتی۔ آقاے دو جہاں ﷺ

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب بدء الخلق، باب ذكر الملائكة، ۳: ۱۱۸۰، رقم: ۳۰۵۹

۲۔ مسلم، الصحيح، كتاب الجهاد والسير، باب ما لقي النبي ﷺ من أذى المشركين والمنافقين، ۳: ۱۴۲۰، رقم: ۱۷۹۵

۳۔ نسائي، السنن الكبرى، ۴: ۴۰۵، رقم: ۷۷۰۶

۴۔ ابن حبان، الصحيح، ۱۴: ۵۱۶، رقم: ۶۵۶۱

۵۔ طبراني، المعجم الأوسط، ۸: ۳۷۰، رقم: ۸۹۰۲

کا سفر ہوتا، حضر ہوتا، کلام و سکوت ہوتا یا نشست و برخاست؛ الغرض حضور ﷺ کی زندگی میں جو وقت بھی آتا، اللہ رب العزت انہیں شفقت سے تکتا رہتا۔ انعام و اکرام کا یہ عظیم سلسلہ مصائب پر صبر کرنے کا اَجر تھا۔ وہ خاص آیت مبارکہ آیتِ درود تھی۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًاo[1]

بے شک اللہ اور اس کے (سب) فرشتے نبیِ (مکرّم ﷺ) پر درود بھیجتے رہتے ہیں، اے ایمان والو! تم (بھی) اُن پر درود بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کروo

۲۔ صابرین کے لیے اِنعام و اِکرام

حضور نبی اکرم ﷺ کے وسیلے سے سوائے نبوت کے اُمتِ مسلمہ کے افراد کو بھی ان ساری نعمتوں اور احسانات سے حسبِ حال حصہ ملتا ہے۔ واضح رہے کہ حضور ﷺ کے بعد کسی کو نبوت و رسالت کے منصب پر فائز نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اللہ رب العزت نے یہ دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند فرما دیا ہے۔ نبوت و رسالت کے منصب کو چھوڑ کر فیوضات و علومِ نبوت میں سے اور اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں جو حضور ﷺ کو عطا ہوئیں، اُن میں سے اُمت کو بھی فیض ملتا ہے۔ آپ ﷺ کی اُمت میں جو آپ ﷺ کے دامن کو تھام لے اور آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلے، اسے ان نعمتوں میں سے ان کی حیثیت کے مطابق فیض ملتا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۵۶ - ﴿اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًاo﴾ ’بے شک اللہ اور اس کے (سب) فرشتے نبیِ (مکرّم ﷺ) پر درود بھیجتے رہتے ہیں، اے ایمان والو! تم (بھی) اُن پر درود بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو‘ نازل ہوئی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: یا رسول اللہ! ہم سے وعدہ ہے کہ آپ کو عطا کردہ ہر نعمت میں

(۱) الأحزاب، ۳۳:۵۶

سے آپ کے اُمتی کو بھی حصہ ملتا ہے۔ اللہ رب العزت نے یہ نعمت خاص طور پر آپ ﷺ پر فرمائی کہ رب العزت آپ ﷺ پر درود بھیجتا ہے اور رحمتیں و برکتیں نازل فرماتا اور آپ ﷺ کے درجات بلند سے بلند تر فرماتا ہے۔ حضور! آپ کے وسیلے سے اس فیض میں سے کیا کچھ حصہ ہمیں بھی نصیب ہوسکتا ہے؟ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں اس میں سے بھی اُمت کو فیض ملا ہے۔ صحابیِ رسول کا یہ سوال کرنا تھا کہ یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی:

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ○[1]

وہی ہے جو تم پر درود بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی، تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے جائے اور وہ مومنوں پر بڑی مہربانی فرمانے والا ہے۔[2]

یعنی اللہ رب العزت مومنین پر رحمت فرماتا ہے تاکہ ان کی زندگی سے ظلمتیں چھٹ جائیں اور ان کا جو قدم بھی اٹھے وہ نور کی جانب بڑھتا چلا جائے۔ ان کے وجود سے ظلمتیں چھٹتی چلی جائیں اور اس نور سے ہر سُو اُجالے پھیلتے جائیں۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ ایسا اس لیے کرتی ہے کیونکہ وہ مومنوں پر رحم فرمانے والا ہے۔ اللہ رب العزت نے حضور ﷺ کے توسل سے اُمتِ مسلمہ کو یہ حصہ عطا فرمایا کہ ان کو رحمتیں عطا فرمائیں، برکتیں دیں اور ان کے درجات بلند کیے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلاۃ نازل ہونے کا مطلب خصوصی رحمتوں، برکتوں، انعامات، احسانات، لطف و کرم، خاص نظر کرم، شفقت اور بلندی درجات کا نصیب ہونا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رحمتوں کے یہ حصے بطور صلوٰۃ کس شکل میں آتے ہیں؟ قرآن مجید دوسرے مقام پر اس امر کی تصریح یوں فرماتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ

---

(۱) الأحزاب، ۳۳:۴۳

(۲) بغوی، معالم التنزیل، ۳:۵۳۴

وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ قف وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝[1]

اور ہم ضرور بالضرور تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے، اور (اے حبیب!) آپ (ان) صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیں ۝ جن پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کہتے ہیں: بے شک ہم بھی اللہ ہی کا (مال) ہیں اور ہم بھی اسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں ۝ یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے پے در پے نوازشیں ہیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں ۝

یعنی مصائب و مشکلات کی صورت میں یہ سارے حالات پیدا ہوتے ہیں تاکہ تمہیں پرکھیں کہ اس وقت صبر کرتے ہو یا صبر کا دامن چھوڑ دیتے ہو۔ جو صبر و استقامت کی راہ پر ثابت قدم رہتا ہے، اُسے حضور ﷺ کے وسیلے سے اللہ اپنی حفاظت میں یوں رکھتا ہے کہ ان پر رحمتوں، برکتوں اور عنایتوں کی بارش برساتا ہے اور اس شکل میں اپنی صلوٰۃ اتارتا ہے کہ وہ ساری مشکلات کے باوجود کامیابیوں کی طرف رواں دواں رہتے ہیں۔ ان کے قدم کامیابیوں کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ وہ فوز و فلاح کی منزلیں طے کرتے چلے جاتے ہیں اور مخالفین انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ وہ کچھ عرصہ بعد دیکھتے ہیں کہ بادِ مخالف کے تند و تیز تھپیڑوں سے ان کی کامیابیاں مزید بڑھ گئی ہیں۔

اِس طرح پیکرانِ جرأت و استقامت کو وقت کے فرعونوں، یزیدوں اور ابنِ زیادوں کے سامنے ڈٹ جانے پر دونوں جہانوں کی کامیابی کی منزل پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ اس عظیم مرتبے پر فائز ہونے والو! اگر تمہیں اللہ تعالیٰ نے صبر کی توفیق عطا فرمائی ہے تو تم خوش نصیب ہو؛ مگر یاد رہے! اس نعمتِ عظمیٰ پر کبھی مت اِترانا کیونکہ یہ کامیابیاں تمہاری ذاتی صلاحیتوں کے

(۱) البقرۃ، ۲:۱۵۵-۱۵۷

سبب نہیں اور یہ صبر بھی تمہارا اپنا کمال نہیں ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ جس رب نے یہ مشکلات اور آزمائشیں عطا کی ہیں، صبر کی توفیق بھی اُسی نے دی ہے اور اُسی ذاتِ باری تعالیٰ نے کامیابی بھی عطا فرمائی ہے۔ وہ بھی اُسی کی جانب سے تھا، یہ بھی اُسی کی طرف سے ہے اور وہ تو تمہارے لیے حالات پیدا کرتا رہتا ہے۔

اللہ رب العزت جب چاہتا ہے کہ تمہارے صدیوں کے سفر کو برسوں میں اور سالوں کے سفر کو دنوں میں طے کر دے، وہ آوازِ حق جو لاکھوں افراد تک پہنچی ہے، اسے کروڑوں افراد تک پہنچایا جائے، تب آسمانوں پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ انسان کی کوششوں کے اسباب اس قابل نہیں ہوتے کہ سالوں کے سفر دنوں میں طے ہو جائیں اور صدیوں کے سفر سالوں میں طے ہو جائیں۔ لہٰذا رب ذوالجلال ان حق پرستوں کے مقابل ہوائیں اڑاتا ہے، مخالفتوں کے طوفان بپا کرتا ہے؛ آندھیاں، جھکڑ اور ژالہ باری لاتا ہے۔ وہ ہنگامے کبھی مختصر عرصہ کے لیے چلتے ہیں اور کبھی لمبی مدت تک چلتے ہیں، مگر باطل کے جھونکے کتنے ہی کڑے ہوں، وہ ہمیشہ عارضی ہوتے ہیں۔ جب مخالفت ختم ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا بندہ دیکھتا ہے کہ میرا سفر کہاں تھا اور ان آندھیوں نے مجھے اُٹھا کر اتنے بڑے مقام پر پہنچا دیا ہے کہ سالوں کا سفر چشمِ زدن میں طے ہو گیا ہے۔

۳۔ مصائب و آلام اللہ تعالیٰ کی رحمت ثابت ہوتے ہیں

یہ اَمر ذہن نشین رہے کہ کڑے حالات ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت بن کر آتے ہیں۔ جیسے کسی کو بیماری آ جائے تو یہ بیماری اس کے نامہ اعمال سے گناہ مٹا دینے کا بہانہ بنتی ہے۔ اگر بندے کو تکلیف، پریشانی یا مصیبت آئے تو اللہ تعالیٰ اس کے درجات بلند فرما دیتا ہے، کیونکہ اس طرح بندے کو توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑاتے ہوئے اپنے گناہوں کی سیاہی کو اشکوں کے پانی سے دھو ڈالتا ہے۔ اس طرح اس کا اللہ پر توکل مضبوط ہوتا ہے، وہ پہلے سے بھی بڑھ کر جھکتا ہے۔ نتیجتاً اُس پر رحمتِ الٰہی کی گھٹا جھوم جھوم کر برستی ہے۔ اسی طرح اولیاء اور صوفیاء کے ہاں بھی ایسے مقامات آتے ہیں۔ اللہ رب العزت جب ان کے درجات اور رفتار کو بڑھانا چاہتا ہے تو ان پر آزمائش اور ابتلا لاتا ہے۔

اس آزمائش کی گھاٹی میں سے جونہی وہ سرخرو ہو کر گزرتے ہیں تو آن کی آن میں کئی منزلیں طے کر چکے ہوتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے تحریکِ منہاج القرآن پر بھی اسی قسم کے لطف و کرم کا ارادہ فرما رکھا ہے۔ وہ ذات جب کسی کی رفتار کو دفعتاً بڑھانا اور لمبی مسافت قلیل عرصہ میں طے کرانا چاہتی ہے تو حق کی مخالفت میں دوسرے لوگ سامنے آتے ہیں۔ اہلِ جبر پوری تن دہی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں، وہ اہلِ حق کو گالیاں دیتے ہیں، طعنہ زنی کرتے ہیں، تہمتیں لگاتے اور پورے زور و شور سے ہنگامہ بپا کرتے ہیں۔ اِدھر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اہلِ حق کو بھی توفیقِ صبر عطا ہو جاتی ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہنگامہ بپا کرنے والے تو وہیں موجود ہوتے ہیں لیکن اُن کی مخالفت کا شکار تحریک صدیوں کا سفر دنوں میں طے کر چکی ہوتی ہے۔

یاد رکھیں! ہمیشہ اللہ کی رضا اور اس کے فیصلوں پر صابر رہا کریں۔ حضور ﷺ کی اُمت میں حق کی راہ پر چلنے والے ہمیشہ اسی طریق پر چلائے گئے ہیں اور ان مردانِ حق میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے راہِ حق میں قدم اُٹھایا ہو اور وہ طعنوں، گالیوں، مصیبتوں اور پریشانیوں کے بغیر خاموشی سے منزلِ مقصود پر پہنچ گیا ہو۔ حق کا راستہ ایسا ہے کہ جس پر قدم رکھتے ہی آزمائشیں شروع ہو جاتی ہیں اور اگر آزمائشوں سے گھبرانا ہو تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قدم رکھنا ہی نہیں چاہیے۔ حوصلے پست ہوں تو بڑی منزلوں کو اپنا مقصد نہیں بنایا جاتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور خدمتِ اُمتِ مصطفیٰ ﷺ جیسے بڑے مقصد کو اپنا حرزِ جاں بنا لیا جائے تو پھر حوصلے اونچے کرنا پڑتے ہیں۔ تلواروں سے گردنیں بھی کٹ جائیں تو زبان پر افسوس، غم اور تاسف کا ادنیٰ سا لفظ بھی نہیں لایا کرتے۔ دشمنوں کے برستے تیروں پر بھی مسکراتے ہوئے آگے بڑھا کرتے ہیں۔ حالات کیسے بھی ہوں اَہلِ حق کسی بھی صورت پریشان نہیں ہوا کرتے۔ اللہ رب العزت نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ.[1]

---

(۱) فصلت، ۴۱:۳۰

بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ (اِس پر مضبوطی سے) قائم ہوگئے، تو اُن پر فرشتے اُترتے ہیں۔

دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مان لینے والے اور بتانِ باطلہ کو ٹھوکر سے پاش پاش کر دینے والے، مفادات نفسانی کو ٹھوکر سے ریزہ ریزہ کر دینے والے صرف ذاتِ باری تعالیٰ کے طالب ہوتے ہیں، وہ 'ثُمَّ اسْتَقَامُوْا' کے قاصد ہوتے ہیں۔ مصائب میں ثابت قدمی ان کی زندگی کا وطیرہ بن جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُن کی ثابت قدمی پر بطور صلہ فرشتوں کے ذریعے مدد فرماتا ہے۔

۴۔ غزوۂ اَحزاب: آزمائش اور اِستقامت کی عظیم مثال

قرآن مجید کے متعدد مقامات میں سے سورۃ الاحزاب بھی وہ مقام ہے جس میں حضور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ شریک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آزمائشوں اور امتحانات میں صبر و استقامت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آیئے! اس سورتِ مبارکہ کی آیات کی روشنی میں اُن حالات و واقعات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

غزوۂ احزاب کا دوسرا نام غزوۂ خندق بھی ہے۔ 'حزب' عربی زبان میں لشکر کو کہتے ہیں، جس کی جمع 'احزاب' ہے۔ اس غزوہ کو احزاب اس لیے کہتے ہیں کہ قریشِ مکہ، کفار اور دیگر مشرکین کے کئی قبائل اور لشکر اکٹھے ہو کر ایک بڑے جنگی اتحاد کی صورت میں مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ قرآن مجید اُن کی کثیر تعداد اور اُن کی ہیبت کو یوں بیان فرماتا ہے:

اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللهِ الظُّنُوْنَا○[1]

جب وہ (کافر) تمہارے اوپر (وادی کی بالائی مشرقی جانب) سے اور تمہارے نیچے (وادی کی زیریں مغربی جانب) سے چڑھ آئے تھے اور جب (ہیبت سے تمہاری)

---

(۱) الأحزاب، ۳۳:۱۰

آنکھیں پھر گئی تھیں اور (دہشت سے تمہارے) دل حلقوم تک آ پہنچے تھے اور تم (خوف و امید کی کیفیت میں) اللہ کی نسبت مختلف گمان کرنے لگے تھےo

آزمائش و ابتلاء کے اُس موقع پر قرآن مجید کی آیات ہر لمحے لشکرِ اِسلام کا حوصلہ بڑھاتی رہیں تاکہ ان کی ہمت پست نہ ہو۔ قرآنِ مجید نے ان حالات کو سخت آزمائش کہا۔ ارشاد فرمایا:

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًاo(۱)

اُس مقام پر مومنوں کی آزمائش کی گئی اور انہیں نہایت سخت جھٹکے دیے گئےo

جو لوگ آزمائشوں سے دوچار ہوئے اور مصائب برداشت کیے، قرآن کا انہیں مومن کہنا اس بات کی غمازی ہے کہ راہِ حق پر اہلِ حق کا آزمائشوں اور مشکلات سے گزرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ کفار کی اس قدر کثیر تعداد میں آمد کی اطلاع پا کر لشکرِ اسلام کی جانب سے یہ فیصلہ ہوا کہ مدینہ منورہ کے گرد گہری خندق کھودی جائے تاکہ کفار مدینہ منورہ کے اندر داخل نہ ہوسکیں۔ رسولِ مکرم نبیِ معظم ﷺ نے صحابہ کرام ﷺ کی مشاورت سے مدینہ منورہ کے اردگرد خندق کھودی تاکہ مدینہ کے اندر رہ کر دفاع کیا جا سکے۔

(۱) اَہلِ حق پر طعنہ زنی کرنے والے طبقات

اِس موقع پر قرآن مجید نے مدینہ طیبہ کے اندر رہنے والے دو طبقوں کا ذکر کیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ جہاد کے لیے نہ نکلے۔ ارشاد فرمایا:

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًاo(۲)

اور جب منافق لوگ اور وہ لوگ جن کے دلوں میں (کمزوریِ عقیدہ اور شک و شبہ

(۱) الأحزاب، ۳۳:۱۱

(۲) الأحزاب، ۳۳: ۱۲

کی) بیماری تھی، یہ کہنے لگے کہ ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے صرف دھوکہ اور فریب کے لیے (فتح کا) وعدہ کیا تھا○

۱۔ قرآن مجید نے ایک طبقہ کو منافق کہا جو مومنوں کو طعنے دیتا تھا۔

۲۔ دوسرا طبقہ جو باتیں کرتا اور طعنے دیتا تھا، اُنہیں وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ سے تعبیر فرمایا کہ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا تھا جن کا عقیدہ کمزور تھا اور ان کے دلوں میں شک و شبہ کی بیماری تھی۔ قرآن مجید نے اس طبقہ کو منافقوں سے الگ ذکر کیا۔ جہاد میں شرکت نہ کرنے والے تمام لوگوں کو منافقین کہہ کر اُن کے عمل کی بات نہیں کی۔

گویا ایک طبقہ منافقین کا تھا اور ایک طبقہ وہ تھا جو منافقوں والی بات کرتا تھا مگر اُنہیں منافق نہیں کہا بلکہ بیان کیا کہ ان کے دلوں میں شک و شبہ تھا اور ایمان کی کمزوری کی بیماری تھی۔ اس تقسیم سے معلوم ہوا کہ ہر آدمی ایمان میں ایک جیسے مقام پر نہیں ہوتا بلکہ ایمان کے درجات میں فرق کے باعث اُن کے ٹائٹل بھی بدل جاتے ہیں۔

یہ دونوں طبقات (منافقین اور ایمان میں کمزور، شک و شبہ کے حامل) مومنین کو کس کس طرح کے طعنے دیتے، قرآن نے اسے بھی بیان فرمایا۔ وہ کہتے:

مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا○[1]

ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے صرف دھوکہ اور فریب کے لیے (فتح کا) وعدہ کیا تھا○

یعنی وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہتے کہ (معاذ اللہ!) اللہ رب العزت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہیں دھوکہ دیا ہے۔ کوئی فتح وغیرہ نہیں ہونی، یہ اُن کا جھوٹا وعدہ ہے۔ (**أستغفر اللہ العظیم**)۔ اِس سے اندازہ کر لیں کہ کتنے بڑے بڑے طعنے اہل حق کو دیے گئے۔ حق کی جد و جہد میں کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر بھی کسی نے طعنے سنے ہوں گے؟

---

(۱) الأحزاب، ۳۳: ۱۲

(۲) میدانِ عمل سے راہِ فرار اِختیار کرنا منافقین کا شیوہ ہے

قرآن حکیم منافقین کی طعن وتشنیع اور جنگ میں شرکت نہ کرنے کے بہانے بھی بیان کرتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاِذۡ قَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ يٰۤاَهۡلَ يَثۡرِبَ لَا مُقَامَ لَـكُمۡ فَارۡجِعُوۡا‌ۚ وَيَسۡتَاۡذِنُ فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمُ النَّبِىَّ يَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ بُيُوۡتَنَا عَوۡرَةٌ ؕ‌ وَمَا هِىَ بِعَوۡرَةٍ ‌ۛۚ اِنۡ يُّرِيۡدُوۡنَ اِلَّا فِرَارًا ○[1]

اور جب کہ اُن میں سے ایک گروہ کہنے لگا: اے اہلِ یثرب! تمہارے (بحفاظت) ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں رہی، تم واپس (گھروں کو) چلے جاؤ اور ان میں سے ایک گروہ نبی (اکرم ﷺ) سے یہ کہتے ہوئے (واپس جانے کی) اجازت مانگنے لگا کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں، حالانکہ وہ کھلے نہ تھے، وہ (اس بہانے سے) صرف فرار چاہتے تھے○

یعنی منافقین فتح و کامیابی کی نوید کو دھوکہ قرار دیتے ہوئے مسلمانوں سے کہتے کہ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ گھروں کو لوٹ جاؤ۔ انہوں نے خود تو نہ نکلنے کا عذر اور بہانہ بنانا ہی تھا، لہٰذا خود کو قصوروار ٹھہرانے کے بجائے الٹا اللہ کی راہ میں نکلنے والوں پر طعنہ زنی کرنے لگے کہ تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ واپس آجاؤ۔ ان کے اس پراپیگنڈے اور طعنہ زنی سے عام لوگ متاثر ہونے لگے۔

دورِ رسالت میں بھی ہر قسم کے طبقات موجود تھے۔ ایمان و یقین کا پھل پکتے پکتے پکتا ہے۔ ہر کوئی پہلے دن سے پکا ہوا نہیں ہوتا۔ اِن حالات میں آقائے دو جہاں ﷺ کے صبر اور حوصلوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جن کے لیے وہ اپنی زندگی کے آرام ترک کر رہے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی جانیں دے رہے ہیں، وہی لوگ مختلف حیلے بہانے تراشنے لگے۔ چنانچہ

---

(۱) الأحزاب، ۳۳:۱۳

عوام کا ایک گروہ حضور نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور گھروں کو واپس جانے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ شافعِ محشر ﷺ نے پوچھا: کیوں؟ اُنہوں نے کہا: ہمارے گھر کھلے پڑے ہوئے ہیں، ڈر ہے کوئی چوری نہ ہو جائے، حالانکہ وہ کھلے نہ تھے۔ گویا وہ اس طرح کی باتیں رسولِ مکرم ﷺ سے کرتے تھے۔ پہلے تو وہ صحابہ کرام ﷺ کے دیکھا دیکھی گھروں سے نکل پڑے تھے، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ادھر تو اتنی افواج آ گئیں، اب کوئی راستہ نہیں تو مایوس ہو کر کہنے لگے: حضور! آپ ہمیں اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت دے دیں۔ قرآن نے اُن کے دلوں کا حال بیان فرما دیا کہ وہ اس بہانے سے صرف فرار چاہتے تھے۔

مومنین کی جد و جہد میں کوئی ایک بھی صورتِ حال ایسی نہیں ہے جس میں مخالفین کی جانب سے طعنہ زنی نہ ہوئی ہو اور قرآن اس کا پہلے ہی جواب نہ دے چکا ہو۔ راہِ حق پر گامزن اہلِ حق کو اگر مخالفین کی جانب سے طعنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ قرآن مجید کے ان مقامات سے روشنی حاصل کریں اور صورتِ حال سے گھبرانے کے بجائے مردانہ وار مقابلہ کریں۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلنے والے، نہ نکلنے والے اور نکلنے کے بعد فرار اختیار کرنے والے تب بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ انسانی تاریخ میں یہ تینوں طبقات ہمیشہ سے رہے ہیں۔ شاہِ عرب وعجم حضرت محمد ﷺ جیسی قیادت تو کائنات میں دوسری نہیں ہے۔ تصور کریں! آقائے دو جہاں ﷺ کے صبر اور حوصلے کا عالم کیا ہوگا؟ یہ حق کی منزل تک پہنچنے کے لیے راستے کے مصائب ہیں۔ یہ گھبراہٹ کی باتیں نہیں ہیں بلکہ ایک فطری عمل ہے۔

اِسی مقام پر قرآن مجید کی اگلی آیات تسلسل کے ساتھ منافقین کی سوچ اور اُن کے انجام کو بیان کر رہی ہیں۔ یہ آیات اتنی واضح ہیں کہ قاری خود بخود اُن حالات اور اس پر قرآن مجید کے ردِّ عمل کا جائزہ لے سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ○ [1]

---

(۱) الأحزاب، ۳۳:۱۴

اور اگر ان پر مدینہ کے اطراف و اکناف سے فوجیں داخل کر دی جاتیں پھر اِن (نِفاق کا عقیدہ رکھنے والوں) سے فتنہ (کفر و شرک) کا سوال کیا جاتا تو وہ اس (مطالبہ) کو بھی پورا کر دیتے، اور تھوڑے سے توقّف کے سوا اس میں تاخیر نہ کرتے○

حالانکہ قرآن کہتا ہے:

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَكَانَ عَهْدُ اللهِ مَسْئُوْلًا○[1]

اور بے شک انہوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کر رکھا تھا کہ پیٹھ پھیر کر نہ بھاگیں گے اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی (ضرور) بازپُرس ہوگی○

یعنی اُنہوں نے یہ وعدہ تو کر رکھا تھا کہ جب کبھی وقت آیا تو ہم پیٹھ پھیر کر نہیں بھاگیں گے بلکہ آپ کے ساتھ رہیں گے؛ لیکن جب کبھی کوئی موقع آیا تو منافقین نے اس عہد کو توڑا۔ اُن کے میدانِ عمل سے فرار کی حقیقت بیان کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا○[2]

فرما دیجیے: تمہیں فرار ہرگز کوئی نفع نہ دے گا، اگر تم موت یا قتل سے (ڈر کر) بھاگے ہو تو تم تھوڑی سی مدت کے سوا (زندگانی کا) کوئی فائدہ نہ اٹھا سکو گے○

پھر اسی موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے جہاد سے روکنے والوں کو متنبہ فرما دیا:

قَدْ يَعْلَمُ اللهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا○[3]

---

(۱) الأحزاب، ۳۳:۱۵

(۲) الأحزاب، ۳۳:۱۶

(۳) الأحزاب، ۳۳:۱۸

بے شک اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا ہے جو (رسول ﷺ سے اور ان کی معیّت میں جہاد سے) روکتے ہیں اور جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہماری طرف آ جاؤ اور یہ لوگ لڑائی میں نہیں آتے مگر بہت ہی کم ○

(۳) اُسوۂ حسنہ - ذاتِ مصطفیٰ ﷺ

منافقین اور شک و شبہ کی بیماری والے افراد کے حیلے بہانے، راہِ فرار کی حقیقت اور اس کے انجام کو بیان کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (۱)

فی الحقیقت تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ کی ذات) میں نہایت ہی حسین نمونۂ (حیات) ہے۔

اِس آیت مبارکہ میں قرآن مجید نے اہلِ ایمان پر واضح کر دیا کہ لوگوں کی باتوں پر غور نہ کرو، اُن کے طعنے نہ سنو بلکہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کو دیکھو۔ تمہارے لیے ہادیِ برحق ﷺ کی ذات ہی اُسوۂ حسنہ ہے، لہٰذا اُنہی کی پیروی کرو۔ آقاے دو جہاں ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کس طرف لے کر جا رہے ہیں، ان کی تربیت کس انداز سے فرما رہے ہیں، صرف اُسی راستے کی پیروی کرو۔

(۴) مشکلات و مصائب ایمان میں اِضافہ کا باعث ہیں

لشکرِ کفار کی کثرت نے منافقین اور تشکیک میں مبتلا عام لوگوں پر کیا اثر ڈالا، اس بارے میں ہم جان چکے۔ اب دیکھتے ہیں کہ کفار کے لشکر کی آمد نے مومنین کاملین پر کیا اثرات مرتب کیے؟ حضرات ابوبکر، و عمر اور عثمان و علی اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب کافروں کے بہت زیادہ لشکر دیکھے تو اُن کا ردّعمل کیا تھا؟

---

(۱) الأحزاب، ۳۳: ۲۱

اِس کی وضاحت بھی قرآن مجید نے اِن الفاظ میں فرما دی:

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ز وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا○(۱)

اور جب اہلِ ایمان نے (کافروں کے) لشکر دیکھے تو بول اٹھے کہ یہ ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) نے ہم سے وعدہ فرمایا تھا اور اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) نے سچ فرمایا ہے سو اس (منظر) سے ان کے ایمان اور اطاعت گزاری میں اضافہ ہی ہوا○

منافقین کے برعکس مومنین کا ایمان اور مضبوط ہو گیا اور کہنے لگے کہ یہی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ راہِ حق میں جد و جہد کے دوران ایسی مشکلات آئیں گی، لشکر در لشکر آئیں گے، سو اب ہم وہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے اس منظر کو دیکھا تو ان کا ایمان اور مضبوط ہو گیا۔

بعد ازاں لڑائی میں ان مومنین میں سے کچھ نے راہِ حق میں جدوجہد کا حق ادا کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا اور کئی شہادت کی تمنا کو دلوں میں پالتے ہوئے جدوجہد میں مصروف رہے، اُن کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا○(۲)

مومنوں میں سے (بہت سے) مَردوں نے وہ بات سچ کر دکھائی جس پر انہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا، پس ان میں سے کوئی (تو شہادت پا کر) اپنی نذر پوری کر چکا ہے اور ان میں سے کوئی (اپنی باری کا) انتظار کر رہا ہے، مگر انہوں نے (اپنے عہد

---

(۱) الأحزاب، ۳۳: ۲۲

(۲) الأحزاب، ۳۳:۲۳

میں) ذرا بھی تبدیلی نہیں کیo

اپنے عہد کو پورا کرنے والے ان مومنین میں مرد بھی تھے اور خواتین بھی تھیں، مگر قرآن نے یہاں صرف مردوں کا ذکر کیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ مرد کی تعریف یہ ہے کہ وہ فرد جو اپنے عہد کو پورا کرے اسے مرد کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ خواتین بھی مرد ہی تھیں، جنہوں نے ہر مشکل کو پسِ پشت ڈال کر اپنا عہد پورا کیا۔ خالقِ کائنات نے اُن مردانِ حق کے عہد کو پورا کرنے اور عہد پورا کرنے کے انتظار کو بھی اپنے کلام میں بیان فرما دیا۔

شک و شبہ کی بیماری ایمان کی کمزوری ہے۔ جن اہلِ حق کو اللہ تعالیٰ نے ایمان میں ثابت قدمی دے دی، اُن کا طرۂ امتیاز اور شیوہ فقط یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہم نے عہد کیا تھا، جب وقت آئے گا حق کے لیے لڑیں گے، کٹیں گے، مریں گے۔ جب وقت آتا تو وہ شہادتیں حاصل کرنے والوں کے بارے میں کہتے کہ انہوں نے اپنا فریضہ بخوبی سرانجام دیا، ہماری باری کب آئے گی؟ ہمیں کب بلایا جائے گا؟ یہ ہے ایمان، یہ ہے طرزِ فکر، یہ ہے سوچ کا رخ اور یہ ہے قرآن کا پیغام۔ جو کوئی اس سے ذرا سا دائیں بائیں ہٹے تو سمجھ لو یہ نفاق یا حالتِ ایمان میں تشکیک کی آمیزش ہے۔ ابھی ایمان قلوب اَذہان میں پختہ نہیں ہوا۔

۵۔ آزمائشوں اور مشکلات کا مقصد - سورۂ محمد کی روشنی میں

اللہ رب العزت نے اِسی مضمون کو سورۃ محمد میں بھی بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَاْ اَخْبَارَكُمْo(۱)

اور ہم ضرور تمہاری آزمائش کریں گے یہاں تک کہ تم میں سے (ثابت قدمی کے ساتھ) جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو (بھی) ظاہر کر دیں اور تمہاری

(۱) محمد، ۴۷: ۳۱

(منافقانہ بزدلی کی مخفی) خبریں (بھی) ظاہر کر دیں۝

ان آزمائشوں اور مشکلات لانے کا مقصد یہ ہے کہ مجاہد بھی نکھر جائیں تاکہ دنیا جان لے کہ یہ مجاہد ہیں اور صابر لوگ بھی نکھر جائیں اور دنیا جان لے کہ یہ صبر کرنے والے ہیں۔

آزمائشوں پر مومنین کے ایمان کی کیفیت اور اُن کے مجاہد و صابر ہونے کو بیان کرنے کے بعد اللہ رب العزت نے اُنہیں فتح کی نوید دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ۝[1]

(اے مومنو!) پس تم ہمت نہ ہارو اور ان (متحارب کافروں) سے صلح کی درخواست نہ کرو (کہیں تمہاری کمزوری ظاہر نہ ہو)، اور تم ہی غالب رہو گے، اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال (کا ثواب) ہرگز کم نہ کرے گا۝

یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ تمہاری جد و جہد کبھی بے کار نہیں جائے گی۔ گویا راہِ حق میں پیش آنے والی ہر چیز اللہ تعالیٰ اپنے پاک کلام کے ذریعے بیان فرما رہا ہے۔

قرآن مجید کا یہ پیغام جو گذشتہ صفحات پر سورۃ البقرۃ، سورۃ آلِ عمران، سورۃ الاحزاب اور سورۂ محمد کی آیات کی روشنی میں بیان کیا، راہِ حق میں جد و جہد کرنے والے اہلِ حق اِن آیات کو کبھی نہ بھولیں۔ یہ آپ کے ایمان، عقیدہ اور فکر و نظریے کو مضبوط رکھنے کے لیے عمر بھر کا اثاثہ ہے۔

۶۔ صلحِ حدیبیہ - یقینِ کامل کی شاندار مثال

رہبرِ انسانیت حضرت محمد ﷺ کو مکہ مکرمہ چھوڑے ہوئے چھ برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ بیت اللہ کی زیارت کی تمنا آپ ﷺ کے سینۂ مقدسہ میں مچلتی رہتی تھی۔ ایک روز آپ ﷺ نے

(۱) محمد، ۴۷: ۳۵

خواب میں دیکھا کہ ہم احرام پہنے طواف کر رہے ہیں، عمرہ کر رہے ہیں، حلق کروا رہے ہیں اور قربانیاں دے رہے ہیں۔ آقاے دو جہاں ﷺ نے یہ تمام احوال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بیان فرمائے۔ نبی علیہ السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ عوام الناس کے خواب کی طرح نبی علیہ السلام کا خواب نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب عمرہ کرنا اور اس کے بعد احرام کھولنا، قربانی دینے کا منظر حضور نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بیان کیا تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ مکرمہ جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ اس لیے کہ بصورتِ خواب وحی کے بعد شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔ آقا ﷺ ذو القعدہ چھ (٦) ہجری بروز سوموار اِحرام باندھ کر پندرہ سو (۱,۵۰۰) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ قربانی کے جانور اپنے ساتھ لیے عمرہ کرنے کے لیے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ واضح رہے کہ آقاے دو جہاں ﷺ مشرکینِ مکہ سے جنگ لڑنے کے لیے نہیں بلکہ خالصتاً عمرہ کی ادائیگی کے لیے نکلے تھے۔

آپ ﷺ نے مدینہ منورہ میں حضرت نمیلہ بن عبد اللہ اللیثی رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔[1] جب کہ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کو عبوری امیر مقرر کیا۔[2]

خاتم الانبیا ﷺ کو اندازہ تھا کہ ممکن ہے کفار و مشرکین رکاوٹ ڈالیں اور انہیں مکہ میں داخل نہ ہونے دیں اور جنگ شروع کر دیں۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اس امر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زیادہ سے زیادہ تعداد ہمراہ لے جانی چاہیے۔ آقاے دو جہاں ﷺ نے اعلانِ عام کروا دیا اور عوام سے بھی ساتھ چلنے کا ارشاد فرمایا۔ سیرت کی کتب میں مذکور ہے:

وَاسْتَنْفَرَ الْعَرَبَ وَمَنْ حَوْلَهُ مِنْ أَهْلِ الْبَوَادِي مِنَ الْأَعْرَابِ لِيَخْرُجُوا مَعَهُ.[3]

---

(۱) ابن کثیر، البداية والنهاية، ۴: ۱۶۴

(۲) ابن سعد، الطبقات الكبرى، ۲: ۷۴

(۳) ۱۔ ابن هشام، السيرة النبوية، ۴: ۲۷۵

۲۔ طبري، تاريخ الأمم والملوك، ۲: ۱۱۶

آپ ﷺ نے سفر مکہ کے لیے اَہلیانِ عرب اور قرب و جوار کے دیہاتی علاقوں سے لوگوں کو اکٹھا کیا۔

چنانچہ رسولِ مکرم ﷺ کے ہمراہ عمرہ کرنے کے لیے سب لوگ چل پڑے اور ایک دوسرے کے دیکھا دیکھی تعداد بڑھ کر پندرہ سو تک جا پہنچی۔ ان پندرہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تمام حالتِ ایمان میں مختلف درجات کے حامل تھے۔ ان میں عوام بھی تھے اور خاص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے۔ قرآن و حدیث نے عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو 'اہل البوادی' اور 'اَعراب' کہا ہے یعنی گاؤں قصبوں کے رہنے والے لوگ۔ مدینہ منورہ کے قرب و جوار میں رہنے والے دیہاتی لوگوں کو نہ مومن کہا اور نہ ہی منافق کہا بلکہ انہیں عام عوام کہا گیا ہے۔ سب اکٹھے ہو کر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کئی اعرابی (عوام) ایسے بھی تھے جو ساتھ نہیں گئے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی آمد کی خبر جب کفارِ مکہ کو ملی تو انہوں نے بھی اپنے کچھ لوگوں کو مدینہ کی طرف بھیج دیا۔ ان مشرکینِ مکہ کا مسلمانوں کے ساتھ سامنا حدیبیہ کے مقام پر ہوا۔ آنے والے مشرکین نے وہاں موجود پانی کے چشمے پر قبضہ کر لیا۔ آپ ﷺ نے وہاں ایک اور کنواں دیکھا جس میں تھوڑا سا پانی تھا، آپ ﷺ نے پانی کی موجودگی پر وہاں پڑاؤ ڈال لیا۔ اُس جگہ کو حدیبیہ کہتے ہیں۔ (۱)

حدیبیہ کے مقام پر موجود کنویں میں تھوڑا سا پانی تھا، جو جلد ہی ختم ہو گیا۔ اب پندرہ سو لوگوں کے پاس نہ تو پینے کا پانی تھا اور نہ ہی قربانی کے جانوروں کو پلانے کا۔ اس صورتِ حال میں تمام لشکر والے پریشان حال بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا: یا رسول اللہ! پانی کی ایک بوند بھی نہیں ہے اور لوگ شدتِ پیاس سے نڈھال ہو رہے ہیں۔ صاحبِ جود وسخا ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی برتن لے آؤ جس میں تھوڑا سا پانی ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فوراً حکم

.... ۳۔ ابن کثیر، البدایة والنہایة، ۴: ۱۶۴

۴۔ عینی، عمدة القاری، ۱۴: ۶

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد والمصالحة، ۲: ۹۷۴ رقم: ۲۵۸۱

کی تعمیل کی۔ رحمۃٌ للعالمین ﷺ نے اس برتن میں خیر و برکت سے لبریز اپنی مبارک انگلیاں داخل فرما دیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا:

فَانْفَجَرَتْ مِنْ بَيْنِ أَصَابِعِهِ عُيُوْنٌ وَأَمَرَ بِلَالًا، فَقَالَ: نَادِ فِي النَّاسِ الْوَضُوْءَ الْمُبَارَکَ.[1]

آپ ﷺ کی مبارک انگلیوں سے پانی کے چشمے پھوٹ پڑے، آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ لوگوں میں اعلان کردو کہ (آؤ اور) مبارک پانی سے وضو کر لو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم نے حضورِ اقدس ﷺ کی مبارک انگلیوں سے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے پھوٹتے دیکھے۔ ہادیِ برحق ﷺ نے برتن میں موجود تھوڑے سے پانی کو بڑھایا نہیں بلکہ اپنی انگلیوں سے پانی پیدا فرما دیا۔ اس کے بعد سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سیر ہو کر خود بھی پانی پیا، جانوروں کو بھی پلایا اور غسل اور وضو کا اہتمام بھی کیا۔

(ا) مذاکرات میں پہل

سید المرسلین حضرت محمد ﷺ نے حدیبیہ پہنچ کر قریشِ مکہ سے مذاکرات کے لیے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بطور ایلچی مکہ بھیجا اور ارشاد فرمایا کہ قریشِ مکہ سے بات کریں کہ ہم جنگ کے لیے نہیں بلکہ خالصتاً عمرہ کی ادائیگی کے لیے آئے ہیں اور بعد ازاں ہم امن سے مدینہ واپس

---

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱: ۲۵۱، ۳۲۴، رقم: ۲۲۶۸، ۲۹۹۱
۲۔ بیہقی، دلائل النبوۃ، ۴: ۱۲۸
۳۔ بیہقی، الاعتقاد: ۲۷۳
۴۔ فریابی، دلائل النبوۃ: ۷۵-۷۶، رقم: ۴۰
۵۔ ذہبی، تاریخ الإسلام، ۲: ۳۸۲
۶۔ ابن کثیر، البدایة والنهایة، ۶: ۹۷
۷۔ سیوطی، الخصائص الکبری، ۲: ۷۰

چلے جائیں گے۔ سیدنا عثمان غنی ﷛ نے اُن سے مذاکرات کیے مگر قریشِ مکہ نے انکار کرتے ہوئے سرورِ دو جہاں ﷺ سے براہِ راست مذاکرات کے لیے حدیبیہ میں وفود بھیجے۔ مشرکین نے اس دوران حضرت عثمان ﷛ کو پیشکش کی کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کو طوافِ کعبہ کرنے کی اجازت ہے، مگر انہوں نے اُن کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

مختلف لوگوں کی سوچیں بھی ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں۔ پندرہ سو صحابہ کرام ﷡ میں پختہ بھی تھے اور عوام الناس بھی۔ وہاں چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ عثمان غنی تو بڑے خوش نصیب ہیں، انہوں نے تو بیت اللہ کا طواف بھی کر لیا ہوگا۔ افسوس! ہم اس سعادت سے محروم رہ گئے۔ یہ گفت گو جب نبی محتشم ﷺ کی بارگاہِ اقدس تک پہنچی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَا أَظُنُّهُ طَافَ بِالْبَيْتِ وَنَحْنُ مَحْصُورُونَ. (۱)

مجھے یقین ہے کہ جب تک ہم یہاں محصور بیٹھے ہوں تب تک وہ (عثمان غنی) کبھی طوافِ کعبہ نہیں کریں گے۔

یہ آپ ﷺ کا اپنے جاں نثار و وفادار صحابی حضرت عثمان غنی ﷛ پر اعتماد کا عالم تھا۔ یہ باتیں ابھی ہو رہی تھیں کہ اتنے میں حضرت عثمان غنی ﷛ بھی حدیبیہ واپس پہنچ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی کئی لوگ ان کو مبارک باد دینے لگے کہ آپ نے طوافِ کعبہ کر لیا۔ اس پر حضرت ذوالنورین ﷛ نے فرمایا:

بِئْسَ مَا ظَنَنْتُمْ بِي. (۲)

---

(۱) ۱۔ بیہقی، دلائل النبوۃ، ۴: ۱۳۴
۲۔ ابن عساکر، تاریخ مدینۃ دمشق، ۳۹: ۷۸
۳۔ ہندی، کنز العمال، ۱۰: ۲۱۸، رقم: ۳۰۱۵۲

(۲) ۱۔ بیہقی، دلائل النبوۃ، ۴: ۱۳۴
۲۔ ابن عساکر، تاریخ مدینۃ دمشق، ۳۹: ۷۸
۳۔ ہندی، کنز العمال، ۱۰: ۲۱۸، رقم: ۳۰۱۵۲

تم نے میرے بارے میں بہت برا گمان کیا ہے۔

یعنی کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو کہ میں مصطفیٰ ﷺ کے بغیر کعبے کا طواف کر لوں گا؟ ہمیں تو کعبہ دکھانے والے محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور ہمیں کعبہ کا ماننے والا بنانے والے بھی احمد مجتبیٰ ﷺ ہی ہیں۔ میرے سرور ﷺ تو یہاں حدیبیہ میں مقیم ہیں، قریش انہیں مکہ میں داخلے کی اجازت نہیں دے رہے، کتنی خلافِ ادب بات ہے کہ میں انہیں چھوڑ کر تنہا کعبے کا طواف کرتا پھروں۔ اگر میں ایسا کرتا تو میرا ایمان ہی سلامت نہیں رہے گا۔ کفارِ مکہ نے مجھ سے ضرور کہا تھا کہ طواف کر لو، مگر میں نے انکار کیا کہ جب تک میرے آقا ﷺ طواف نہیں کریں گے میں کعبے کا طواف نہیں کروں گا۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر تاریخی الفاظ ادا فرمائے:

فَوَ الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ، لَوْ مَكَثْتُ بِهَا مُقِيْمًا سَنَةً، وَرَسُوْلُ اللهِ ﷺ مُقِيمٌ بِالْحُدَيْبِيَةِ مَا طُفْتُ بِهَا حَتّٰى يَطُوْفَ بِهَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ. (۱)

اللہ کی قسم اگر میں مکہ میں ایک سال بھی مقیم رہتا اور میرے محبوب حدیبیہ میں رہتے تو میں کبھی کعبے کا طواف نہ کرتا جب تک رسول اللہ ﷺ اس کا طواف نہ کر لیتے۔

(۲) بیعتِ رضوان

مقصودِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جب حدیبیہ میں قیام پذیر ہوئے تو کفار و مشرکین کے نمائندے بھی آ گئے اور پیغام دینے لگے کہ ہم مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ دوسری طرف یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ شاید کفارِ مکہ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا ہے۔ اس پر محسنِ انسانیت ﷺ نے عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خون کا قصاص لینے اور غلبۂ اسلام کے لیے

(۱) ۱۔ ابن عساکر، تاریخ مدینة دمشق، ۳۹: ۷۸
۲۔ ذہبی، تاریخ الإسلام، ۲: ۳۸۳
۳۔ ابن قیم، زاد المعاد، ۳: ۲۹۱
۴۔ ہندی، کنز العمال، ۱۰: ۲۱۸، رقم: ۱۵۰۱

مومنوں سے جان لٹا دینے کی بیعت کا اعلان کیا۔ اس بیعت پر قرآن کہتا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ ۚ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰہَدَ عَلَیۡہُ اللّٰہَ فَسَیُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ۝[1]

(اے حبیب!) بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں پر (آپ کے ہاتھ کی صورت میں) اللہ کا ہاتھ ہے۔ پھر جس شخص نے بیعت کو توڑا تو اس کے توڑنے کا وبال اس کی اپنی جان پر ہو گا اور جس نے (اس) بات کو پورا کیا جس (کے پورا کرنے) پر اس نے اللہ سے عہد کیا تھا تو وہ عنقریب اسے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا ۝

اس بیعت کو بیعتِ رضوان کہتے ہیں۔ یہ بیعت جس درخت کے نیچے ہوئی اس کا نام سمرہ تھا۔[2]

وہ ایک گھنا درخت تھا، جس کی ٹہنیاں زمین تک جھکی ہوئی تھیں۔ جب شمعِ بزمِ ہدایت ﷺ اپنے چودہ سو پروانوں سے بیعت لے رہے تھے تو صحابہ کرام ﷺ ٹہنیوں کو اُوپر اُٹھا کر کھڑے تھے تاکہ دور دور تک لوگ آپ ﷺ کا جلوہ دیکھ سکیں۔[3]

اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب ﷺ کے ان وفاداروں کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ اِسے قرآن

---

(۱) الفتح، ۴۸: ۱۰

(۲) ۱۔مسلم، الصحیح کتاب الإمارة، باب استحباب مبایعة الإمام الجیش، ۳: ۱۴۸۳، رقم: ۱۸۵۶

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۳۵۵، رقم: ۱۴۸۶۵

(۳) ۱۔مسلم، الصحیح کتاب الإمارة، باب استحباب مبایعة الإمام الجیش، ۳: ۱۴۸۵، رقم: ۱۸۵۸

۲۔طبرانی، المعجم الکبیر، ۲۰: ۲۲۷، رقم: ۵۳۲

مجید کا حصہ بنا دیا۔ ارشاد فرمایا:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ وَاَثَابَھُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا○(۱)

بے شک اللہ مومنوں سے راضی ہوگیا جب وہ (حدیبیہ میں) درخت کے نیچے آپ سے بیعت کررہے تھے، سو جو (جذبۂ صدق و وفا) ان کے دلوں میں تھا اللہ نے معلوم کرلیا تو اللہ نے ان (کے دلوں) پر خاص تسکین نازل فرمائی اور انہیں ایک بہت ہی قریب فتح (خیبر) کا انعام عطا کیا○

کفارِ مکہ کے وفد کے ساتھ مذاکرات ناکام ہو گئے۔ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا جا رہا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تن، من اور دھن لٹا دینے کی بیعت ہو رہی تھی، عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی مکہ مکرمہ سے واپس آ گئے تھے۔

اَہم نکتہ

مقامِ غور ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ لوگوں سے ثابت قدمی کی بیعت لے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ بیعت میرے نبی کے ہاتھ پر نہیں بلکہ میرے ہاتھ پر ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کا ہاتھ لشکرِ حق کو مکہ میں داخل نہیں کرسکتا تھا؟ وہ قادرِ کون و مکاں سب کچھ کرسکتا ہے مگر یہ اَہلِ حق کے لیے آزمائشوں کا سفر ہے۔ اللہ تعالیٰ اَہلِ حق کو آزمائشوں کی بھٹی میں ڈالتا اور ان کے ایمان کو مضبوط تر کرتا ہے۔ وہ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْر (۲) بخوبی جانتا ہے کہ فتح کا وقت کون سا ہے؟ مگر وہ ایمان والوں کو ان مراحل سے گزارتا ہے تاکہ وہ حق کی راہ میں پختہ ہو جائیں۔

---

(۱) الفتح، ۴۸: ۱۸

(۲) دلوں کی (پوشیدہ) باتوں کو خوب جاننے والا۔

(۳) صلح نامہ حدیبیہ اور مشرکینِ مکہ کی کڑی شرائط

بیعتِ رضوان کی خبر مکہ مکرمہ پہنچی تو وہاں سے مشرکین کے مذاکراتی وفود آنے لگے۔ پہلے آنے والے وفد کے سربراہ کا نام بدیل بن ورقاء الخزاعي تھا۔ اس کی ناکامی کے بعد دوسرا وفد مکرز بن حفص کی قیادت میں آیا۔ یہ وفد بھی کامیاب نہ ہو سکا تو تیسرا وفد حلیس بن علقمه الکناني کی رہنمائی میں آیا۔ جب ان تینوں وفود سے بات نہ بنی تو قریش مکہ نے اپنے سب سے بڑے نمائندہ عروہ بن مسعود کو بھیجا۔ اس کے جانے کے بعد سہیل بن عمرو کی قیادت میں وفد آیا۔ جس کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ آگے بڑھا۔ اس مذاکراتی عمل کے دوران بھی کفارِ مکہ کی طرف سے کڑی شرائط کا سامنا کرنا پڑا۔

اِس معاہدہ کی اَہم شرائط کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

۱۔ خاتم المرسلین ﷺ نے مذاکرات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کفار سے طے کردہ معاہدہ لکھنے کا حکم دیا کہ بِسۡمِ اللهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ لکھو۔ مشرکین کا نمائندہ سہیل بن عمرو کہنے لگا کہ ہم اپنے طریقے کے مطابق تحریر کے آغاز میں یہ لکھیں گے:

بِاسۡمِکَ اللّٰهُمَّ.(۱)

اے اللہ! میں تیرے نام سے ابتداء کرتا ہوں۔

شافعِ محشر ﷺ نے قیامِ اَمن اور اِنسانیت کے وسیع تر مفاد کی خاطر اتفاق فرمایا۔

---

(۱) ۱۔ بخاري، الصحیح، کتاب الصلح، باب الشروط في الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب وکتابة الشروط، ۲:۹۷۷، رقم:۲۵۸۱
۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب الجهاد والسیر، باب صلح الحدیبیة في الحدیبیة، ۳:۱۴۱۱، رقم:۱۷۸۴
۳۔ احمد بن حنبل، المسند، ۴:۳۲۵، رقم:۱۸۹۳۰
۴۔ حاکم، المستدرک، ۲:۱۶۶، رقم:۲۶۵۷

۲۔ صلح نامہ کا دوسرا آرٹیکل لکھواتے ہوئے حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اُكْتُبْ يَا عَلِيُّ، هٰذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ. (۱)

اے علی! لکھو کہ یہ معاہدہ محمد رسول اللہ ﷺ نے طے کیا ہے۔

سہیل بن عمرو نے پھر روک دیا اور کہا کہ ہم تو آپ کو رسول اللہ (ﷺ) مانتے ہی نہیں۔ اگر اس معاہدے کے نیچے ہم نے دستخط کر دیے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم نے آپ کو اللہ کا رسول (ﷺ) مان لیا۔ لہٰذا محمد بن عبد اللہ (ﷺ) لکھیں۔

پیکرِ امن و سلامتی ﷺ ہر صورت چاہتے تھے کہ معاہدہ ہو جائے کیونکہ جو احمدِ مجتبیٰ ﷺ کی نگاہِ دور اندیش دیکھ رہی تھی وہ کسی اور کے دائرۂ بصارت و بصیرت میں نہیں آ رہا تھا۔ محمد مصطفیٰ ﷺ نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ 'رسول اللہ' کا لفظ کاٹ دو۔ اسد اللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے قلم کی کیا مجال جو 'رسول اللہ' (ﷺ) کا لفظ کاٹ دے۔

یہ غیرتِ ایمانی ہے جو ایمان کا بنیادی حصہ ہے۔ حلیم و رحیم آقا ﷺ نے ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ معلمِ انسانیت ﷺ نے قلم لے کر خود کاٹ دیا۔ چنانچہ معاہدہ پر رسول اللہ کی جگہ محمد ﷺ بن عبداللہ لکھ دیا گیا۔

هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ. (۲)

یہ وہ (معاہدہ) ہے جس پر محمد ﷺ بن عبد اللہ نے فیصلہ کیا ہے۔

---

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱: ۳۴۲، رقم: ۳۱۸۷
۲۔ نسائی، السنن الکبری، ۵: ۱۶۷، رقم: ۸۵۷۵

(۲) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الصلح، باب کیف یکتب هذا ما صالح فلان بن فلان وفلان بن فلان وإن لم ینسبه إلی قبیلته أو نسبه، ۲: ۹۶۰، رقم: ۲۵۵۲
۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴: ۲۹۸، رقم: ۱۸۶۵۸
۳۔ ابن حبان، الصحیح، ۱۱: ۲۲۹، رقم: ۴۸۷۳

۳۔ اس معاہدہ کی تیسری اہم شرط یوں تحریر کی گئی:

هٰذَا مَا اصْطَلَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ وَسُهَيْلُ بْنُ عَمْرٍو عَلٰى وَضْعِ الْـحَرْبِ عَنِ النَّاسِ عَشْرَ سِنِينَ، يَأْمَنُ فِيهَا النَّاسُ، وَيَكُفُّ بَعْضُهُمْ عَنْ بَعْضٍ. (۱)

یہ وہ معاہدہ ہے جس پر محمد ﷺ بن عبد اللہ نے سہیل بن عمرو کے ساتھ اِس بات پر اتفاقِ رائے کیا کہ (فریقین کے مابین) دس (۱۰) سال تک جنگ نہیں ہوگی، اِس عرصہ میں لوگ امن کے ساتھ اور ایک دوسرے کو تکلیف دینے سے باز رہیں گے۔

۴۔ چوتھے آرٹیکل کے ذریعے مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت حاصل کی گئی:

مَنْ قَدِمَ مَكَّةَ مِنْ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ ﷺ، حَاجًّا أَوْ مُعْتَمِرًا أَوْ يَبْتَغِي مِنْ فَضْلِ اللهِ، فَهُوَ آمِنٌ عَلٰى دَمِهٖ وَمَالِهٖ. وَمَنْ قَدِمَ الْـمَدِينَةَ مِنْ قُرَيْشٍ مُجْتَازًا، إِلٰى مِصْرَ أَوْ إِلَى الشَّامِ، يَبْتَغِي مِنْ فَضْلِ اللهِ فَهُوَ آمِنٌ عَلٰى دَمِهٖ وَمَالِهٖ. (۲)

---

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴:۳۲۵، رقم:۱۸۹۳۰
۲۔ ابو داود، السنن، كتاب الجهاد، باب في صلح العدو، ۳:۸۶، رقم:۲۷۶۶
۳۔ بيهقى، السنن الكبرىٰ، ۹:۲۲۲، رقم:۱۸۵۸۹
۴۔ ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ، ۲:۹۷
۵۔ ابن ہشام، السيرة النبوية، ۴:۲۸۴-۲۸۶
۶۔ طبرى، تاريخ الأمم والملوك، ۲:۱۲۳

(۲) ۱۔ ابن أبى شيبة، المصنف، ۷:۳۸۵، رقم:۳۶۸۵۱
۲۔ ابن زنجويه، كتاب الأموال: ۳۹۵، رقم:۶۵۳
۳۔ طبرى، جامع البيان فى تفسير القرآن، ۲۶:۹۶

←

محمد ﷺ کے اَصحاب میں سے جو کوئی حج، عمرہ یا اللہ کے فضل (یعنی معاش) کے حصول کے لیے مکہ مکرمہ میں آیا تو وہ اپنے مال وجان کے حوالے سے مامون ہوگا۔ اِسی طرح جو کوئی قریش میں سے حصولِ معاش کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے گزر کر مصر یا شام کی طرف جائے تو وہ بھی اپنی جان و مال پر اَمن پانے والا ہوگا۔

۵۔ معاہدہ کی ایک اور اہم شرط قیدیوں کے تبادلہ کی تھی۔ بظاہر یہ شرط بھی سراسر قریش کے حق میں اور مسلمانوں کے خلاف تھی، لیکن بعد ازاں یہی شرط مسلمانوں کے حق میں بہتر ثابت ہوئی:

مَنْ أَتٰی رَسُولَ اللهِ ﷺ مِنْ أَصْحَابِهٖ بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهٖ رَدَّهٗ عَلَيْهِمْ، وَمَنْ أَتٰی قُرَيْشًا مِمَّنْ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ لَمْ يَرُدُّوهُ عَلَيْهِ. (1)

جو کوئی رسول اللہ ﷺ کے پاس اُس کے ساتھیوں میں سے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر آیا تو رسول اللہ ﷺ اُسے واپس کریں گے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں سے اگر کوئی قریش کے پاس آیا تو قریش اُسے واپس نہیں کریں گے۔

۶۔ اس معاہدہ کی پاس داری کی شرط میں کفارِ مکہ کو باندھ کر حضور نبی اکرم ﷺ نے وہ اہم مقصد حاصل کر لیا تھا جس کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فتح مبین کا ٹائٹل دیا۔

.... ۴۔ بلاذری، فتوح البلدان: ۴۹

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب الصلح، باب الصلح مع المشركين، ۲: ۹۶۱، رقم: ۲۵۵۳

۲۔ مسلم، الصحيح، كتاب الجهاد والسير، باب صلح الحديبية في الحديبية، ۳: ۱۴۱۱، رقم: ۱۷۸۴

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴: ۳۲۵، رقم: ۱۸۹۳۰

۴۔ أبو يعلى، المسند، ۶: ۶۹، رقم: ۳۳۲۳

۵۔ ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ، ۲: ۹۷

وَأَنَّ بَيْنَنَا عَيْبَةً مَكْفُوفَةً، وَإِنَّهُ لَا إِسْلَالَ وَلَا إِغْلَالَ.(۱)

خلوصِ دل سے اِس اَمر پر اتفاق کیا گیا ہے کہ اس معاہدہ کی مکمل پاس داری اور حفاظت کی جائے گی اور فریقین میں سے کسی کے خلاف چوری، دھوکہ دہی یا خیانت کا ارتکاب نہیں کیا جائے گا۔

۷۔ خطۂ عرب میں موجود قبائل کو بھی اس معاہدہ کا حصہ بنا کر ہادیِ عالم ﷺ نے مدینہ منورہ کو مشرکینِ مکہ کی جانب سے ہر قسم کی جارحیت سے دس سال کے لیے محفوظ بنا لیا اور اس کی بدولت اِسلام کی طاقت و قوت میں وہ اِضافہ ہوا کہ دو سال بعد ہی وہ مکہ جہاں مسلمانوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی، ریاستِ مدینہ کا حصہ بن گیا۔

مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَدْخُلَ فِي عَقْدِ مُحَمَّدٍ ﷺ وَعَهْدِهِ دَخَلَ فِيهِ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يَدْخُلَ فِي عَقْدِ قُرَيْشٍ وَعَهْدِهِمْ دَخَلَ فِيهِ. فَتَوَاثَبَتْ خُزَاعَةُ، فَقَالُوا: نَحْنُ مَعَ عَقْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَعَهْدِهِ؛ وَتَوَاثَبَتْ بَنُو بَكْرٍ، فَقَالُوا: نَحْنُ فِي عَقْدِ قُرَيْشٍ وَعَهْدِهِمْ.(۲)

---

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴: ۳۲۵، رقم: ۱۸۹۳۰
۲۔ أبو داود، السنن، كتاب الجهاد، باب في الصلح العدو، ۳: ۸۶، رقم: ۲۷۶۶
۳۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۲: ۹۷
۴۔ ابن ہشام، السيرة النبوية، ۴: ۲۸۵
۵۔ أبو عبيد القاسم بن سلام، كتاب الأموال: ۲۰۷، رقم: ۴۴۱

(۲) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴: ۳۲۵، رقم: ۱۸۹۳۰
۲۔ طحاوی، شرح معاني الآثار، ۳: ۳۱۵
۳۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۲: ۹۷
۴۔ ابن ہشام، السيرة النبوية، ۴: ۲۸۵
۵۔ مقدسي، البدء والتاريخ، ۴: ۲۲۵

جس کسی کو پسند ہو کہ وہ محمد ﷺ کے عقد و عہد میں داخل ہو تو وہ اُسے اختیار کر سکتا ہے، اور جس کو پسند ہو کہ وہ قریش کا اتحادی بنے تو وہ اُن کے عہد و پیمان میں داخل ہو سکتا ہے۔ بنوخزاعہ نے ثابت قدمی اختیار کی اور کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کے حلیف ہیں اور آپ کے عقد اور عہد و پیمان کے ساتھ ہیں؛ جب کہ بنو بکر نے قریش کے عہد و پیمان میں داخل ہونا پسند کیا اور کہا کہ ہم قریش کے حلیف ہیں اور ان کے عہد و پیماں کا حصہ ہیں۔

۸۔ اِس شرط میں قابلِ توجہ اَمر یہ تھا کہ مشرکینِ مکہ نے مسلمانوں کو عمرہ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا، گویا جس مقصد کے لیے مسلمان وہاں تک پہنچے تھے وہ حاصل نہ ہوا؛ مگر حضور نبی اکرم ﷺ کی نگاہِ بصیرت اس معاہدے کے ذریعے کئی بڑے مقاصد کا حصول دیکھ رہی تھی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اس کڑی شرط کو بھی قبول کر کے معاہدہ کا حصہ بنا دیا:

وَأَنَّکَ تَرْجِعُ عَنَّا عَامَنَا هٰذَا، فَـلَا تَدْخُلُ عَلَيْنَا مَكَّةَ، وَأَنَّهُ إِذَا كَانَ عَامُ قَابِلٍ، خَرَجْنَا عَنْکَ، فَتَدْخُلُهَا بِأَصْحَابِکَ، وَأَقَمْتَ فِيهِمْ ثَـلَاثًا مَعَکَ سِلَاحُ الرَّاكِبِ، لَا تَدْخُلُهَا بِغَيْرِ السُّيُوفِ فِي الْقُرُبِ.(۱)

.... ۶۔ طبری، تاريخ الأمم والملوك، ۲:۱۲۳، ۱۵۳

۷۔ بيهقي، دلائل النبوة، ۵:۶

(۱) ۱۔ بخاری، الصحيح، کتاب الصلح، باب کيف يکتب هذا ما صالح فلان بن فلان وفلان بن فلان وإن لم ينسبه إلی قبيلته أو نسبه، ۲:۹۵۹، رقم:۲۵۵۱

۲۔ مسلم، الصحيح، کتاب الجهاد والسير، باب صلح الحديبية في الحديبية، ۳:۱۴۰۹، رقم:۱۷۸۳

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴:۲۸۹، ۲۹۸، ۳۲۵، رقم:۱۸۵۶۸، ۱۸۶۵۸، ۱۸۹۳۰

۴۔ أبو يعلی، المسند، ۳:۲۶۱، رقم:۱۷۱۳

۵۔ أبو عوانه، المسند، ۴:۲۹۴، ۲۹۵، رقم:۶۷۹۳، ۶۷۹۶

آپ لوگ اس سال واپس لوٹ جائیں گے اور مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہوں گے۔ جب اگلا سال آئے گا تو ہم آپ کے لیے مکہ کو خالی کر دیں گے اور آپ اپنے صحابہ کے ساتھ اس میں داخل ہوں گے۔ آپ اس میں اپنے سفری اسلحہ کے ساتھ تین راتیں قیام کریں گے اور اپنی تلواریں نیاموں میں رکھے ہوئے ہی مکہ میں داخل ہوں گے۔

۹۔ نویں آرٹیکل میں اِس امر پر اتفاق کیا گیا کہ:

إِنَّ هٰذَا الْهَدْیَ حَیْثُ حَبَسْنَاهُ، فَهُوَ مَحَلُّهُ لَا یُقْدِمُهُ عَلَیْنَا. (۱)

قربانی کے اِن جانوروں کو جہاں ہم نے روکا ہے، وہی ان کا ٹھکانہ ہے۔ کوئی (زائر) اِس سے آگے ہماری طرف نہیں لائے گا۔

آقاے دو جہاں ﷺ نے ان تمام شرائط کو مِن وعَن قبول فرما لیا اور آخر میں معاہدہ پر فریقین کے دستخط ہوئے تا کہ معاہدہ کو قانونی و اخلاقی حیثیت حاصل ہو جائے۔ (۲)

---

(۱) ۱۔ ابن أبي شیبة، المصنف، ۷:۳۸۶، رقم: ۳۶۸۵۱
۲۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۲: ۱۰۳
۳۔ ابن زنجویه، کتاب الأموال: ۳۹۵، رقم: ۶۵۳
۴۔ طبری، جامع البیان في تفسیر القرآن، ۲۶: ۹۷
۵۔ ثعلبي، الکشف والبیان عن تفسیر القرآن، ۹: ۵۹

(۲) ۱۔ ابن ہشام، السیرة النبویة، ۴: ۲۸۷
۲۔ ابن جریر طبری، تاریخ الامم والملوك، ۲: ۱۲۳
۳۔ کلاعی، الإکتفاء بما تضمنه من مغازي رسول الله، ۲: ۱۷۹
۴۔ ثعلبی، الکشف والبیان، ۹: ۶۰
۵۔ ابن کثیر، البدایة والنهایة، ۴: ۱۶۸، ۱۶۹

(۴) صبر و ضبط ہی سے منزل کا حصول ممکن ہوتا ہے

ان شرائط کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ بخوبی تصور کر سکتے ہیں اُس وقت صحابہ کرام ﷡ کی کیفیات اور پریشانی کا عالم کیا ہو گا؟ اس لیے کہ صلح حدیبیہ کی تمام شرائط یک طرفہ تھیں اور اَہلِ مکہ کے حق میں جب کہ اَہلِ مدینہ کے خلاف دکھائی دے رہی تھیں۔ یہاں تک کہ بعض صحابہ کرام ﷡ تذبذب کی کیفیت میں بول پڑے: یا رسول اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ رسولِ مکرم ﷺ ارشاد فرماتے: خاموش رہو، کئی باتیں ایسی ہیں جو تمہارے علم میں نہیں ہیں۔

مستقبل کی ایک فتح تھی جو اِس اَمن معاہدے کے اندر چھپی ہوئی تھی جسے صاحبِ معراج ﷺ کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں، جب کہ پندرہ سو صحابہ کرام ﷡ اسے دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ تمام صحابہ کرام ﷡ پریشان حال تھے۔ صرف سیدنا صدیق اکبر ﷛ خاموش دکھائی دے رہے تھے، مگر بعض مواقع پر انہوں نے بھی سوال کیے۔ حضرت علی ﷛ معاہدہ کے نکات لکھتے جا رہے تھے، اس وقت ان کی دلی کیفیت بھی ان کے ہاتھوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

ابھی معاہدے پر دستخط نہیں ہوئے تھے کہ سہیل بن عمرو کے بیٹے حضرت ابو جندل ﷛ - جو اسلام قبول کر چکے تھے اور اسی پاداش میں کفار نے انہیں قید کر رکھا تھا - کسی طرح ہتھکڑیوں، بیڑیوں اور زخمی جسم کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ اُنہوں نے نم ناک آنکھوں کے ساتھ عرض کیا: یا رسول اللہ! مکہ کے مشرکین نے توحید پرست ہونے کے سبب مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے، مجھے آپ اپنے ساتھ لے جائیں، میں ان کے مظالم مزید برداشت نہیں کر سکتا۔

صادق اور امین نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں! ابو جندل میں یہ شرط قبول کر چکا ہوں۔ اُنہوں نے عرض کیا کہ ابھی معاہدے دستخط تو نہیں ہوئے۔ نبیِ محتشم ﷺ نے فرمایا: دستخط نہیں ہوئے مگر میں زبان دے چکا ہوں۔ ابوجندل بن سہیل نے دیکھا کہ خیر البشر ﷺ اُنہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا رہے تو اُنہوں نے صحابہ کرام ﷡ سے جذباتی خطاب کرتے ہوئے کہا:

أَيْ مَعْشَرَ الْمُسْلِمِيْنَ، أُرَدُّ إِلَى الْمُشْرِكِينَ وَقَدْ جِئْتُ مُسْلِمًا، أَلَا تَرَوْنَ

مَا قَدْ لَقِيْتُ؟ وَكَانَ قَدْ عُذِّبَ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي اللهِ.[1]

اے اَہلِ اسلام! تم میرے دین و ایمان کو آزمائش میں ڈال کر کفار کے رحم و کرم پر چھوڑے جا رہے ہو، حالاں کہ میں مسلمان ہو کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ ذرا میرا حال تو دیکھو! دینِ اِلٰہی اپنانے کی پاداش میں اُنہیں شدید زد و کوب کیا گیا تھا۔

ان کی اس جذباتی تقریر پر صحابہ کرام ﷡ جذبات میں آ گئے۔ عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے ماں باپ آپ پر قربان! ابو جندل کو بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ محبوبِ ربِ دو جہاں ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں! میں مشرکینِ مکہ کو زبان دے چکا ہوں۔ آخر کار حضرت ابو جندل ﷜ کو مشرکین کے حوالہ کر دیا گیا۔

یہ سارا منظر دیکھ کر سیدنا فاروق اعظم ﷜ کو اتنی پریشانی اور گھبراہٹ پیدا ہوئی کہ جذبات میں آ گئے اور عرض کیا:

أَوَلَسْنَا بِالْمُسْلِمِينَ؟

(آقا!) کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟

تصور کریں اَہلِ حق کا قافلہ کن کن آزمائشوں سے گزرا ہے۔ خاتم المرسلین ﷺ نے جواب میں فرمایا:

بَلٰى.

کیوں نہیں! (ہم مسلمان ہیں۔)

سیدنا فاروق اعظم ﷜ نے پھر عرض کیا:

أَوَ لَيْسُوا بِالْمُشْرِكِينَ؟

کیا وہ لوگ مشرکین نہیں ہیں؟

---

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد والمصالحة، ۲: ۹۷۴ رقم: ۲۵۸۱

آپ ﷺ نے فرمایا:

بَلٰی.

کیوں نہیں! (وہ مشرکین ہیں۔)

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کیا آپ اللہ کے سچے رسول نہیں ہیں؟ آقائے دو جہاں ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں میں سچا رسول ہوں۔ پھر عرض کیا: کیا اسلام سچا دین نہیں ہے؟ جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ہاں سچا دین ہے۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ سوال کر کے عرض گزار ہوئے: یا رسول اللہ! پھر اتنی کمزور شرائط پر معاہدہ کیوں قبول کیا جا رہا ہے؟ مرکزِ فہم و دانش ﷺ نے فرمایا:

أَنَا عَبْدُ اللهِ وَرَسُوْلُهُ، لَنْ أُخَالِفَ أَمْرَهُ، وَلَنْ يُضَيِّعَنِي.(۱)

میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں کبھی اللہ کے اَمر کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور وہ ہرگز مجھے ضائع نہیں کرے گا۔

خاتم الانبیاء ﷺ کی مراد یہ تھی کہ اسی میں اللہ کا امر ہے اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی کوشش کو کبھی ضائع نہیں فرمائے گا۔ ذرا خیر البشر ﷺ کا صبر و تحمل دیکھیے! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ذاتی سوچوں کے سمندر میں طغیانی تھی۔ سراپا ہدایت ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنی ذاتی سوچوں کی جڑ کاٹ دو اور رب کے اَمر پر راضی ہو جاؤ۔

(۵) وقتی مشکلات سے متاثر ہونا ایک فطری عمل ہے

صلح حدیبیہ کا معاہدہ ہونے کے بعد محسنِ انسانیت حضرت محمد ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ یہیں پر اپنی قربانیاں کر دو اور احرام کھول دو۔ رسولِ معظم ﷺ نے یہ کلمات تین بار

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴: ۳۲۵، رقم: ۱۸۹۳۰
۲۔ طبری، تاریخ الأمم والملوك، ۲:۱۲۲
۳۔ ابن کثیر، البداية النهاية، ۴:۱۶۸

فرمائے۔ صحابہ کرام ﷺ اتنے غم زدہ تھے کہ سب سر جھکا کر بیٹھے رہے۔ واضح پیغامِ رسالت سننے کے باوجود کوئی اُٹھا نہ کسی نے احرام کھولا اور نہ ہی کسی نے قربانی کی۔

اِس پر ہادیِ برحق ﷺ اپنی قیام گاہ کے اندر تشریف لے گئے اور سارا ماجرہ اُم المومنین سیدہ اُم سلمہ ﷺ کو کہہ سنایا۔ انہوں نے عرض کیا: آقا! وہ غمگین اور دکھی ہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ اس حال میں انہیں زبانی کچھ نہ فرمائیں بلکہ آپ خود اپنا قربانی کا جانور ذبح فرما دیں اور احرام کھول دیں۔ آپ ﷺ کو قربانی کرتے دیکھ کر کوئی بھی شخص پیچھے نہیں رہے گا اور سب لوگ آپ ﷺ کی اطاعت و اِتباع کریں گے۔

بعد ازاں آپ ﷺ نے اِحرام کھول دیا، اپنی قیام گاہ سے باہر آ کر قربانی کی اور حلق فرمایا۔ روایت میں ہے:

فَقَامَ النَّاسُ يَنۡحَرُوۡنَ وَيَحۡلِقُوۡنَ.(۱)

(آپ ﷺ کو دیکھتے ہی) تمام صحابہ کرام ﷺ آگے بڑھے اور احرام کھول کر قربانیاں کرنے لگے۔

(۶) روشن فتح کی نوید

جب آقاے دوجہاں ﷺ حدیبیہ سے عمرہ کیے بغیر صحابہ کرام ﷺ کو لے کر مدینہ منورہ واپس روانہ ہوئے تو صحابہ کرام ﷺ پریشان حال اور سر جھکائے ہوئے تھے۔ وہ سب اتنے دکھی، مایوس اور پریشان حال تھے کہ کسی کا کسی سے بات کرنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔

اِسی حالت میں جبریل امین ﷺ سورۃ الفتح کی پہلی آیت لے کر نازل ہوئے:

(۱) ۱۔ بخاری، الصحيح، كتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد والمصالحة، ۲: ۹۷۴ رقم: ۲۵۸۱

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴: ۳۲۵ رقم: ۱۸۹۳۰

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِيْنًا○[۱]

(اے حبیبِ مکرم!) بے شک ہم نے آپ کے لیے (اسلام کی) روشن فتح (اور غلبہ) کا فیصلہ فرما دیا (اس لیے کہ آپ کی عظیم جدّ و جہد کامیابی کے ساتھ مکمل ہو جائے)○

اس آیت کا ان حالات میں نزول ہمیں قرآن مجید کے فلسفہ کی طرف متوجہ کرتا ہے جسے اَہلِ حق کے لیے سمجھنا ضروری ہے۔ صحابہ کرام ﷺ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت اُتری تو ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

يَا رَسُولَ اللهِ! أَفَتْحٌ هُوَ؟

یا رسول اللہ! کیا یہ فتح ہے؟

آقاے دو جہاں ﷺ نے ارشاد فرمایا:

نَعَمْ.[۲]

ہاں۔

یعنی تمہیں خبر نہیں، یہی فتح ہے۔ اُس نے سوچا ہوگا کہ مکہ میں ہمیں داخل نہیں ہونے دیا گیا، عمرہ ہمیں نہیں کرنے دیا، کمزور شرائط پر معاہدہ ہوا، ہم وہیں قربانیاں کرکے اور اِحرام کھول کر واپس آ رہے ہیں، جبکہ آپ ﷺ فرما رہے ہیں کہ وحی آئی ہے کہ یہ فتح ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں یہی فتح ہے۔

(۱) الفتح، ۴۸:۱

(۲) ۱۔ أبو داود، السنن، کتاب الجهاد، باب فيمن أسهم له سهما، ۳: ۷۶، رقم: ۲۷۳۶

۲۔ حاکم، المستدرک، ۲: ۱۴۳، رقم: ۲۵۹۳

۳۔ طبراني، المعجم الکبیر، ۱۹: ۴۴۵، رقم: ۱۰۸۲

اِسی طرح دیگر دو اَفراد بھی اسی قافلے سے کھڑے ہوئے اور کہنے لگے:

إِنَّ هٰذَا لَيْسَ بِفَتْحٍ. (۱)

یہ تو فتح نہیں ہے۔

یعنی یہ جو آیت اُتری ہے کہ یہ روشن فتح ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسی فتح ہے؟ حضور پُر نور ﷺ کی مبارک سماعتوں تک یہ بات پہنچی کہ سوال جنم لے رہے ہیں کہ یہ فتح کیسے بن گئی؟ خاتم المرسلین ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بِئْسَ الْكَلَامُ، هٰذَا أَعْظَمُ الْفَتْحِ. (۲)

یہ تمہارا سب سے برا کلام ہے، حالاں کہ یہ تو سب سے بڑی فتح ہے۔

ان شاء اللہ وقت آنے پر پردے اُٹھیں گے اور تمہیں فتحِ مبین نظر آ جائے گی۔ پھر آپ ﷺ یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی:

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۝ (۳)

جب وہ (کافر) تمہارے اوپر (وادی کی بالائی مشرقی جانب) سے اور تمہارے نیچے (وادی کی زیریں مغربی جانب) سے چڑھ آئے تھے اور جب (ہیبت سے تمہاری) آنکھیں پھر گئی تھیں اور (دہشت سے تمہارے) دل حلقوم تک آ پہنچے تھے اور تم (خوف و امید کی کیفیت میں) اللہ کی نسبت مختلف گمان کرنے لگے تھے۝

(۱) ۱۔ بیہقی، دلائل النبوۃ، ۴: ۱۶۰
۲۔ ذہبی، تاریخ الإسلام، ۲: ۳۹۷
۳۔ حلبی، إنسان العیون فی سیرۃ النبی المأمون، ۲: ۷۱۵
(۲) أیضا
(۳) الأحزاب، ۳۳: ۱۰

مقصد یہ تھا کہ پہلے بھی ایسے لمحات آئے تھے کہ لوگ طرح طرح کے گمان کیا کرتے تھے۔ اس پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عرض گزار ہوئے:

صَدَقَ اللهُ وَرَسُوْلُهُ، هُوَ أَعْظَمُ الْفُتُوْحِ. وَاللهِ، يَا نَبِيَّ اللهِ، مَا فَكَّرْنَا فِيْمَا فَكَّرْتَ فِيْهِ. (۱)

بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی سچے ہیں۔ بے شک یہ عظیم فتوحات میں سے ہے۔ بخدا! اے اللہ کے نبی! ہم نے ایسے غور وفکر سے کام نہیں لیا جیسا کہ آپ نے سوچا۔

۷۔ آزمائشیں ہی انسان کا معیار مقرر کرتی ہیں

ان تمام حالات و واقعات کو بیان کرنے کے بعد قرآن مجید نے مومنین کی استقامت اور حضور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ وفا کے اجر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا○ (۲)

بے شک اللہ مومنوں سے راضی ہوگیا جب وہ (حدیبیہ میں) درخت کے نیچے آپ سے بیعت کررہے تھے، سو جو (جذبۂ صدق و وفا) ان کے دلوں میں تھا اللہ نے معلوم کرلیا تو اللہ نے ان (کے دلوں) پر خاص تسکین نازل فرمائی اور انہیں ایک بہت ہی قریب فتح (خیبر) کا انعام عطا کیا○

یعنی مومنین چاہے مکہ مکرمہ بھی نہیں گئے، عمرہ بھی ادا نہیں کیا، حدیبیہ کے مقام پر ہی اِحرام کھول کر قربانیاں کر دی گئیں، مگر انہوں نے آقاے دو جہاں ﷺ کے ساتھ وفاداری نبھانے

(۱) ۱۔ بیهقی، دلائل النبوة، ۴: ۱۶۰
۲۔ ذہبی، تاریخ الإسلام، ۲: ۳۹۷
(۲) الفتح، ۴۸: ۱۸

اور ثابت قدم رہ کر جانیں لٹانے اور گردنیں کٹوانے کا حلف تو کر لیا۔ اللہ تعالیٰ اُن کے اسی عزم سے خوش ہو گیا ہے۔

بتانا مقصود یہ ہے کہ عہدِ رسالت میں لمحہ بہ لمحہ کیسے کیسے حالات آتے تھے۔ یہ انسانی زندگی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ملائکہ نہیں بلکہ انسان ہی تھے۔ معلمِ انسانیت ﷺ نے ان کی بشری خلقت کو اس قدر سنوار دیا کہ وہ تمام رشکِ ملائکہ بن گئے۔ جنہیں قرآن کبھی مُخَلَّفِیۡن[1] کہتا تھا، وہ ہراول دستہ بن گئے۔ جنہیں قرآن اَعۡرَاب[2] پکارتا تھا وہ اگلے محاذ پر جانیں دینے والے صحابہ رضی اللہ عنہم بن گئے۔ قرآن کبھی انہیں شک و شبہ میں مبتلا عوام کہتا تھا، مگر اب وہ جاں نثار بن گئے۔ جنہیں قرآن کہتا تھا کہ مالِ غنیمت لینے کے لیے آجائیں گے، اب وہی اللہ کی راہ میں جانیں لٹانے والے بن گئے۔ یہ مرحلے ہر طبقے پر، ہر دور اور ہر زمانے میں آئے ہیں۔ اسی کو انسان کہتے ہیں۔ سو اِس طرح تربیتِ مصطفیٰ ﷺ سے جو خام تھے وہ پختہ ہو گئے۔

پھر جب حضور نبی اکرم ﷺ اس دنیا فانی سے ظاہری پردہ فرما گئے تو ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم عظمت کی اتنی بلندیوں پر جا پہنچے تھے کہ کسریٰ اور قیصر روم تک ان کے ناموں سے تھرتھراتے تھے۔ اُنہوں نے معلمِ انسانیت ﷺ کی ظاہری حیات میں مکہ بھی فتح کیا اور پھر خیبر اور حنین بھی فتح کیا۔ پھر تبوک گئے تو وہاں بھی ان کی للکار سے سراسیمگی پھیل گئی۔ وہ پہلے دن ہی سے ایسے نہیں بن گئے تھے۔ پہلے دن سے ہر کوئی ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ نہیں تھا۔ آقاے دو جہاں ﷺ نے کئی ایک کو تو پہلے دن ہی ہیرا بنا دیا تھا اور کئی ایک کو ۲۳ سال لگا کر تراشا تھا۔ ایسے معاملات و واقعات ہادیِ برحق ﷺ سے بڑھ کر کسی کی زندگی میں نہیں آئے۔ قرآن مجید نے فرمایا:

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيۡ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلُ ۚ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا ○[3]

---

(۱) الفتح، ۴۸:۱۶

(۲) الفتح، ۴۸:۱۱، ۱۶

(۳) الفتح، ۴۸:۲۳

(یہ) اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے، اور آپ اللہ کے دستور میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے o

یعنی اللہ تعالیٰ اسی طرح سب کو پختہ کر کے منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے۔

۸۔ صلح حدیبیہ اَہلِ حق کے لیے ایک اَبدی نمونہ ہے

’صحیح بخاری‘ میں ہے کہ مولیٰ علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جنگ صفین میں ستر ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ اس قدر خون بہہ جانے کے بعد جب صلح کا وقت آیا تو خوارج نے بغاوت کر دی کہ ہم صلح نہیں کرتے۔ اُس وقت حضرت سہل رضی اللہ عنہ بن حنیف نے ان جذباتی جوانوں کو کہا: اب شیر خدا حضرت علی رضی اللہ عنہ صلح کر رہے ہیں اور تم بغاوت کر رہے ہو۔ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے اس طرح بغاوت اس وقت بھی نہیں کی تھی جب ہم پر جذبات کا یہ تلاطم اور پریشانیاں حدیبیہ میں آئی تھیں۔ اس مرحلے سے ہم بھی اس وقت گزرے تھے جب معاہدہ حدیبیہ ہو رہا تھا، مگر ہم ثابت قدم رہے اور آقائے دو جہاں ﷺ پر ایمان ہمارے ہر شک کا جواب بن گیا۔ تاجدارِ کائنات ﷺ پر غیر متزلزل یقین کا تقاضا یہی ہے کہ رسالت مآب ﷺ جو فرما رہے ہیں وہ سچ ہے۔ سرورِ انبیاء ﷺ جو بھی کر رہے ہیں وہ عین حق ہے۔ ہادیِ برحق ﷺ کا ہر قدم اللہ کے امر کا عملی مظہر ہے۔ وَحْیٌ یُّوْحٰی [۱] سے مزین زبانِ رسالت سے ادا کردہ ہر لفظ اللہ کے حکم کے تابع ہے۔ ہمیں چونکہ اپنے رہبرِ کامل ﷺ پر یقین کامل تھا اور ہم اس بھنور سے آسانی سے گزر گئے۔ [۲]

---

(۱) النجم، ۵۳: ۴

(۲) ۱۔ بخاري، الصحیح، کتاب التفسیر، باب باب ﴿إِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾، ۴: ۱۸۳۲، رقم: ۴۵۶۳

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۴۸۵، رقم: ۱۶۰۱۸

۳۔ أبو عوانه، المسند، ۴: ۲۹۶-۲۹۷، رقم: ۶۸۰۱-۶۸۰۲

۹۔ صلحِ حدیبیہ: فتوحات کا دروازہ

صلح حدیبیہ نے کس طرح فتح مبین کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کے لیے فتوحات و کامیابیوں کے دروازے کھولے؟ آیئے! اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

رسولِ معظم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد خبر سنی کہ خیبر کے یہودی، مدینہ پر حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ آقاے دو جہاں ﷺ نے معاہدۂ حدیبیہ کے ذریعے مکہ والوں کو پابند کر دیا تھا کہ اب وہ خیبر کے یہودیوں کی مدد نہیں کر سکتے۔ پہلے یہود، مشرکین، کفار اور ان کے حلیف قبائل مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو جاتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے معاہدے نے مشرکینِ مکہ کو پابند کر دیا تھا کہ اب وہ خیبر کے یہودیوں کی مدد نہیں کر سکیں گے۔ خیبر کے یہودیوں نے مدینہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ قبل اس کے کہ وہ حملہ کریں آقاے دو جہاں ﷺ دفاعی جنگ کے لیے لشکر لے کر خود خیبر پہنچ گئے۔ اس پر مکہ والے تلملاتے رہ گئے۔

خیبر کے یہودیوں نے مکہ والوں کو پیغام بھیجا کہ اب تک ہم تمہارا ساتھ دیتے آئے ہیں، آؤ اب تم ہمارا ساتھ دو۔ مکہ والوں نے کہا: نہیں! ہم تو معاہدہ کر چکے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف بلا واسطہ یا بالواسطہ بھی جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ اس طرح مکہ والے بندھ گئے اور وہ خواہش کے باوجود خیبر میں یہود کی مدد کو نہ آ سکے۔ محسنِ انسانیت ﷺ نے محاصرہ کر کے خیبر فتح کر لیا۔

جب خیبر فتح ہو گیا تو اردگرد کے کئی علاقوں کے رہنے والے لوگ کثیر تعداد میں داخلِ اسلام ہونے لگے اور جو مسلمان نہ ہوئے وہ آقاے دو جہاں ﷺ سے ریاستِ مدینہ کے سربراہ کی حیثیت سے معاہدے کرنے لگے اور ریاستِ مدینہ کے حلیف بن گئے۔ طائف، ثقیف اور دور دراز کے لوگ رسولِ مکرم ﷺ سے معاہدات کر کے ان کے اتحادی بن رہے تھے۔ یوں ریاستِ مدینہ کی طاقت بڑھنے لگی۔ پہلے تن تنہا لڑتے تھے، اب بڑا اتحاد بنتا چلا گیا۔

صلحِ حدیبیہ کے رُموز عیاں ہوئے اور فتحِ مبین کی بشارت طشت اَز بام ہوگئی۔ صلحِ

حدیبیہ کے معاہدے کو ابھی ڈیڑھ سال ہی گزرا تھا کہ بنوخزاعہ اور بنوبکر کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ بنوخزاعہ ریاستِ مدینہ کے حلیف تھے جبکہ بنوبکر مکہ والوں کے اتحادی تھے۔ بنوبکر نے مشرکینِ مکہ سے امداد طلب کی۔ مکہ والوں نے ریاستِ مدینہ کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے خائف ہوکر بنوخزاعہ کے خلاف بنوبکر کی مدد کر دی۔ اس طرح مکہ والے اپنے دس سالہ اَمن معاہدے سے منحرف ہوگئے۔ مشرکینِ مکہ کی یہ حرکت صلح نامہ حدیبیہ کی صریح خلاف ورزی تھی۔ (۱)

جب مکہ والوں نے ریاست مدینہ کے اتحادی بنوخزاعہ کے خلاف بنوبکر کی حمایت کر دی تو اِس پر سورۃ توبہ کی یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ. (۲)

اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف سے بیزاری (و دست برداری) کا اعلان ہے۔

اللہ رب العزت نے سورۃ التوبہ کی مذکورہ آیت کے ذریعے صلح حدیبیہ کو منسوخ فرماتے ہوئے کہا کہ مکہ والوں نے اپنا معاہدہ خود توڑا ہے. لہٰذا اب مسلمانوں پر اس معاہدے کی پابندی نہیں رہی۔ مشرکینِ مکہ کی بنوبکر کی مدد کرنے سے صلح حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔ مشرکینِ مکہ کی اس عہد شکنی پر قرآن نے وحی اتار کر معاہدہ منسوخ کر دیا۔ جب صلح حدیبیہ منسوخ ہوا تو مکہ والوں نے سوچا کہ اب مدینہ پر فوری حملہ کر دو ورنہ یہ کل ہمیں فتح کر لیں گے۔

آقاے دو جہاں ﷺ نے جب ان کی تیاری کی خبر سنی تو خود آٹھ ہزار سے دس ہزار کا لشکر لے کر مکہ پہنچ گئے۔ معاہدہ چونکہ پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا، لہٰذا اس طرح بغیر جنگ کے مکہ فتح

(۱) ۱۔ بیهقی، السنن الکبری، ۹: ۲۳۳، رقم: ۱۸۶۳۸
۲۔ بیهقی، دلائل النبوة، ۵: ۶
۳۔ سیوطی، الخصائص الکبری، ۱: ۴۳۵
(۲) التوبة، ۹:۱

ہوگیا۔

اب بالفرض! ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مکہ والے یہ حماقت نہ کرتے اور معاہدہ خود نہ توڑتے تو کیا پیغمبرِ اسلام ﷺ یہ معاہدہ توڑنے والے تھے؟ معاذ اللہ، کبھی نہیں! وہ تو ہر صورت معاہدے کی پاس داری کرنے والے تھے۔ اگر مکہ والے معاہدہ نہ توڑتے تو سرورِ کائنات ﷺ کا وصال اس معاہدے کے چار سال بعد ہوا۔ صلحِ حدیبیہ کا یہ معاہدہ رسولِ مکرم ﷺ کے وصال کے بعد بھی چھ (٦) سال اور جاری رہتا۔ دس (١٠) سالہ جنگ بندی کا معاہدہ (no war pact) طے پایا تھا۔ سو چنے کی بات ہے کہ اس صورتِ حال میں حضور نبی اکرم ﷺ کی ظاہری حیات ہی میں فتح مکہ کب اور کیسے ہوتا؟ صلحِ حدیبیہ میں دونوں طرف سے دس سال کے لیے جنگ بندی (cease fire) ہو گیا تھا۔ یہ تو یک لخت مشرکینِ مکہ سے حماقت ہوئی اور انہوں نے اپنا معاہدہ خود توڑ دیا۔ اس موقع پر بھی محسنِ انسانیت ﷺ نے بذاتِ خود اعلان نہیں کیا بلکہ قرآن کی آیت اُتری۔

صلح حدیبیہ کے منسوخ ہو جانے کے بعد مکہ فتح ہوگیا۔ اگر کفارِ مکہ خود یہ حماقت نہ کرتے اور معاہدہ برقرار رہتا تو دس (١٠) سال میں سیدنا صدیق اکبر ﷺ کا دورِ خلافت بھی گزر جاتا اور سیدنا فاروق اعظم ﷺ کے دور میں جا کر معاہدے کا دورانیہ مکمل ہونا تھا۔

غور کریں! انقلاب اور فتح مبین کے لیے کس طرح اَسباب پیدا ہوئے۔ یاد رکھیں! جس کے ہاتھ میں امر ہے اس کے راز کوئی نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ کی اُلوہی منصوبہ بندی کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ یہ ایک اُصول ہے کہ جو باتیں چھپانے والی ہوتی ہیں، وہ وقت سے پہلے نہیں بتائی جاتیں۔

'صحیح بخاری' میں حضرت براء ﷺ سے مروی ہے: جب وقت گزر گیا، خیبر اور دیگر فتوحات کے بعد مکہ فتح ہوا تو سالوں بعد ہم پر یہ راز کھلا کہ جو اصل کامیابی تھی، وہ فتح مکہ نہیں بلکہ اصل فتح تو صلح حدیبیہ تھی کیونکہ فتح مکہ کا راستہ حدیبیہ کی فتح مبین سے نکلا تھا۔

حضرت براء بن عازب ﷺ فرماتے ہیں:

تَعُدُّوْنَ أَنْتُمُ الْفَتْحَ فَتْحَ مَكَّةَ، وَقَدْ كَانَ فَتْحُ مَكَّةَ فَتْحًا، وَنَحْنُ نَعُدُّ الْفَتْحَ بَيْعَةَ الرِّضْوَانِ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ.[1]

آپ حضرات ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا﴾[2] میں فتح سے مراد مکہ کی فتح لیتے ہیں۔ فتح مکہ تو بہرحال فتح تھی ہی (اس کے فتح ہونے میں کوئی شبہ نہیں)، لیکن ہم یومِ حدیبیہ کے روز بیعتِ رضوان کو حقیقی فتح سمجھتے ہیں۔

۱۰۔ اِنقلاب کب آئے گا؟

اِنقلاب کب آئے گا؟ کیسے آئے گا؟ یہ سوال کرنے والے اور اس ضمن میں سوچنے والے اس کا جواب آقا ﷺ کے فرمان سے جان لیں۔ سنتِ رسول ﷺ سے سمجھ لیں کہ انقلاب کیسے آتا ہے؟

فتح مکہ کی بنیاد حدیبیہ میں رکھی گئی۔ بظاہر لوگ صلح حدیبیہ کو معاذ اللہ شکست سمجھ رہے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سخت پریشان تھے، سوال کرتے تھے، اس کو کمزور شرائط سمجھ رہے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا﴾ کے ذریعے فرمایا: اے حبیب! ان کو خوش خبری سنا دو کہ بوجھل دل کے ساتھ غم زدہ نہ پلٹیں۔ اگر اس معرکے میں کامیابی نہیں ہوئی اور خالی ہاتھ پلٹ کر جا رہے ہیں تو اسے شکست نہ سمجھو۔ جس معاہدے کو شکست سمجھ رہے ہو اس کے اندر ہم نے بہت بڑی فتح کا دروازہ کھول دیا ہے۔ کئی فتوحات کے راستے کھول دیے ہیں۔ اس معاہدہ کے بعد خیبر فتح ہوا، پھر مکہ فتح ہوا، بعد ازاں حنین، تبوک، روم اور ایران کی فتوحات ہوئیں اور یوں کامیابیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

---

(۱) بخاري، الصحيح، كتاب المغازى، باب غزوة الحديبية وقول الله تعالى: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾، ۴:۱۵۲۵، رقم: ۳۹۱۹

(۲) الفتح، ۴۸:۱

بظاہر ایک واقعہ ایسا ہوتا ہے کہ ظاہری حالات میں انسان سمجھتا ہے کہ فتح نہیں ہوئی، شکست ہوگئی، واپس پلٹ کر آ گئے ہیں؛ مگر اس کے اندر اللہ رب العزت نے فتح کے دروازے رکھ دیے ہوتے ہیں۔ یہ امر اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ فتح کا راز کب کھلنا ہے اور وہ پردہ کب اٹھنا ہے؟ اَہلِ ایمان اور اَہلِ حق کا شیوہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان رکھیں اور اس کے وعدے پر اپنا یقین متزلزل نہ ہونے دیں کیونکہ اَہلِ حق کے لیے ہی اللہ کا وعدہ ہے کہ وہی غالب آئیں گے اور وہی فتح یاب ہوں گے۔

باب پنجم

تجلیاتِ یقین

قرآن مجید کو اگر کتابِ یقین کا عنوان دیا جائے تو اس حوالے سے یہ کتاب راہِ حق کی جد و جہد میں مصروفِ عمل لوگوں کے لیے ایسی ایسی تجلیات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے کہ اَہلِ حق کا ایمان اور فتح کا یقین اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ گذشتہ ابواب میں ہم نے مختلف غزوات اور صلح حدیبیہ کے دوران مومنین کو درپیش مشکلات، آزمائشوں، عوام کے ردِ عمل اور مخالفین و منافقین کی طرف سے دیے جانے والے طعن و تشنیع کے مختلف مظاہر کا مطالعہ کیا۔ مومنین کا ان تمام آزمائشوں کے باوجود ثابت قدمی و استقامت کے ساتھ اپنے مشن پر قائم رہنا اَہلِ حق کے لیے ایسی رہنمائی ہے کہ جسے سمجھ لینے کے بعد شک کا تصور سرے سے ہی انسان کے ذہن سے رخصت ہو جاتا ہے۔

آیئے! قرآن مجید کے گل زاروں کی سیر کرتے ہیں تا کہ قرآن کے پیغام کی مُشکِ جاں فزا سے محظوظ ہوسکیں۔ آیئے! چشمِ تصور میں ہادیِ برحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مبارک زندگیوں پر ایک نظر دوڑائیں کہ ان پر کیا بیت رہی ہے؟ آزمائشوں اور امتحانات کے موقع پر ان کی کیا کیفیات ہیں اور وہ کس طرح کے ہولناک مراحل سے نکل رہے ہیں؟ ان کی زندگیوں میں کیسے کیسے زیر و بم آ رہے ہیں؟ جب ہم قرآن مجید کو پڑھیں گے، چشمِ تصور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات دیکھیں گے اور وَحۡیٌ یُّوۡحٰی [1] سے مزین زبانِ اقدس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے یقین کو مضبوط کرتا ہوا دیکھیں گے تو ہمارے یقین کا سورج نصف النہار پر چمکتا ہوا دکھائی دے گا۔ یاد رکھیں! اُس دل کے مطلع پر کالی گھٹا چھائی رہے گی، جس نے قرآنِ مجید کا گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا، ایمان کی بستیوں اور اس کے راہ گزاروں کی سیاحت نہیں کی، جس نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معیت کو محسوس نہیں کیا یعنی اُن کی اتباع نہیں کی اور

(۱) النجم، ۵۳:۴

ان کے حالات سے شناسائی حاصل نہیں کی؛ ایسا شخص یقین اور استقامت کی دولت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

۱۔ یقین کی اہمیت

۱۔ حضرت ابو بکر صدیق ﷛ نے ایک مرتبہ لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّ النَّاسَ لَمْ يُعْطَوْا فِي الدُّنْيَا خَيْرًا مِنَ الْيَقِيْنِ وَالْمُعَافَاةِ، فَسَلُوهُمَا اللهَ. (۱)

اے لوگو! انسانوں کو دنیا میں اللہ تعالیٰ پر یقین اور اس کے عفو و درگزر سے بہتر کوئی نعمت عطا نہیں ہوئی۔ لہٰذا تم اللہ تعالیٰ سے ان دونوں کا سوال کیا کرو۔

حضرت حسن بصری مذکورہ فرمان کی شرح میں فرماتے ہیں:

صَدَقَ اللهُ وَرَسُوْلُهُ ﷺ، بِالْيَقِينِ طُلِبَتِ الْجَنَّةُ، وَبِالْيَقِينِ هُرِبَ مِنَ النَّارِ، وَبِالْيَقِينِ أُوتِيَتِ الْفَرَائِضُ، وَبِالْيَقِيْنِ صُبِرَ عَلَى الْحَقِّ. وَفِي مُعَافَاةِ اللهِ خَيْرٌ كَثِيرٌ. قَدْ وَاللهِ، رَأَيْنَاهُمْ يَتَقَارَبُونَ فِي الْعَافِيَةِ، فَلَمَّا نَزَلَ الْبَلَاءُ تَفَارَقُوا. (۲)

اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ نے سچ فرمایا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یقین کی بدولت ہی جنت طلب کی جاتی ہے، یقین کی وجہ سے ہی جہنم سے دور بھاگا جاتا ہے، یقین

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۱: ۸، رقم: ۳۸
۲۔ بيهقی، السنن الصغری: ۲۶، رقم: ۱۴

(۲) ۱۔ ابن أبي عاصم، الزهد لابن حنبل: ۲۸۲
۲۔ بيهقی، السنن الصغری: ۲۶، رقم: ۱۵
۳۔ ابن كثير، البداية والنهاية، ۹: ۲۷۰

کے باعث فرائض کی ادائیگی ہوتی ہے اور یقین کی بدولت حق پر صبر و اِستقامت نصیب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر میں بھی کثیر خیر و بھلائی ہے۔ اللہ کی قسم! ہم نے لوگوں کو دیکھا ہے کہ جب انہیں اللہ کی پناہ نصیب ہوتی ہے تو ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور جب کسی بلا کا نزول ہوتا ہے تو جدا ہو جاتے ہیں۔

۲۔ یقین کی اہمیت کا مزید اندازہ رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل فرمان سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

تَعَلَّمُوا الْيَقِينَ كَمَا تَعَلَّمُوا الْقُرْآنَ. (۱)

یقین کو اُسی طرح سیکھا کرو جس طرح قرآن کو سیکھتے ہو۔

اس حدیث کی شرح میں امام غزالی فرماتے ہیں کہ **تَعَلَّمُوا اليقين** کا معنیٰ ہے:

جَالِسُوا الْمُوْقِنِيْنَ وَاسْتَمِعُوْا مِنْهُمْ عِلْمَ الْيَقِيْنِ. وَوَاظِبُوْا عَلَى الْاِقْتِدَاءِ بِهِمْ لِيَقْوٰى يَقِيْنُكُمْ كَمَا قَوِيَ يَقِيْنُهُمْ. وَقَلِيْلٌ مِنَ الْيَقِيْنِ خَيْرٌ مِنْ كَثِيْرٍ مِنَ الْعَمَلِ. (۲)

یقین والوں کی مجلس میں بیٹھا کرو اور یقین والوں سے ان کی مجلس میں یقین کا علم سنا کرو (اس سے یقین سیکھ جاؤ گے)۔ یقین والوں کی پیروی (یعنی عمل) میں اِستقامت و مداومت اختیار کیے رکھو تا کہ تمہارا یقین بھی اُسی طرح قوی ہو جائے جس طرح اُن (یقین والوں) کا یقین پختہ ہوا۔ (نتیجتاً تم بھی صاحبانِ یقین میں شامل ہو جاؤ گے۔)

---

(۱) ۱۔ أبو نعيم، حلية الأولياء وطبقات الأصفياء، ۶:۹۵
۲۔ ابن عساكر، تاريخ مدينة دمشق، ۱۶:۱۹۸
۳۔ هندی، كنز العمال، ۳:۱۷۷، رقم:۷۳۳۷

(۲) غزالی، إحياء علوم الدين، ۱:۷۲

۳۔ اُمت میں یقین کی کمزوری پیدا ہوگی۔ اس جہت سے بھی آپ ﷺ نے اُمت کو تنبیہ فرما دی تھی۔ لہٰذا اُمت کو غفلت سے بیدار ہونا چاہیے اور بہرحال یقین کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَا أَخَافُ عَلٰی أُمَّتِي إِلَّا ضَعْفَ الْيَقِيْنِ. (۱)

مجھے اپنی اُمت پر یقین کی کمزوری کا خوف ہے۔

۴۔ حضرت ابو یزید المدنی بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ دعا مانگا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ، هَبْ لِي إِيْمَانًا وَيَقِيْنًا وَمُعَافَاةً وَنِيَّةً. (۲)

اے اللہ! مجھے ایمان، یقین، عافیت اور حسنِ نیت کی دولت سے مالا مال فرما۔

۵۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو ایک مرتبہ ان الفاظ کے ساتھ نصیحت کی:

يَا بُنَيَّ، إِنَّ الصَّبْرَ عَلَى الْمَكَارِهِ مِنْ حُسْنِ الْيَقِيْنِ، وَإِنَّ لِكُلِّ عَمَلٍ كَمَالًا وَغَايَةً، وَكَمَالُ الْعِبَادَةِ الْوَرَعُ وَالْيَقِيْنُ. (۳)

میرے بیٹے! ناپسندیدہ اشیاء پر صبر کرنا حسنِ یقین میں سے ہے اور یقیناً ہر عمل کا ایک کمال اور انتہاء ہوتی ہے اور عبادت کا کمال وَرع اور یقین ہے۔

یقین کے اِس باب میں جگہ جگہ تجلیات جلوہ اَفروز ہوں گی، جن سے روشنی لیتے ہوئے ہم راہِ حق پر گامزن ہونے کے لیے زادِ راہ حاصل کرتے رہیں گے۔

آیئے! قرآن و حدیث سے ماخوذ اِن تجلیاتِ یقین کا مطالعہ کرتے ہیں:

---

(۱) ۱۔ طبرانی، المعجم الأوسط، ۸:۳۵۹، رقم: ۸۸۶۹
۲۔ مروزی، تعظیم قدر الصلاۃ، ۲:۶۹۹، رقم:۷۶۷

(۲) ابن أبی الدنیا، الیقین:۳۳، رقم:۶

(۳) ابن ابی الدنیا، الیقین:۳۷، رقم:۱۴

۲۔ یقین کی پہلی تجلی: صلحِ حدیبیہ ہی حقیقی فتحِ مبین

مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان صلح نامہ حدیبیہ کی یک طرفہ شرائط میں یہ طے پایا تھا کہ مسلمان عمرہ کے لیے آئندہ سال مکہ تشریف لائیں۔ لٰہذا ڈیڑھ ہزار کے قریب صحابہ کرام ﷡ بڑی شکستہ دلی کے ساتھ، غم زدہ مدینہ منورہ واپس آئے۔ راستے ہی میں سورۃ الفتح کی یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی:

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا○[1]

(اے حبیبِ مکرم!) بے شک ہم نے آپ کے لیے (اسلام کی) روشن فتح (اور غلبہ) کا فیصلہ فرما دیا۔ (اس لیے کہ آپ کی عظیم جدّوجہد کامیابی کے ساتھ مکمل ہو جائے)○

اس پر قافلے کے مسلمان پوچھتے تھے کہ کیا یہی فتح ہے؟ نہ مکہ میں داخل ہوئے، نہ عمرہ کر سکے، بغیر عمرہ کے احرام کھول دیے، سر منڈوا دیے، بغیر عمرہ کے قربانیاں دے دیں، کمزور شرائط پر معاہدہ کر کے واپس آ گئے۔ ان کے دلوں سے یہ تلخ بات اُترتی ہی نہ تھی۔ شدتِ غم سے ان کے ہوش و حواس متزلزل تھے۔ صحابہ کرام ﷡ جب ایک دوسرے کے حلق اور قصر کر رہے تھے تو اتنے غمزدہ دکھائی دے رہے تھے کہ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ ان اوزاروں سے اپنے ہی گلے کاٹ بیٹھیں گے۔

کتبِ حدیث و سیرت میں ہے کہ اُن کی حالت یوں ہو چکی تھی کہ کہیں غم سے نڈھال ہو کر ایک دوسرے کو قتل ہی نہ کر ڈالیں۔

حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت مروان ﷡ سے مروی طویل روایت میں ان کیفیات کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

---

(۱) الفتح، ۴۸:۱

حَتّٰی کَادَ بَعْضُهُمْ يَقْتُلُ بَعْضًا غَمًّا.[1]

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رنج وغم میں کہیں ایک دوسرے کو قتل ہی نہ کر ڈالیں۔

صحابہ کرام ﷺ اس کرب ناک اور افسوس ناک صورتِ حال میں واپس پلٹ رہے تھے کہ یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی:

لَقَدْ صَدَقَ اللهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ج لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللهُ اٰمِنِيْنَ لا مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ ط فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًاo[2]

بے شک اللہ نے اپنے رسول (ﷺ) کو حقیقت کے عین مطابق سچا خواب دکھایا تھا کہ تم لوگ، اگر اللہ نے چاہا تو ضرور بالضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے امن و امان کے ساتھ، (کچھ) اپنے سر منڈوائے ہوئے اور (کچھ) بال کتروائے ہوئے (اس حال میں کہ) تم خوفزدہ نہیں ہو گے، پس وہ (صلح حدیبیہ کو اس خواب کی تعبیر کے پیش خیمہ کے طور پر) جانتا تھا جو تم نہیں جانتے تھے سو اس نے اس (فتحِ مکّہ) سے بھی پہلے ایک فوری فتح (حدیبیہ سے پلٹتے ہی فتحِ خیبر) عطا کر دی۔ (اور اس سے اگلے سال فتحِ مکّہ اور داخلۂ حرم عطا فرما دیا)o

---

(۱) ا۔ بخاری، الصحیح، کتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب وكتابة الشروط، ۲: ۹۷۸، رقم: ۲۵۸۱

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۴: ۳۳۰، رقم: ۱۸۹۴۸

۳۔ ابن حبان، الصحیح، ۱۱: ۲۲۵، رقم: ۴۸۷۲

۴۔ بیهقي، دلائل النبوة، ۴: ۱۰۷

۵۔ طبری، تاریخ الأمم والملوك، ۲: ۱۲۴

۶۔ ابن کثیر، البداية والنهاية، ۴: ۱۷۶

(۲) الفتح، ۴۸: ۲۷

اِس آیتِ مبارکہ کا پہلا حصہ فعل ماضی میں ہے کہ اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کو سچا خواب دکھایا تھا، لیکن کبھی فعل ماضی کو بیان کر کے اس کا معنی مستقبل میں لیا جاتا ہے، یعنی اللہ اپنے حبیب مکرّم ﷺ کا خواب سچ کر دکھائے گا۔ صحابہ کرام ﷺ پریشانی کے حال میں نڈھال واپس جا رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی وحی آ رہی ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کا خواب سچ کر دکھایا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ضرور بالضرور مسجد حرام میں داخل ہوں گے۔ کسی کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیسے ہوگا؟ پہلے تو خواب نظر آیا تھا کہ ہم داخل ہو رہے ہیں، جس پر سرورِ کون و مکان ﷺ سب کو لے کر چل پڑے۔ جب اُس سال داخل نہ ہوئے اور واپس آ گئے تو یہ آیات کریمہ اُتریں۔ پہلی وحیِ خفی بصورتِ خواب تھی اور اب امام الانبیاء ﷺ پر وحیِ جلی اُتر رہی ہے کہ اگر اللہ نے چاہا تو ضرور بالضرور مسجد حرام میں داخل ہوں گے۔

ایسی صورتِ حال میں ایسے کلمات سننے کو ملیں تو یقین کے بغیر ماننا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ یقین کی حد تک صورت حال اُمیدوں کے برعکس اور یکسر تبدیل ہو جائے، حالات و واقعات بالکل دوسرا رخ اختیار کر لیں اور ان حالات میں اللہ کا پیغام آ رہا ہو کہ وعدہ سچ کر دکھایا، یعنی گھبراؤ نہیں ایسا ضرور ہوگا۔ یہ یقینِ محمدی اور صحابہ کرام ﷺ کے یقین کی ایک تجلی تھی جو اس آیتِ کریمہ سے عیاں ہوئی۔ نیز اس پیغام کے ذریعے صحابہ کرام ﷺ کے ایمان و یقین کو بڑھایا جا رہا ہے کہ تمہاری فتح ہوگی۔

یقینِ محمدی اور یقینِ صحابہ ﷺ میں فرق یہ تھا کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ وہ قاب قوسین کے مقام پر فائز ہیں، ربِ دوجہاں کو بے حجاب دیکھا، صاف ظاہر ہے کہ کوئی صحابی، تابعی، غوث اور قطب بھی رسولِ مکرم ﷺ کے یقین کے برابر یقین کا حامل نہیں ہوسکتا۔ جو مرتبہ یقینِ نبی کو حاصل ہے اُس کے برابر غیر نبی کا یقین کسی بھی صورت نہیں پہنچ سکتا۔ یقین کے مختلف مراتب ہیں۔ صحابہ کرام ﷺ کا یقین مختلف مراحل (process) سے گزر کر اِس مقام تک پہنچ گیا تھا کہ جس مقام پر پوری اُمت کا یقین نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اللہ رب العزت کے کلام قرآنِ مجید اور پیغمبرِ اخلاق ﷺ کی تربیت نے انہیں وہاں تک پہنچا دیا تھا۔ یہ یقینِ محمدی کی پہلی قرآنی تجلی ہے۔

۲۔ یقین کی دوسری تجلی

صلح حدیبیہ اور سورۃ الفتح کی روشنی میں یقین کی پہلی تجلی کا مطالعہ کرنے کے بعد آیئے اب سورۃ القصص کی روشنی میں یقین کی دوسری تجلی کا مطالعہ کرتے ہیں۔

اس مطالعہ کے دوران آپ دیکھیں گے کہ ہمارے فلسفۂ انقلاب کا ایک ایک لفظ، اصطلاحات، جملے اور فکر بھی وہی ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تو قرآن ہی کے خوشہ چیں اور اس اُم الکتاب سے خیرات لینے والے ہیں۔ ہم ساری ہدایت قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ سے ہی تو حاصل کرتے ہیں۔

سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام اور اُن کی امتوں کے واقعات بیان کرنا اللہ رب العزت کی سنت ہے، جس کا مقصد اللہ رب العزت نے یوں ارشاد فرمایا:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ج وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ○[1]

اور ہم رسولوں کی خبروں میں سے سب حالات آپ کو سنا رہے ہیں جس سے ہم آپ کے قلبِ (اطہر) کو تقویت دیتے ہیں، اور آپ کے پاس اس (سورت) میں حق اور نصیحت آئی ہے اور اہلِ ایمان کے لیے عبرت (یاد دہانی بھی)○

اسی بناء پر اللہ رب العزت نے سورۃ القصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بیان فرمایا اور اس کے ذریعے ایمان والوں کے یقین اور استقامت کو دو چند کرنے کا اہتمام فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ○[2]

(۱) هود، ۱۱:۱۲۰

(۲) القصص، ۲۸:۳

(اے حبیبِ مکرّم!) ہم آپ پر موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کے حقیقت پر مبنی حال میں سے ان لوگوں کے لیے کچھ پڑھ کر سناتے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں○

ایمان والوں کو یقین کی دوسری تجلّی سے فیض یاب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرعون کا واقعہ سناتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْھُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَھُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَھُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ○[1]

بے شک فرعون زمین میں سرکش و متکبّر (یعنی آمرِ مطلق) ہوگیا تھا اور اس نے اپنے (ملک کے) باشندوں کو (مختلف) فرقوں (اور گروہوں) میں بانٹ دیا تھا اس نے ان میں سے ایک گروہ (یعنی بنی اسرائیل کے عوام) کو کمزور کردیا تھا کہ ان کے لڑکوں کو (ان کے مستقبل کی طاقت کچلنے کے لیے) ذبح کر ڈالتا اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتا (تاکہ مردوں کے بغیر ان کی تعداد بڑھے اور ان میں اخلاقی بے راہ روی کا اضافہ ہو)، بے شک وہ فساد انگیز لوگوں میں سے تھا○

اگلی آیات میں بڑا ہی جامع مضمون بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا:

وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَھُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَھُمُ الْوٰرِثِیْنَ○ وَنُمَكِّنَ لَھُمْ فِی الْاَرْضِ وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَھَامٰنَ وَجُنُوْدَھُمَا مِنْھُمْ مَّا كَانُوْا یَحْذَرُوْنَ○[2]

اور ہم چاہتے تھے کہ ہم ایسے لوگوں پر احسان کریں جو زمین میں (حقوق اور آزادی سے محرومی اور ظلم و استحصال کے باعث) کمزور کردیے گئے تھے اور انہیں (مظلوم قوم کے) رہبر و پیشوا بنا دیں اور انہیں (ملکی تخت کا) وارث بنا دیں○ اور ہم انہیں ملک

---

(۱) القصص، ۲۸:۴

(۲) القصص، ۲۸: ۵-۶

میں حکومت و اقتدار بخشیں اور فرعون اور ہامان اور ان دونوں کی فوجوں کو وہ (انقلاب) دکھا دیں جس سے وہ ڈرا کرتے تھےo

فرعون کیا عمل کر رہا ہے اور منشاے الٰہی کیا ہے؟ وہ ظلم و ستم کے ذریعے غریبوں کو کچلنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اس کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہ رہے جبکہ اللہ رب العزت انہی مظلوم لوگوں کو اقتدار سونپے جانے کی نوید سنا رہا ہے۔ یہ سب کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ اور کب ہوا؟ آیئے! اس کو جاننے کے لیے اس تاریخی واقعہ کے پسِ منظر کا مطالعہ کرتے ہیں:

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دریا کی موجوں کے سپرد کیا جانا

اِن آیات کا پس منظر یہ ہے کہ فرعون کو اُس کے نجومیوں اور جوتشیوں نے بتایا تھا کہ عنقریب بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیرا اور تیری حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ سن کر فرعون نے یہ ظالمانہ حکم صادر کیا کہ جو بھی بچہ پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے۔ اس کا حکم تھا کہ بالخصوص بنی اسرائیل کا کوئی بچہ کسی بھی صورت نہیں چھوڑنا، اسے لازم قتل کرنا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ نظام کے مطابق بچی نے تو تخت سنبھالنا نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی خطرہ ہے تو لڑکے سے ہی ہے۔ ان حالات میں بنی اسرائیل کا ایک خوش نصیب گھر ایسا تھا، جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اب کسی کو کیا خبر تھی کہ یہ بچہ آنے والے وقت میں موسیٰ علیہ السلام بنیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد پیش آنے والے حالات آپ کی والدہ ماجدہ کے مقامِ یقین کا پتہ دیتے ہیں۔ آیئے! قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں حاصل ہونے والی یقین کی اس تجلی سے اِکتسابِ فیض کرتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے ایک گھر میں بیٹا پیدا ہوا گھر والوں نے اُس بچے کا نام موسیٰ رکھا۔ گھر میں خوشی کے بجائے خوف کے بادل منڈلانے لگے، اس لیے کہ اب اس بچے کو فرعونی حکومت کے قانون کے تحت قتل ہونا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اس بات سے خوف زدہ ہوگئیں کہ میرے ہاں تو بیٹا پیدا ہوگیا ہے، کہیں ظالم فرعونی سپاہی آ کر اسے قتل نہ کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات القاء کی:

وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡهِ.(۱)

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تم انہیں دودھ پلاتی رہو۔

قرآن مجید میں اِلقاء اور وحی دونوں کے لیے وحی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ اَوۡحَیۡنَاۤ کی نسبت اگر نبی کی طرف ہوتو پھر اسے وحی کہتے ہیں۔ اگر اس کی نسبت نبی کی طرف نہ ہوتو اسے الہام یا القاء کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء اور خاص بندوں کے دلوں میں القاء کرتا ہے۔

دودھ پلانے کی ہدایت فرما کر ساتھ یہ بھی حکم فرمایا:

فَاِذَا خِفۡتِ عَلَیۡهِ فَاَلۡقِیۡهِ فِی الۡیَمِّ وَلَا تَخَافِیۡ وَلَا تَحۡزَنِیۡ.(۲)

پھر جب تمہیں ان پر (قتل کردیے جانے کا) اندیشہ ہوجائے تو انہیں دریا میں ڈال دینا اور نہ تم (اس صورت حال سے) خوف زدہ ہونا اور نہ رنجیدہ ہونا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے یقین کا عالم دیکھیے کہ ماں اپنے لختِ جگر کو اپنے ہی ہاتھوں سے دریا کے حوالے کر رہی ہیں۔ اسے یقین کہتے ہیں۔ اب یہاں دو خیالات ذہن میں آتے ہیں:

۱۔ ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ فرعونی سپاہی قتل کرنے آجائیں تو میں ان کو دے دوں اور انہیں کہوں کہ میری آنکھوں کے سامنے اسے نہ مارنا بلکہ کہیں دور لے جا کر اس کے ساتھ جو کرنا ہے کر لینا۔

۲۔ اِس کے برعکس دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ماں اپنے ہاتھوں سے بچے کو دریا کے سپرد کر دے۔ دوسری بات بھی قتل کرنے سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ظاہری اِعتبار سے دیکھا

---

(۱) القصص، ۲۸: ۷

(۲) القصص، ۲۸: ۷

جائے تو ایک نومولود بچے کو دریا کے سپرد کر دینے سے اس کے زندہ رہنے کے امکان نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ اَوّل نومولود کے ڈوبنے کا خطرہ، اگر اس سے بچتا ہے تو زندہ رہنے کے لیے اسے دودھ کی ضرورت ہے۔ دودھ پلانے والا کوئی نہ ہو تو اس صورت میں بچہ کیسے زندہ رہ سکے گا؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس صورتِ حال سے خوف زدہ اور رنجیدہ نہ ہونا کہ اگر بچے کو دریا میں پھینک دیا تو کیا بنے گا؟ اللہ تعالیٰ نے خوف اور غم دونوں کو اُن کے ذہن سے نکال دیا۔ اگر دل سے خوف اور غم دور ہو جائے تو یہی شان اللہ کے دوستوں کی ہوتی ہے، جس کو اُس نے قرآن مجید میں دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ○[1]

خبردار! بے شک اولیاء اللہ پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ وغمگین ہوں گے○

ماں اپنے جگر گوشے کو اپنے ہی ہاتھوں سے دریا میں پھینک رہی ہے، اسے یقین کہتے ہیں۔ اُدھر رب بچے کو دریا میں پھینکوا بھی رہا ہے اور ساتھ فرما بھی رہا ہے کہ غم زدہ بھی نہیں ہونا۔ کیا کوئی ایسی صورت حال کا سامنا کرنے کی جسارت کر سکتا ہے؟

(۲) ایمان اور یقین، خوف وغم کو ختم کر دیتے ہیں

یہ یقین کی ایک عظیم مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ اَہلِ ایمان کو یقین کے اس مقام پر لانا چاہتا ہے۔ اپنا بچہ اپنے ہی ہاتھوں سے دریا میں پھینک دینا اور غم زدہ بھی نہ ہونا، ایسا صرف اور صرف یقین کی قوت سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ خوف اور غم کی ساری سوچیں ایک طرف جمع کر لیں کہ پانی صندوق میں چلا جائے گا، بھوک لگے گی تو کیا ہوگا؟ کہیں یہ ڈوب نہ جائے، کہیں سانس بند نہ ہو جائے وغیرہ وغیرہ۔ دوسری طرف ایمان و یقین ہر طرح کے خوف وغم اور اندیشوں کو بھگا دیتے ہیں۔ یقین، غم اور خوف کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے خوف! اے

---

(۱) یونس، ۱۰:۶۲

غم! جب اللہ کہہ رہا ہے کہ نہ خوف رکھ اور نہ رنجیدہ ہو تو پھر کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ لہٰذا وہ اللہ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کر لیتا ہے۔

یقین سے سوال کرتے ہیں کہ میں نے بچہ دریا کے حوالے کر دیا تو اب اس کا کیا بنے گا، کچھ تو ہوگا؟ یقین کہتا ہے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے نہ 'کب' سے واسطہ ہے، نہ 'کیوں' سے غرض ہے اور نہ ہی 'کیسے' سے مطلب ہے۔ یہ تینوں الفاظ شک کی کتاب کے ابواب ہیں۔ ہم تو شک کی جڑ کاٹنے والے لوگ ہیں۔ یقین کہتا ہے: 'کب'، 'کیوں' اور 'کیسے' کا نہیں پتہ، مگر فتح یابی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ شک پوچھتا ہے: کب؟ یقین کہتا ہے: مجھے نہیں معلوم، مجھے ان چیزوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں نے 'کب' کی روٹی نہیں کھائی، 'کیوں' کا سالن بھی نہیں کھایا اور 'کیسے' کا مشروب بھی نہیں پیا۔ کچھ بھی ہو جائے، آخر کار ہم ہی فتح یاب ہوں گے۔ (اِن شاء اللہ۔)

شک کی وجہ سے پیدا ہونے والے خوف اور غم نے پوچھا: اے یقین! اتنا تو بتا دے تو اتنی پختہ بات کیوں کر رہا ہے؟ اُس نے کہا: میرے رب نے یہی کہا ہے۔ ایسا کب ہوگا؟ وہی جانے۔ کیوں ہوگا؟ وہی جانے۔ کیسے ہوگا؟ وہی جانے۔ میرا نام یقین ہے۔ یقین کبھی پردے کے پیچھے نہیں دیکھتا، بلکہ صرف اور صرف مانتا ہے۔ وہ اس آیت مبارکہ کے مصداق ہوتا ہے:

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۝ (1)

اور وہ آخرت پر بھی (کامل) یقین رکھتے ہیں۝

آخرت کو کسی نے نہیں دیکھا، مگر قرآن کہتا ہے کہ مومن یقین رکھتا ہے کہ آخرت واقع ہوگی۔ شک کہتا ہے کہ یقین کرتے کرتے تو مَر چلا ہے، لوگ تیرا جنازہ پڑھنے آ گئے ہیں، آخرت کب واقع ہوگی؟ وہ کہتا ہے کہ مجھے اس 'کب' سے کوئی غرض نہیں ہے مگر آخر یہ ضرور ہوگی۔ میری زندگی میں نہ سہی مگر تمہاری زندگی میں تو ضرور ہوگی۔ یقین ان چیزوں سے بے نیاز ہے۔ یقین جب اتنا طاقت ور ہو جائے تو پھر باقی سب چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔

---

(۱) البقرة، ۲:۴

اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو خوف وغم نہ کرنے کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ یقین کی اس منزل تک پہنچا دیا کہ یوں ارشاد فرمایا:

اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○[1]

بے شک ہم انہیں تمہاری طرف واپس لوٹانے والے ہیں۔ اور انہیں رسولوں میں (شامل) کرنے والے ہیں ○

ماں اپنے ہاتھوں سے نومولود بچے کو دریا میں پھینک چکی ہو اور کوئی اسے کہے کہ ہم یہ بچہ تمہاری طرف پلٹا دیں گے تو کیا کوئی مانے گا؟ نہیں! مگر اہلِ ایمان و یقین اس کو مان لیں گے۔ کیونکہ اُنہیں اپنے رب کی ذات پر کامل بھروسہ ہے کہ وہ جو فرماتا ہے اور جس کا یقین دلاتا ہے بالآخر وہی وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اِسی قوت کی بدولت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو یقین ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کو میری طرف ضرور پلٹائے گا اور اسے اپنا رسول بھی بنائے گا۔ اسی یقین کی وجہ سے اُنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک صندوق میں بند کر کے دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔

(۳) فرعون کے گھر موسیٰ علیہ السلام کی پرورش

اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ صندوق میں موجود وہ نومولود بچہ بغیر کھائے پیے پانی میں بہتا رہا۔ آخرکار وہ صندوق فرعون کے محل کے ساتھ جا ٹکرایا۔ فرعون کے گھر والوں نے جب اس صندوق کو دریا سے اُٹھایا اور کھولا تو اندر سے بچہ نکلا۔

بعد کے حالات و واقعات کو قرآن مجید یوں بیان فرماتا ہے:

فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ ○ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ق صلے عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا

(۱) القصص، ۲۸:۷

يَشْعُرُوْنَ○[۱]

پھر فرعون کے گھر والوں نے انہیں (دریا سے) اٹھا لیا تا کہ وہ (مشیّتِ الٰہی سے) ان کے لیے دشمن اور (باعثِ) غم ثابت ہوں۔ بے شک فرعون اور ہامان اور ان دونوں کی فوجیں سب خطا کار تھے○ اور فرعون کی بیوی نے (موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر) کہا کہ (یہ بچہ) میری اور تیری آنکھ کے لیے ٹھنڈک ہے۔ اسے قتل نہ کرو، شاید یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں اور وہ (اس تجویز کے انجام سے) بے خبر تھے○

فرعون کی زوجہ نے بچے کے چہرے کو دیکھا تو وہ اس کو اتنا خوبصورت لگا کہ اس کے دل میں گھر کر گیا اور اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن گیا۔ اسی بنا پر فرعون کی بیوی نے اُس بچے کو اپنے پاس رکھنے کی خواہش ظاہر کر دی اور فرعون نے بھی اپنی بیوی کی بات مان لی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو صندوق دریا کے حوالے کرنے کے بعد اپنے بچے کی کچھ خبر نہیں تھی۔ اُنہوں نے دریا میں صندوق ڈالتے وقت اپنی بیٹی کو کہا کہ تو ذرا دریا کے کنارے کنارے ساتھ چلتی جاؤ اور مجھے خبر دیتی جاؤ کہ کیا ہوتا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ اپنی والدہ کو صندوق کے سفر کی تمام خبر دیتی رہی۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ بچے والے صندوق کو فرعون کے گھر والوں نے اُٹھا لیا تو اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر کیا گزر رہی تھی، قرآن کہتا ہے:

وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ○[۲]

اور موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا دل (صبر سے) خالی ہوگیا، قریب تھا کہ وہ (اپنی بے قراری کے باعث) اس راز کو ظاہر کر دیتیں اگر ہم ان کے دل پر صبر و سکون کی

(۱) القصص، ۲۸:۸-۹

(۲) القصص، ۲۸:۱۰

قوّت نہ اتارتے تا کہ وہ (وعدۂ الٰہی پر) یقین رکھنے والوں میں سے رہیں○

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ معلوم ہوا کہ اس طرح کے حالات اہلِ یقین پر آتے اور جاتے رہتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اس صورتِ حال کو اُن پر دائمی نہیں رکھتا بلکہ جب اہلِ یقین کے دل کا برتن صبر سے خالی ہونے لگتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ صبر اور سکون کی قوت نازل کر کے ان کی استقامت کا سامان بھی پیدا فرما دیتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی جب ایسے حالات آتے تھے تو اللہ تعالیٰ اُن کے لیے بھی یہ اِہتمام کیا کرتا تھا اور اُن پر سکینہ اور اطمینان اُتارتا تھا۔ لہٰذا اگر حق کی راہ میں جد و جہد کرنے والے اہلِ حق کبھی حالات کی شدت کی وجہ سے پریشان ہوں تو ایسی پریشانی کا ہونا کوئی جرم اور گناہ والی بات نہیں ہے، کیونکہ یہ چیز فطرتِ بشری میں شامل ہے اور اسی کو انسان کہتے ہیں۔ بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی حال میں اللہ رب العزت سے تعلق نہ ٹوٹے، بندہ اپنی اصل سے جڑا رہے، ذاتِ باری تعالیٰ پر ایمان کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے پھر اللہ تعالیٰ صبر وسکون نازل فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر بھی سکینہ اُتاری۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام صندوق میں سفر کرتے ہوئے فرعون کے محل پہنچ گئے۔ گویا جو بنی اسرائیل کے لڑکے کو مارنے کے درپے تھا، اللہ تعالیٰ نے اُسی کے گھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہنچا دیا۔ اہل حق کے لیے 'یقین' قائم کرنے کا یہ انوکھا واقعہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے کام ہیں اور اس کی حکمتیں اور تدابیر ہیں کہ وہ کس طرح راستے پیدا کرتا ہے۔ اتنا کچھ بیت جائے، آگے اندھیرا ہی اندھیرا ہو، معروضی حالات میں کامیابی کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تو پھر کامیابی کیسے؟ یاد رکھ لیں! سب کچھ اُس کے پاس ہے۔ وہ خالقِ کل ہے؛ 'کب'، 'کیوں' اور 'کیسے' کا وہی مالک ہے۔ ہمارا کیا ہے، ہم تو فقط بندے ہیں۔ ہم تو صرف مالی ہیں، مالک تو نہیں ہیں۔

فرعون نے اپنی بیوی کی بات مان لی۔ بچے کو دودھ پلانے کے لیے دائی کو بلوایا گیا ایک دائی آئی، دودھ پلانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن موسیٰ علیہ السلام نے دودھ نہیں پیا۔ اب فرعون کی

بیوی بچے پر جان چھڑک رہی تھی اور اسے اپنے سے بھی زیادہ عزیز سمجھ رہی تھی۔ دوسری دائی آئی اور اس طرح یکے بعد دیگرے کئی دائیاں آئیں لیکن ہر کوئی سر توڑ کوشش کر کے تھک گئی مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے کسی کا بھی دودھ نہیں پیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ:

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ.(۱)

اور ہم نے پہلے ہی سے موسیٰ (علیہ السلام) پر دائیوں کا دودھ حرام کر دیا تھا۔

نو مولود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جبلت میں ڈال دیا تھا کہ اپنی ماں کے علاوہ کسی دائی کا دودھ نہیں پینا۔ یہ مناظر دیکھ کر فرعون کی بیوی تڑپتی تھی کہ بچہ آخر دودھ کیوں نہیں پی رہا؟ اب معصوم بچے کو کیا پہچان ہے کہ کون دودھ پلا رہا ہے؟ پرانا رواج تھا کہ دودھ تو دائیاں ہی پلاتی تھیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے کسی دائی کا دودھ نہیں پیا اور فرعون کی بیوی مسلسل پریشانی میں ہے کہ بچے کی جان خطرے میں ہے تو موسیٰ علیہ السلام کی بہن جو اپنی والدہ کے کہنے پر صندوق کے ساتھ ساتھ چلتی آئی تھی کہ یہ صندوق کہاں جا کر رکتا ہے۔ اُس نے فرعون کی بیوی سے عرض کیا:

هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ○(۲)

کیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کی نشان دہی کروں جو تمہارے لیے اس (بچے) کی پرورش کر دیں اور وہ اس کے خیر خواہ (بھی) ہوں○

فرعون کی بیوی نے کہا: فورًا بتاؤ۔ یوں اُس نے اُنہیں اپنی والدہ کے بارے آگاہ کیا۔ فرعون کی بیوی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بڑی عزت و احترام اور اکرام سے اپنے محل میں بلوا لیا۔ جب والدہ نے آپ کو دودھ پلایا تو انہوں نے فوراً پی لیا۔ یہ دیکھ کر فرعون کی بیوی خوش ہو گئی اور اس نے کہا: آپ نے کہیں نہیں جانا، اِدھر ہی رہنا ہے۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ جھونپڑی چھوڑ کر محل میں منتقل ہو گئیں اور حقیقی ماں ہی فرعون کے محل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کرنے لگیں۔ اس تمام صورتِ حال پر قرآن بیان کرتا ہے:

(۱) القصص، ۲۸: ۱۲

(۲) القصص، ۲۸: ۱۲

فَرَدَدْنٰـهُ اِلٰٓی اُمِّهٖ کَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللهِ حَقٌّ وَّلٰـکِنَّ اَکْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَo(۱)

پس ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (یوں) ان کی والدہ کے پاس لوٹا دیا تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور تاکہ وہ (یقین سے) جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتےo

اللہ رب العزت یوں اہل حق سے اپنا کیا وعدہ پورا فرماتا ہے۔ شرط صرف غیر متزلزل یقین اور استقامت ہے۔

’مالی دا کم پانی دینا‘

یہ تمام واقعہ ’کیسے‘ کا جواب ہے۔ یاد رکھیں کہ یہ نظام اللہ رب العزت ہی وضع کرتا ہے۔ ہمارا کام ایمان، یقین، تقویٰ، صبر اور عشقِ رسول ﷺ کے ساتھ لیس ہو کر حق کی جنگ جاری رکھنا ہے۔ تحریکِ منہاج القرآن کے کارکنان پیغامِ عشقِ رسول ﷺ کی اتنی دھوم مچا دیں کہ پاکستان کے اندر اور باہر پوری دنیا کے کناروں تک اُلفتِ مصطفیٰ ﷺ کی خوشبو پھیل جائے اور ساری دنیا عشقِ رسول ﷺ کے نور سے منور ہو جائے۔ حلقاتِ درود، دروسِ قرآن کی محافل اور دروسِ حدیث کے ذریعے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اصل تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے دن رات محنت کریں۔ یہ تمام سرگرمیاں ہی ہماری اصل طاقت ہیں۔ تنظیم سازی کریں، دعوت دیں، رفیق بنائیں، کارکن خود بھی اور اپنے بیٹے، بیٹیوں اور بیویوں کو بھی اس حق کے کام میں مصروف کریں۔ سب مل کر اس پیغام کو پھیلائیں، بس ہمارا کام یہ ہے:

مالی دا کم پانی لانا بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھل پھول لانا لاوے یا نہ لاوے

مالی مشکیں نہیں گنتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا کام صرف پانی دینا ہے۔ کامیاب مالی

(۱) القصص، ۲۸:۱۳

وہ ہوتا ہے جو مالک بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ بندے اور مولیٰ کے درمیان کام کی تقسیم ہے۔ بندے کا کام یقین کرنا، یقین پر جمنا، یقین پر رہنا، یقین پر چلنا، یقین پر لڑنا، یقین پر مرنا اور اپنی مشکلوں کی گنتی نہ کرنا ہے۔ یقین اتنی سستی شے نہیں ہے کہ اللہ ہر ایک کو بانٹ دے۔ اسی لیے تو ارشاد فرمایا:

وَّلٰـكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ○(۱)

لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے○

اس راز کو اگر سب جان لیں تو وہ یقین والے ہو جائیں۔ جنہیں اللہ نے یقین کی خیرات دی ہے، وہ اس کے دوست ہو کر اولیا اللہ میں سے ہوگئے۔ وہ مال و دولت تو ہر ایک کو دے دیتا ہے مگر یقین کی صورت میں اپنی دوستی کا عظیم سرمایہ سب کو نہیں دیتا۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

وَلَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَزِنُ عِنْدَ اللهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ، مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا قَطْرَةً أَبَدًا.(۲)

اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی حیثیت مچھر کے پر جتنی بھی ہوتی تو کافر کو اس میں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ دیتا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی مال و دولت کے بغیر بسر نہیں ہوتی مگر یہی تو آزمائش اور مولیٰ کے رنگ ہیں۔ غور طلب بات ہے! آج سب سے زیادہ دولت روئے زمین پر اللہ کے

---

(۱) القصص، ۲۸:۱۳

(۲) ۱۔ ابن ماجه، السنن، کتاب الزهد، باب مثل الدنيا، ۲: ۱۳۷۶، رقم: ۴۱۱۰

۲۔ ابن أبي شيبة، المصنف، ۷: ۷۸، رقم: ۳۴۳۲۴

۳۔ طبراني، المعجم الكبير، ۶: ۱۵۷، رقم: ۵۸۴۰

دوستوں اور وفاداروں کے پاس نہیں بلکہ اس کے دشمنوں کے پاس ہے یعنی غیر مسلم دنیا کی ملکیت ہے۔ اسلام کا جو سچا وفادار ہے، اس کی معاشی حالت اس کے دشمنوں کے مقابلے میں تنگ ہے۔ اس سلسلے میں استثناء بھی ہوتا ہے۔ مال و دولت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بھی دیا اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی عطا کیا گیا۔ کئی ایک کو دیتا ہے تا کہ وہ اُسے اللہ کے دین اور اس کے بندوں پر خرچ کر سکیں۔ وہ مومنوں کو بھی دیتا ہے تا کہ ان سے اپنے دین پر خرچ کرائے اور ان سے نیکیاں کروائے۔ یہاں اکثریت کی بات ہو رہی ہے کہ وہ ایسے نہیں بانٹتا۔

لیکن اَہلِ حق کو وہ دنیاوی مال و اسباب فراوانی سے عطا نہیں فرماتا کیونکہ یہ اُس کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ لہٰذا وہ تنگ دستی اور بے سر و سامانی سے بھی اَہلِ حق کو آزماتا ہے۔

۳۔ یقین کی تیسری تجلی

یقین کی تیسری تجلی سے اِکتسابِ فیض بھی ہم صلح حدیبیہ ہی کے تناظر میں کرتے ہیں۔ اس سے ہمیں معلوم ہوگا کہ اہل یقین عاشق لوگ 'کیسے' کا جواب خود کیسے نکال لیتے ہیں؟

ابو بصیر رضی اللہ عنہ نامی ایک صحابی (ان کا اصلی نام عتبہ رضی اللہ عنہ بن اسید بن جاریہ تھا) مکہ میں قید تھے۔ کسی طرح اہل مکہ کی قید سے فرار ہو کر آقائے دو جہاں ﷺ کی بارگاہ میں مدینہ پہنچ گئے۔ اَزہر بن عبد عوف ان کا مالک تھا۔ اس نے اور اخنس بن شریق نے مل کر حضور نبی اکرم ﷺ کو خط لکھا اور بنی عامر بن لوی قبیلے کے ایک آدمی کے ذریعے یہ خط آپ ﷺ کو پیش کیا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ یہ ہمارا آدمی ہے اور ہمارا معاہدہ ہے کہ آپ ہمارے کسی بھی آدمی کو پناہ نہیں دیں گے، لہٰذا ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ہاتھ واپس بھیج دیں۔

ابو بصیر رضی اللہ عنہ جب بارگاہِ رسالت میں پہنچے تو یہ آدمی بھی خط لے کر اُسی وقت پہنچ گیا۔ اگر خط نہ بھی جاتا تب بھی رسالت مآب ﷺ کے ذہن میں معاہدہ تھا، لہٰذا آپ ﷺ انہیں واپس روانہ کر دیتے۔ خط دیکھنے کے بعد آقاے دو جہاں ﷺ نے ارشاد فرمایا:

يَا أَبَا بِصَيْرِ! إِنَّا قَدْ أَعْطَيْنَا هٰؤُلَاءِ الْقَوْمَ مَا قَدْ عَلِمْتَ، وَلَا يَصْلُحُ لَنَا فِي

دِينِنَا الْغَدْرُ. (۱)

اے ابو بصیر! آپ کو معلوم ہے کہ ہم اس قوم کے ساتھ ایک معاہدہ کر چکے ہیں اور ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم اس معاہدے کی خلاف ورزی کریں۔

خیر الانام ﷺ نے حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ کو پناہ دینے سے انکار فرما دیا اور انہیں واپس کر دیا۔ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے بہت منت سماجت کی اور بارگاہِ رسالت میں عرض کیا:

يَا رَسُولَ اللهِ! تَرُدُّنِي إِلَى الْمُشْرِكِينَ، يَفْتِنُونَنِي فِي دِينِي وَيَعْبَثُونَ بِي؟ (۲)

یا رسول اللہ! کیا آپ مجھے مشرکوں کی طرف واپس بھیج رہے ہیں۔ وہ میرے ایمان کو آزمائش اور فتنے میں ڈال دیں گے اور مجھے کمزور سمجھ کر تنگ کریں گے۔

آقائے دو جہاں ﷺ نے سن کر ارشاد فرمایا:

اصْبِرْ يَا أَبَا بَصِيرٍ وَاحْتَسِبْ، فَإِنَّ اللهَ جَاعِلٌ لَكَ وَلِمَنْ مَعَكَ مِنَ الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَرَجًا وَمَخْرَجًا. (۳)

اے ابو بصیر! صبر کرو اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اور تمہارے ساتھ جو کمزور مومن لوگ ہیں ان کے لیے نجات کی کوئی راہ کھول دے گا۔

---

(۱) ۱۔ ابن هشام، السيرة النبوية، ۴: ۲۹۲
۲۔ طبری، تاريخ الأمم والملوك، ۲: ۱۲۵
۳۔ حلبی، إنسان العيون فی سيرة الأمين المأمون، ۲: ۷۱۹

(۲) ۱۔ بيهقی، السنن الكبری، ۹: ۲۲۷، رقم: ۱۸۶۱۱
۲۔ بيهقی، السنن الصغری، ۸: ۱۶۴
۳۔ ابن هشام، السيرة النبوية، ۴: ۲۸۷

(۳) ۱۔ بيهقی، السنن الكبری، ۹: ۲۲۷، رقم: ۱۸۶۱۱
۲۔ بيهقی، السنن الصغری، ۸: ۱۶۴، رقم: ۳۷۷۲
۳۔ ابن هشام، السيرة النبوية، ۴: ۲۸۷

گویا خیر الوریٰ ﷺ نے انہیں دعا دی مگر معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی اور انہیں واپس پلٹنے کا حکم ارشاد فرما دیا۔

حضور نبی اکرم ﷺ کے حکم کی تعمیل پر ابو بصیر رضی اللہ عنہ اُن لوگوں کے ہمراہ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ سے نکلتے ہی بنو عامر کے ساتھی سے کہا کہ ذرا اپنی تلوار تو دکھاؤ کیسی ہے؟ وہ ایک غلام تھا، اُس نے انہیں تلوار دے دی۔ حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ محسنِ انسانیت ﷺ تو معاہدے کے پابند ہیں، انہوں نے تو معاہدہ نہیں توڑا اور نہ ہی توڑیں گے اور معاہدہ کی پاس داری کرتے ہوئے مجھے اِن کے حوالے کر دیا۔ اب اُن کا کوئی ذمہ نہیں لیکن کیا اب ہم دس سال تک ان کی تلواروں سے ٹکڑے ہوتے رہیں گے اور یونہی ان کے ظلم سہتے رہیں گے؟ انہوں نے یہ سوچ کر کہ ریاستِ مدینہ کی حدود ختم ہو چکی ہیں اور آقاے دو جہاں ﷺ کی ذمہ داری ختم ہوگئی ہے، موقع پاتے ہی تلوار سے اُس شخص کی گردن اڑا دی جو ان کو لینے آیا تھا۔ اس کے ساتھ دوسرا کافر بھاگ کر دوبارہ مدینہ منورہ جا پہنچا۔ آقا ﷺ کی بارگاہ میں جا کر کہنے لگا: یا محمد! اُس نے تو ایسا کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے اپنے وعدہ کے مطابق اپنا فریضہ ادا کر دیا۔

ابو بصیر رضی اللہ عنہ پھر مدینہ منورہ آئے اور عرض کرنے لگے: یا رسول اللہ! اب تو آپ مجھے پناہ دے دیں۔ اگر آپ نے مجھے اب بھیجا تو وہ مجھے کسی بھی صورت نہیں چھوڑیں گے بلکہ وہ مجھے قتل کر کے ہی دم لیں گے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں کسی بھی صورت معاہدہ نہیں توڑ سکتا۔ یہ سن کر حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ مدینہ سے چلے گئے۔ جب وہ جا رہے تھے تو آقاے دو جہاں ﷺ نے انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا:

لَوْ كَانَ مَعَهٗ رِجَالٌ.(١)

---

(١) ١۔ بیهقی، السنن الکبری، ٩: ٢٢٧، رقم: ١٨٦١١
٢۔ بیهقی، السنن الصغری، ٨: ١٦٤، رقم: ٣٧٧٢
٣۔ ابن هشام، السیرة النبویة، ٤: ٢٩٢
٤۔ طبری، تاریخ الأمم والملوك، ٢: ١٢٥

کاش اس کے ساتھ کچھ اور مرد بھی ہوتے! (کتنے افسوس کی بات ہے کہ اتنا بہادر شخص تنہا ہے۔)

(ا) اَہلِ دل اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں

ابو بصیر رضی اللہ عنہ مدینہ سے نکل کر بلادِ بنو سلیم کے علاقے العیص پہنچے۔ وہاں میٹھے پانی کے چشمے تھے اور سمندر کا ساحل بھی تھا۔ آپ نے وہاں سکونت اختیار کر لی۔ مذکورہ علاقہ نہ تو مکہ کی ریاست میں آتا تھا اور نہ ہی مدینہ منورہ کی ریاست کی حدود میں آتا تھا۔ اہل مکہ کے قافلے شام جانے کے لیے العیص سے گزرتے تھے۔ جب ابو جندل رضی اللہ عنہ کو خبر ملی کہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ نہیں دی اور وہ بنو سلیم کے بلاد میں آباد ہوگئے ہیں تو ابوجندل اور وہ مسلمان قیدی جو مشرکینِ مکہ کی قید میں تھے، وہ راتوں کو جیل توڑتے اور ایک ایک کر کے بلادِ بنو سلیم میں جمع ہونا شروع ہوگئے۔ یوں مظلوم قیدیوں نے العیص کو اپنی جائے پناہ بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ وہاں مسلمانوں کا ایک جتھہ تیار ہونے لگا۔ ان انقلابی قیدی کارکنوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے ستر (۷۰) تک جا پہنچی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ وہ مضبوط ہو گئے ہیں تو اپنی ضرورت کی اشیاء کے لیے قریشِ مکہ کا جو تجارتی قافلہ شام جاتا، اسے لوٹ لیتے۔ مشرکینِ مکہ کا یہ مال ان کے لیے حلال تھا، یوں اُن کا یہ باقاعدہ روزگار بن گیا۔

مکہ کے تجارتی قافلوں کا شام جانے کے لیے العیص کے علاوہ کوئی اور متبادل راستہ نہیں تھا اور انہیں شام جانے کے لیے بہر صورت وہیں سے گزرنا پڑتا تھا۔ ستر (۷۰) انقلابی کارکنوں کا جتھہ ہر وقت قافلے کے انتظار میں مستعد رہتا، جوں ہی مکہ کا کوئی قافلہ دکھائی دیتا، وہ فوری طور پر اسے لوٹ لیتے۔ اس طرح کفار کے قافلے لٹتے رہے اور روز بروز مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہاں مسلمانوں کی تعداد تین سو (۳۰۰) ہوگئی۔ جب مشرکینِ مکہ نے دیکھا کہ ان انقلابی جاں نثاروں نے ہمارا برا حال کر دیا ہے تو قریش کا ایک وفد بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں جا پہنچا اور منت سماجت کرتے ہوئے کہنے لگا کہ معاہدہ حدیبیہ کی اس شق -'جو مسلمان مکہ سے بھاگ کر مدینہ جائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُسے واپس بھیج دیں

گے اور ہم اس کے برعکس روک لیں گے - کو ہم خود منسوخ کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ اب جو مرضی آئے یا جائے ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ (۱)

وہ لوگ جو حق کی جد و جہد میں آزمائشوں اور درپیش حالات کی سنگینی سے پریشان ہو جاتے ہیں اور 'منزل کیسے ملے گی؟' اور اس جیسے دوسرے سوال کرتے ہیں، معاہدۂ حدیبیہ کی اس خاص شق کی کفارِ مکہ کی طرف سے منسوخی کی درخواست سے اُنہیں 'کیسے' کی سمجھ آ جانی چاہیے۔ یاد رکھ لیں! انقلابی کو صرف جواں مرد ہونا چاہیے اور منزل کی جانب یقین اور استقامت سے بڑھتے رہنا چاہیے، حالات خود بخود حق میں بدل جاتے ہیں۔

(۲) وفاداری بشرطِ اُستواری اَصلِ ایمان ہے

ساری زندگی عاشقِ رسول حضرت ابو بصیر ﷜ نے قربانیاں دیتے، لڑتے مرتے، کفار کے قافلے لوٹتے اور ایک فرد سے لے کر تین سو (۳۰۰) مجاہدین کی بستی آباد کرنے میں صرف کر دی۔ وہ اس انقلاب کے پورے گروہ کے بانی بنے مگر رخِ جاناں کے جلوؤں سے اپنی بے تاب آنکھوں کو ٹھنڈک نہ پہنچا سکے۔ رسول مکرم ﷺ نے انہیں پناہ نہ دی اور نہ ہی مدینہ میں ٹھہرایا مگر اس کے باوجود اس عاشقِ صادق کا عشقِ رسول ﷺ کسی طور بھی کم نہ ہوا۔ کسی بھی قسم کا شکوہ ان کی زبان پر نہیں آیا کہ یہ کیا ہے؟ میں تو انہی پر ایمان لایا تھا، انہی کا کلمہ پڑھتا تھا، مجھے پناہ کیوں نہ دی بلکہ الٹا مجھے ہی کفار کے سپرد کر دیا۔ ان کی زبان پر نہ ہی کبھی کوئی شکوہ آیا اور نہ ہی ان کا دل ذرہ برابر راہِ حق سے متزلزل ہوا۔

حضرت ابو بصیر ﷜ استقامت کے ساتھ حق پر ڈٹے رہے، جس طرح سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ رہنے والے صحابہ کرام ﷡ بدر اور اُحد کے میدانوں میں لڑتے تھے۔ ان کے ایمان، یقین اور وفاداری میں رتی برابر فرق بھی نہیں آیا حتیٰ کہ ملک الموت آ پہنچا۔ حضور پُرنور ﷺ کا مکھڑا دیکھنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ زندگی قید و بند میں گزری یا زخم کھاتے بسر

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب وكتابة الشروط، ۲: ۹۷۹، رقم: ۲۵۸۱

ہوئی۔ آقا ﷺ نے جب مدینہ سے واپس پلٹا دیا تو پھر سمندر کے کنارے انقلابیوں کی بستی بسانے میں زندگی گزری۔ کیسے بھی حالات ہوئے لیکن ہر پل ہر گھڑی حضور ﷺ کے دامن ہی سے وابستہ رہے۔ اُنہوں نے کسی بھی موڑ پر اپنے راہ کو نہیں چھوڑا، مشن نہیں چھوڑا، عشق نہیں چھوڑا، استقامت و یقین نہیں چھوڑا اور منزل نہیں چھوڑی۔

کفارِ مکہ کی طرف سے صلح نامہ حدیبیہ کی اس شق کے ختم کیے جانے کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کے نام خط لکھا کہ اب کافروں نے معاہدے کی شق واپس لے لی ہے، لہٰذا اب تم اور تمہارے ساتھ جتنے بھی احباب ہیں، سب مدینہ آ جاؤ۔ مگر جب حضور ﷺ کا خط اُن تک پہنچا تو اُس وقت حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ حالتِ نزع میں تھے۔

فَمَاتَ وَكِتَابُ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي يَدِهِ يَقْرَؤُهُ، فَدَفَنَهُ أَبُو جَنْدَلٍ مَكَانَهُ، وَجَعَلَ عِنْدَ قَبْرِهِ مَسْجِدًا. (۱)

رسول اللہ ﷺ کا خط اُن کے ہاتھ میں ہی تھا کہ اسے پڑھتے ہوئے ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ نے اسی جگہ (بلاد بنو سلیم العیص میں) دفن کر دیا اور ان کی قبر مبارک کے ساتھ مسجد بنا دی۔

یہاں ضمناً یہ بات بھی واضح کر دیں کہ جس طرح قرآن مجید کی روشنی میں اَہل اللہ کے مزارات کے ساتھ مسجد بنانا سورۃ الکھف سے ثابت ہے کہ اَصحابِ کہف کے پاس مسجد بنائی گئی، اُسی طرح اَہل اللہ کے مزارات کے ساتھ مسجد بنانا اس مذکورہ حدیث سے بھی ثابت ہے کہ جس جگہ حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو دفنایا گیا، وہیں ساتھ مسجد بھی بنا دی۔ وہ مسجد ابو بصیر کہلاتی

(۱) ۱۔ بیہقی، دلائل النبوۃ، ۴: ۱۷۵
۲۔ ذہبی، تاریخ الإسلام، ۲: ۴۰۱
۳۔ عسقلانی، فتح الباری، ۵: ۳۵۱
۴۔ عینی، عمدۃ القاری، ۱۴: ۱۶

ہے۔ اس کے بعد حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ، حضور نبی اکرم ﷺ کی دعوت پر ۳۰۰ عاشق مجاہدوں کو لے کر قافلہ کی صورت میں مدینہ پہنچے اور بارگاہِ رسالت میں حاضری دی۔ بعد ازاں آقاے دو جہاں ﷺ نے اُنہیں العیص میں ہی رہنے کی اجازت دے دی۔

(۳) بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے!

حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ پھر پلٹ کر مکہ نہیں گئے۔ ان کا باپ سہیل بن عمرو مکہ ہی میں تھا۔ یہ وہی تھا جو کفارِ مکہ کی طرف سے حدیبیہ میں مذاکرات کے لیے آیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کا نام مبارک لکھنے نہیں دے رہا تھا۔ اللہ کی شان دیکھیے کہ باپ کا عمل کیا تھا اور بیٹا کیسا جاں نثار عاشقِ رسول ﷺ تھا۔ بعد ازاں حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کا اسلام لانے کا واقعہ بھی بہت ہی ایمان افروز ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ وہی سہیل بن عمرو جو صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ کے اِسم پاک 'محمد (ﷺ)' کے ساتھ 'رسول اللہ' کٹوا رہا تھا۔ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم کو معاہدہ کے آغاز میں لکھنے نہیں دے رہا تھا اور حضور نبی اکرم ﷺ سے بحث و مباحثہ کرتا رہا۔ اس موقع پر ہمارے دل زخمی تھے، لیکن ہماری آنکھیں اس وقت ٹھنڈی ہو گئیں، جب اسی سہیل بن عمرو نے اسلام قبول کر لیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر اُن کا حال یہ تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ حلق فرما رہے تھے تو فرطِ جذبات سے لپک لپک کر آتے اور ایک ایک موئے مبارک کو اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا رہے تھے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

لَقَدْ رَأَيْتُ سُهَيْلَ بْنَ عَمْرٍو رضی اللہ عنہ بَعْدَ إِسْلَامِهٖ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ، قَائِمًا عِنْدَ الْمَنْحَرِ، يُقَرِّبُ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ بُدْنَةً، وَرَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَنْحَرُهَا بِيَدِهٖ، وَدَعَا الْحَلَّاقَ لِحَلْقِ رَأْسِهٖ. فَأَنْظُرُ إِلٰى سُهَيْلٍ كُلَّمَا يَلْفُظُ مِنْ شَعْرِهٖ ﷺ يَضَعُهُ عَلٰى عَيْنَيْهِ، وَأَذْكُرُ امْتِنَاعَهٗ أَنْ يُقِرَّ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَّةِ بِأَنْ يَكْتُبَ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، أَيْ: وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ، فَحَمِدْتُ اللهَ

وَشَكَرْتُهُ الَّذِي هَدَاهُ لِلْإِسْلَامِ.[1]

میں نے سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کو اسلام لانے کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر دیکھا کہ وہ قربان گاہ کے پاس کھڑے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے لیے قربانی کا جانور قریب لا رہے ہیں۔ رسول للہ ﷺ اسے اپنے مبارک ہاتھوں سے ذبح فرما رہے تھے۔ پھر آپ ﷺ کے سرِ انور کے حلق کے لیے حجام کو بلایا گیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کا موئے مبارک گرتا تو وہ فرط جذبات سے اسے لے کر اپنی آنکھوں پر لگاتے ہیں۔ چشم تصور میں وہ منظر بھی میں لاتا ہوں جب صلح حدیبیہ کے موقع پر وہ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھنے کا اقرار کرنے سے منکر ہو رہے تھے اور 'محمد رسول اللہ' لکھنے سے منع کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ لہٰذا اس پر میں نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی اور شکر ادا کیا جس نے اُنہیں اسلام کی ہدایت عطا فرمائی۔

حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ جیسے آقا ﷺ کے غلاموں، غریبوں، کمزوروں اور عاشقوں نے انقلاب بپا کیا اور کبھی بھی ان آزمائشوں، مشکلات اور غربت کا شکوہ نہ کیا۔ آپ کو یقین کی ان تجلیوں سے روشناس کروانے کا مقصد یہ ہے کہ حق کی راہ میں کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تحریک منہاج القرآن کے کارکنان پر 17 جون 2014ء سے لے کر آج تک جو کچھ بیتا اور جو کچھ بیت رہا ہے، یہ تو اَہلِ حق کی راہ میں آنے والی مشکلات و مصائب کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔ اس سے بہت زیادہ حضور ﷺ کے ان غلاموں پر بیت چکا ہے۔ امام حسین علیہ السلام پر اور آپ کے خانوادہ پر بیت چکا ہے۔ ہم تو ان کے نام لیوا اور اُن کے ٹکڑوں پر پلنے والے ہیں، لہٰذا حق کی راہ میں استقامت اور یقین کے ساتھ قائم رہیں۔ جس طرح حدیبیہ سے فتح کے راستے کھل گئے۔ اسی طرح اللہ رب العزت مصطفوی انقلاب کی اس جد و جہد میں ہمارے لیے اسباب اور مدد پیدا فرمائے گا۔ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے، ہمارا کام صرف سوئے منزل گامزن رہنا ہے۔

---

(۱) حلبي، إنسان العيون في سيرة الأمين المأمون، ۲: ۷۲۱

۴۔ یقین کی چوتھی تجلی: امام احمد بن حنبل کی استقامت

یقین کی چوتھی تجلی کے لیے آیئے! امام بن حنبل کا حال ملاحظہ کرتے ہیں (جسے مختصراً پہلے باب میں بیان کیا جاچکا ہے)۔ آپ نے بنوعباس کا زمانہ پایا۔ ابن الجوزی نے مناقب امام احمد بن حنبل میں، امام ابن ابی یعلی نے **طبقات الحنابلة** میں، حافظ ابن کثیر نے **البدایة والنهایة** میں اور دیگر کئی کتب میں لکھا ہے کہ معتزلہ کے دور میں خَلقِ قرآن کا ایک فتنہ پیدا ہوا۔ کچھ لوگوں نے یہ فتوے دیے کہ قرآن مجید مخلوق ہے۔ جبکہ امام احمد بن جنبل اور دیگر ائمہ کا مذہب یہ تھا کہ قرآن مجید مخلوق نہیں ہے۔ علماء سوء نے حکمرانوں سے مال و دولت کے حصول کے لیے حکمرانوں کی تائید کی۔

اس دور میں بنوعباس میں سے معتصم باللہ خلیفہ تھا۔ امام احمد بن حنبل اس قدر شجاع تھے کہ حکومت وقت ان سے ڈرتی تھی، لہٰذا انہوں نے امام احمد بن حنبل کو اپنے موقف کی تائید میں نہ ہونے کا بہانہ بنا کر قید کر دیا۔ آپ نے قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں، پھر آپ کو بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ اس کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ آپ کو قید خانے سے نکال کر ایک ہاتھ زمین سے اوپر ہوا میں لٹکا کر کوڑوں کی سزا دی جائے۔

امام احمد بن حنبل بعد میں اپنا حال بیان فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے قید کا ڈر نہ تھا، اگر وہ مجھے تلوار سے قتل کر دیتے تو اس کا بھی ڈر نہیں تھا کہ چلو تلوار چلے گی، جان چلی جائے گی، مگر بعض اوقات یہ خدشہ ضرور لاحق ہوتا تھا کہ کوڑے کھاتے کھاتے کہیں میرے صبر کا پیمانہ نہ چھلک جائے، کیونکہ میں یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے جھیل رہا ہوں۔

عاشق سوچتا ہے کہ مولا کے لیے کوڑے کھاتے ہوئے بشریت کے تقاضے کے تحت کہیں صبر اور عشق میں کمی واقع نہ ہو جائے، جس کے سبب میں بے ادب قرار دیا جاؤں۔ جس وقت انہیں کوڑوں کے لیے پکڑ کر لے جایا گیا، اس وقت ان کی عمر مبارک ستاون (۵۷) سال تھی۔ پچیس (۲۵) رمضان المبارک کے دن آپ کو روزے کی حالت میں کوڑے لگائے گئے، آپ درد کی شدت سے بے ہوش ہو جاتے۔ آپ کو پھر ہوش میں لایا جاتا اور کوڑے لگائے

جاتے۔ جلاد آپ کو کوڑے اس وقت تک لگاتے تھے جب تک آپ ہوش میں ہوتے تھے۔

حضرت عبد اللہ بن احمد بن حنبل روایت کرتے ہیں کہ بعد میں کئی بار اپنی یادوں میں گم بیٹھے میرے والد گرامی کی زبان سے نکلتا: 'اللہ تعالیٰ ابو الہیثم کو بخش دے۔' میں نے ان سے سوال کیا: بابا جان! یہ کون شخص ہے جس کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا، نہ آپ کا شاگرد اور نہ ہی آپ کا دوست تھا۔ وہ نہ تو آپ کے مشائخ میں سے تھا اور نہ ہی جان پہچان والوں میں سے تھا مگر کئی بار اپنی یادوں میں گم بیٹھے آپ کے منہ سے یہ دعا نکل جاتی ہے۔ امام احمد نے فرمایا: ابوالہیثم کوڑے لگانے والا حدّاد تھا۔

میں نے پوچھا: ابا جان اس کی بخشش کی دعائیں کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا: جس دن مجھے کوڑے لگانے کے لیے جیل سے نکال کر ایک ہاتھ زمین سے اونچا فضا میں معلق کر دیا گیا اور بڑے بڑے جلاد کوڑے لگانے کے لیے قطار میں کھڑے کر دیے گئے۔ دو دو کوڑے ہر جلاد پوری طاقت سے لگاتا اور اس کے بعد اگلا آجاتا۔ فرماتے ہیں کہ مجھے کوڑوں کے لیے جب اس جگہ پر لے جایا گیا تو ابوالہیثم میرے پاس آیا اور مجھے کہنے لگا: امام احمد بن حنبل میں بہت بڑا ڈاکو ہوں، مختلف اوقات میں ڈاکہ زنی کی، قتل کیے، دیگر جرائم کیے اور مجھے وقتاً فوقتاً کوڑوں کی سزائیں دی جاتی رہیں۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں مختلف وقتوں میں مجموعی طور پر اٹھارہ ہزار کوڑے کھائے ہیں، وہ اپنی رُوداد سناتا رہا اور میں سنتا رہا۔ پھر اس نے ایک جملہ بولا، اُس نے کہا: 'احمد بن حنبل! میں نے اٹھارہ ہزار کوڑے اطاعتِ شیطان میں کھائے ہیں، آپ صبر رکھنا اس لیے کہ آپ رحمٰن کی خاطر کوڑے کھا رہے ہیں، آپ کا صبر مجھ سے زیادہ ہونا چاہیے۔'

اس نے مجھے یہ نصیحت کی۔ بس اس کی نصیحت کرنے کی دیر تھی کہ پھر میں نے سارے کوڑے رحمٰن کے تصور میں جھیل لیے۔ اس نے مجھے یہ کہہ کر جو حوصلہ دیا تھا، آج تک جب بھی وہ یاد آتا ہے تو میں اس کی بخشش کی دعا کرتا ہوں۔[1]

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم بھی زندگی کے ہر مرحلہ میں راہِ حق پر چلتے ہوئے کبھی

(۱) ابن الجوزی، صفة الصفوة، ۲: ۳۵۱

یقین اور استقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں، بلکہ یقین کی ان مذکورہ تجلیات سے فیض لیتے ہوئے منزل کی جانب رواں دواں رہیں۔ یہ آزمائشیں مشکلات، مصائب، طعنے اور آلام تمام کے تمام ہمارے یقین کو مستحکم و مضبوط کرنے کے لیے ہیں نہ اِس لیے کہ ہم ان سے متاثر ہو کر متزلزل ہو جائیں۔

۵۔ مصطفوی اِنقلاب آ کر رہے گا! (اِن شاء اللہ عزوجل)

تحریک منہاج القرآن کے وفادار کارکنان و رُفقاء! یاد رکھیں کہ ہم حق پر ہیں۔ ہم اپنی جد و جہد کو آقاے دوجہاں ﷺ کی سنت و اُسوہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتباع میں جاری و ساری رکھیں گے۔ باطل شکست خوردہ ہے اور اسے ہر مرحلے میں شکست ہوگی۔ ہماری جنگ جاری ہے۔ اس انقلابی جد و جہد کے دوران ہمارا کسی سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔ ہم حالتِ جنگ میں تھے، حالتِ جنگ میں ہیں اور باطل کے ساتھ حق کی جنگ ہمیشہ جاری رہے گی۔ حسینیوں کی جنگ یزیدیوں کے خلاف جاری تھی، ہے اور رہے گی۔ اِن شاء اللہ! ہر ظلم کا بدلہ ملے گا، حق کا علَم بلند ہوگا، انقلاب آئے گا اور ہم اِن شاء اللہ سر بلند ہوں گے۔ شرط صرف یہ ہے کہ کسی بھی مرحلے کو آخری نہ سمجھیں۔ نشیب و فراز جد و جہد کا حصہ ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ سے بڑی قیادت کائنات میں کوئی نہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑا گروہ اور جماعت کائنات میں کوئی نہیں ہے۔ اگر اُن کی زندگیوں میں نشیب و فراز اور تلاطم آتے رہے تو ہم کون ہوتے ہیں جو ان آزمائشوں سے گزرے بغیر منزل کو پالیں۔

ان شاء اللہ! ہمارا انقلاب بھی شرمندۂ تعبیر ہوگا اور دنیا کی کوئی طاقت یہ منزل ہم سے چھین نہیں سکتی۔ اللہ رب العزت حق کی راہ پر چلنے والوں کے عزم اور حوصلوں کو جواں رکھے۔ تقویٰ، ایمان، توکل، یقین اور عشقِ رسول ﷺ آپ کی طاقت اور قوت ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے عاشق بنیں اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی چار سو دھوم مچائیں۔ اللہ پر یقین اور ایمان کامل رکھیں۔ یہ سب کچھ منزل تک پہنچانے کے لیے زادِ راہ ہے۔ اللہ پر یقین اور عشق مصطفیٰ ﷺ کا عزم لے کر مشن کے فروغ کے لیے سارے طریقے اور ذرائع اپنائیں۔ گھروں میں مت بیٹھیں، قریہ قریہ،

کوچہ کوچہ تنظیمیں بنائیں اور گھر گھر اس پیغام کو پھیلائیں، اِن شاء اللہ انقلاب آپ کے دروازے پر دستک دے گا۔ ہمیں صرف ایمان، یقین، توکل اور استقامت مضبوط و مستحکم تر کرنا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا○ (۱)

اور فرما دیجیے: حق آ گیا اور باطل بھاگ گیا، بے شک باطل نے زائل و نابود ہی ہو جانا ہے○

باطل کو شکست خوردہ ہونا ہے۔ حق کو کبھی شکست ہوئی، اور نہ کبھی ہو گی۔ انقلاب آئے گا، حق فتح یاب ہوگا، حق کا جھنڈا لہرائے گا، حق سر بلند ہوگا، باطل کچلا جائے گا، ظلم خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا، جبر کا خاتمہ ہوگا۔ غریب سر اٹھا کر چلیں گے۔ کمزور، طاقتور ہو گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ یہ قوم حق کے انقلاب کا سویرا دیکھے گی۔ اللہ رب العزت کا حکم ہے:

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ. (۲)

تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جو مایوس ہو جاتا ہے وہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ مومن کا کیا کام کہ رحمت سے مایوس ہو جائے۔ وہ مایوسی کو اُڑا کر پھینک دیتا ہے۔ مومن یقین رکھتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ جب سے زمین و آسمان بنے، حیاتِ انسانی پیدا ہوئی اور سورج، چاند، ستارے تخلیق ہوئے تب سے آج تک کوئی ایسی رات نہیں آئی جو ختم نہ ہوئی ہو اور سویرا طلوع نہ ہوا ہو۔ جب آج تک کوئی رات ایسی نہیں آئی جس پر سویرا طلوع نہیں ہوا تو یہ ظلم و جبر کی رات کیسے رہ سکتی ہے؟ یہ رات بھی ختم ہوگی اور حق کے انقلاب کا سویرا طلوع ہوگا۔ مگر ایمان، یقین اور استقامت کی قوت کو ہمیشہ اپنے شاملِ حال رکھیں۔

---

(۱) بنی اسرائیل، ۱۷: ۸۱

(۲) الزمر، ۳۹: ۵۳

مصطفوی انقلاب کی تگ و دو کرنے والے انقلابی کبھی یہ خیال دل میں نہ لائیں کہ انقلاب کی جد و جہد کم پڑ گئی ہے۔ جو کچھ ماضی میں ہوا وہ انقلاب کا ایک باب تھا، ابھی پوری کتاب باقی ہے۔ کتاب مکمل ہونے تک اس میں کئی باب اور آئیں گے۔ ایک باب ختم ہوا، اگلا باب آئے گا۔ پھر اس سے اگلا باب آئے گا۔ ہماری جد و جہد ایک پوری کتاب ہے۔ آخر کار مصطفوی انقلاب کی منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

مصادِر و مراجع

۱۔ القرآن الحکیم۔

۲۔ احمد بن حنبل، ابوعبد اللہ بن محمد (۱۶۴-۲۴۱ھ/۷۸۰-۸۵۵ء) ۔**المسند۔** بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء۔

۳۔ ابو اسحاق الثعلبی، احمد بن محمد بن ابراہیم النیسابوری (م۴۲۷ھ)۔ **الکشف والبیان (المعروف تفسیر الثعلبی)**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲ء۔

۴۔ بخاری، ابوعبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (۱۹۴-۲۵۶ھ/۸۱۰- ۸۷۰ء)۔ **الأدب المفرد۔** بیروت، لبنان: دار البشائر الاسلامیہ، ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء۔

۵۔ بخاری، ابوعبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (۱۹۴-۲۵۶ھ/۸۱۰- ۸۷۰ء)۔ **الصحیح۔** بیروت، لبنان + دمشق، شام: دار القلم، ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء۔

۶۔ بزار، ابو بکر احمد بن عمرو بن عبد الخالق بصری (۲۱۰-۲۹۲ھ/ ۸۲۵-۹۰۵ء)۔ **المسند۔** بیروت، لبنان: ۱۴۰۹ھ۔

۷۔ بغوی، ابو محمد بن فراء حسین بن مسعود بن محمد (۴۳۶-۵۱۶ھ/۱۰۴۴-۱۱۲۲ء)۔ **معالم التنزیل۔** بیروت، لبنان: دارالمعرفہ، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء۔

۸۔ بلاذری، احمد بن یحیٰ بن جابر (م۲۷۹ھ)۔ **فتوح البلدان۔** بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء۔

۹۔ بیضاوی، ناصر الدین ابی سعید عبد اللہ بن عمر بن محمد شیرازی بیضاوی (م۷۹۱ھ)۔ **أنوار التنزیل۔** بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۶ء۔

۱۰۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **الاعتقاد**۔ بیروت، لبنان: دارالآفاق، ۱۴۰۱ھ۔

۱۱۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **دلائل النبوۃ**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء۔

۱۲۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **السنن الصغری**۔ مدینہ منورہ، سعودی عرب: مکتبۃ الدار، ۱۴۱۰ھ/۱۹۸۹ء۔

۱۳۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **السنن الکبری**۔ مدینہ منورہ، سعودی عرب: مکتبۃ الدار، ۱۴۱۰ھ/۱۹۸۹ء۔

۱۴۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴-۴۵۸ھ/۹۹۴-۱۰۶۶ء)۔ **المدخل اِلی السنن الکبریٰ**۔ کویت: دار الخلفاء للکتاب الاسلامی، ۱۴۰۴ھ۔

۱۵۔ ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک سلمی (۲۱۰-۲۷۹ھ/۸۲۵-۸۹۲ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الغرب الاسلامی، ۱۹۹۸ء۔

۱۶۔ ابن جوزی، ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی بن محمد بن علی بن عبید اللہ (۵۱۰-۵۷۹ھ/۱۱۱۶-۱۲۰۱ء)۔ **صفۃ الصفوۃ**۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء۔

۱۷۔ حاکم، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن محمد (۳۲۱-۴۰۵ھ/۹۳۳-۱۰۱۴ء)۔ **المستدرک علی الصحیحین**۔ بیروت، لبنان: مکتبہ اسلامی، ۱۳۹۸ھ

۱۸۔ ابن حبان، ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان (۲۷۰-۳۵۴ھ/۸۸۴-۹۶۵ء)۔

الصحیح۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ،۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء۔

۱۹۔ ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد کنانی (۷۷۳-۸۵۲ھ/ ۱۳۷۲-۱۴۴۹ء)۔ الإصابة في تمييز الصحابة۔ بیروت، لبنان: دار الجیل، ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء۔

۲۰۔ ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد کنانی (۷۷۳-۸۵۲ھ/ ۱۳۷۲-۱۴۴۹ء)۔ فتح الباري شرح صحيح البخاري۔ لاہور، پاکستان: دار نشر الکتب الاسلامیہ، ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء۔

۲۱۔ ابن حجر ہیتمی، ابو العباس احمد بن محمد بن محمد بن علی بن محمد بن علی مکی (۹۰۹-۹۷۳ھ/۱۵۰۳-۱۵۶۶ء)۔ الخيرات الحسان فی مناقب الإمام الأعظم أبي حنيفة النعمان۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیۃ،۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء۔

۲۲۔ ابن حجر ہیتمی، ابو العباس احمد بن محمد بن محمد بن علی بن محمد بن علی مکی (۹۰۹-۹۷۳ھ/۱۵۰۳-۱۵۶۶ء)۔ الصواعق المحرقة على أهل الرفض والضلال والزندقة۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۹۹۷ء۔

۲۳۔ حسام الدین ہندی، علاء الدین علی متقی (م۹۷۵ھ)۔ کنز العمال في سنن الأقوال والأفعال۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۳۹۹/ ۱۹۷۹۔

۲۴۔ حکیم ترمذی، ابو عبد اللہ محمد بن علی بن حسن بن بشیر۔ نوادر الأصول في أحاديث الرسول۔ بیروت، لبنان: دار الجیل،۱۹۹۲ء۔

۲۵۔ حلبی، علی بن برہان الدین (م۱۴۰۴ھ)۔ السيرة الحلبية۔ بیروت، لبنان، دارالمعرفہ،۱۴۰۰ھ۔

۲۶۔ خطیب بغدادی، ابو بکر احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن مہدی بن ثابت (۳۹۳-۴۶۳ھ/۱۰۰۳-۱۰۷۱ء)۔ تاريخ بغداد۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ۔

۲۷۔ دارا شکوہ، ابن شاہجہان، شہزادہ (۱۶۱۵-۱۶۵۹ء)۔ **سفینة الأولیاء**۔ کراچی، پاکستان: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۶ء۔

۲۸۔ دارمی، ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمٰن (۱۸۱-۲۵۵ھ/ ۷۹۷-۸۶۹ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ۔

۲۹۔ ابو داود، سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد ازدی سجستانی (۲۰۲-۲۷۵ھ/ ۸۱۷-۸۸۹ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۴ء۔

۳۰۔ ابن ابی دنیا، ابوبکر عبد اللہ بن محمد بن عبید القرشی البغدادی (۲۰۸-۲۸۱ھ)۔ **الیقین**۔ دار البشائر الاسلامیہ۔

۳۱۔ دیار بکری، حسین بن محمد بن الحسن (م ۹۶۶ھ/ ۱۵۵۹ء)۔ **تاریخ الخمیس في أحوال أنفس نفیس**۔ بیروت، لبنان: مؤسسة الشعبان للنشر والتوزیع۔

۳۲۔ دینوری، ابو بکر احمد بن مروان بن محمد القاضی المالکی (م۳۳۳ھ)۔ **المجالسة وجواھر العلم**۔ بیروت، لبنان: دار ابن حزم، ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء۔

۳۳۔ دیلمی، ابو شجاع شیرویہ بن شہردار بن شیرویہ بن فناخسرو ہمذانی (۴۴۵-۵۰۹ھ/ ۱۰۵۳-۱۱۱۵ء)۔ **مسند الفردوس**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۸۶ء۔

۳۴۔ ذہبی، شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان (۶۷۳-۷۴۸ھ/ ۱۲۷۴-۱۳۴۸ء)۔ **تاریخ الاسلام ووفیات المشاھیر والأعلام**۔ بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء۔

۳۵۔ ذہبی، شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان (۶۷۳-۷۴۸ھ/ ۱۲۷۴-۱۳۴۸ء)۔ **تذکرة الحفاظ**۔ حیدر آباد دکن، بھارت: دائرۃ المعارف العثمانیہ، ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء

۳۶۔ ذہبی، شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان (۶۷۳-۷۴۸ھ/ ۱۲۷۴-۱۳۴۸ء)۔ **المغني في الضعفاء**۔

۳۷۔ ذہبی، شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان (۶۷۳-۷۴۸ھ/۱۲۷۴-۱۳۴۸ء)۔ **سیر أعلام النبلاء**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء۔

۳۸۔ رازی، محمد بن عمر بن حسن بن حسین بن علی تیمی (۵۴۳-۶۰۶ھ/ ۱۱۴۹-۱۲۱۰ء)۔ **التفسیر الکبیر**۔ تہران، ایران: دار الکتب العلمیہ۔

۳۹۔ ابن زنجویہ، حمید (م۲۵۱ھ)۔ **کتاب الأموال**۔ ریاض، سعودی عرب: مرکز الملک فیصل للبحوث والدراسات الاسلامیۃ، ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء۔

۴۰۔ سبکی، تاج الدین بن علی بن عبد الکافی (۷۲۷-۷۷۱ھ)۔ **طبقات الشافعیۃ الکبری**۔ ہجر للطباعۃ والنشر، ۱۴۱۳ھ۔

۴۱۔ ابن سعد، ابو عبد اللہ محمد (۱۶۸-۲۳۰ھ/ ۷۸۴-۸۴۵ء)۔ **الطبقات الکبری**۔ بیروت، لبنان: دار صادر۔

۴۲۔ سلیمان بن خلف الباجی، ابو ولید ابن سعد (۴۰۳-۴۷۴ھ)۔ **التعدیل والتجریح**۔ ریاض، سعودی عرب: دار اللواء للنشر، ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء۔

۴۳۔ سیوطی، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/ ۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **تاریخ الخلفاء**۔ بغداد، عراق: مکتبۃ الشرق الجدید۔

۴۴۔ سیوطی، ابو الفضل جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹-۹۱۱ھ/ ۱۴۴۵-۱۵۰۵ء)۔ **کفایۃ الطالب اللبیب فی خصائص الحبیب (الخصائص الکبریٰ)**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۸۵ء

۴۵۔ شعرانی، عبدالوہاب بن احمد بن علی بن احمد بن محمد بن موسیٰ، الانصاری، الشافعی، الشاذلی، المصری (۸۹۸-۹۷۳ھ /۱۴۹۳-۱۶۶۵ء)۔ **لواقح الأنوار القدسیۃ فی بیان العھود المحمدیۃ**، بیروت، لبنان: دار الأحیاء التراث العربی، ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء

۴۶۔ شہرستانی، ابو الفتح محمد بن عبدالکریم بن ابی بکر أحمد (۴۷۹-۵۴۸ھ)۔ **الملل والنحل**۔

بیروت، لبنان: دار المعرفۃ، ۲۰۰۱ء۔

۴۷۔ ابن ابی شیبہ، ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم بن عثمان کوفی (۱۵۹-۲۳۵ھ/ ۷۷۶-۸۴۹ء)۔ **المصنف**۔ ریاض، سعودی عرب: مکتبۃ الرشد، ۱۴۰۹ھ۔

۴۸۔ صالحی، ابوعبداللہ محمد بن یوسف صالحی دمشقی شافعی (م۹۴۲ھ)۔ **عقود الجمان فی مناقب الإمام الأعظم أبي حنيفة النعمان**۔ کراچی، پاکستان: مکتبۃ الشیخ۔

۴۹۔ طبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر اللخمی (۲۶۰-۳۶۰ھ/ ۸۷۳-۹۷۱ء)۔ **المعجم الأوسط**۔ ریاض، سعودی عرب: مکتبۃ المعارف، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء۔

۵۰۔ طبرانی، سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر اللخمی (۲۶۰-۳۶۰ھ/۸۷۳-۹۷۱ء)۔ **المعجم الأوسط**. قاہرہ، مصر: دارالحرمین، ۱۴۱۵ھ۔

۵۱۔ طبرانی، ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر اللخمی (۲۶۰-۳۶۰ھ/ ۸۷۳-۹۷۱ء)۔ **المعجم الکبیر**۔ موصل، عراق: مطبعۃ الزہراء الحدیثۃ۔

۵۲۔ طبری، ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید (۲۲۴-۳۱۰ھ/ ۸۳۹-۹۲۳ء)۔ **تاریخ الأمم والملوک**۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۰۷ھ۔

۵۳۔ طبری، ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید (۲۲۴-۳۱۰ھ/ ۸۳۹-۹۲۳ء)۔ **جامع البیان فی تفسیر القرآن**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۰۵ھ۔

۵۴۔ طحاوی، ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ بن عبد الملک بن سلمہ (۲۲۹-۳۲۱ھ/ ۸۵۳-۹۳۳ء)۔ **شرح معاني الآثار**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۳۹۹ھ۔

۵۵۔ طیالسی، ابو داود سلیمان بن داود جارود (۱۳۳-۲۰۴ھ/ ۷۵۱-۸۱۹ء)۔ **المسند**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ۔

۵۶۔ ابن ابی عاصم، ابوبکر بن عمرو بن ضحاک بن مخلد شیبانی (۲۰۶-۲۸۷ھ/۸۲۲-۹۰۰ء)۔

الزهد لابن حنبل۔ قاہرہ، مصر: دارالریان للتراث، ۱۴۰۸ھ۔

۵۷۔ عبد بن حمید، ابو محمد بن نصر الکسی (م ۲۴۹ھ/۸۶۳ء)۔ **المسند**۔ قاہرہ، مصر: مکتبۃ السنہ، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء۔

۵۸۔ ابو عبید، قاسم بن سلام (م۲۲۴ھ)۔ **کتاب الأموال**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۰۸ھ۔

۵۹۔ ابن عساکر، ابو قاسم علی بن حسن بن ہبۃ اللہ بن عبد اللہ بن حسین دمشقی (۴۹۹-۵۷۱ھ/۱۱۰۵-۱۱۷۶ء)۔ **تاریخ مدینة دمشق**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۹۹۵ء۔

۶۰۔ علی الہجویری، ابو الحسن علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی الغزنوی (۴۰۰-۴۶۵ھ)۔ **کشف المحجوب**۔ اسکندریہ، مصر: مکتبۃ الاسکندریہ، ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء۔

۶۱۔ ابو عوانہ، یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم بن زید نیشاپوری (۲۳۰-۳۱۶ھ/۸۴۵-۹۲۸ء)۔ **المسند**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۹۹۸ء۔

۶۲۔ عینی، بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد بن موسیٰ بن احمد بن حسین بن یوسف بن محمود (۷۶۲-۸۵۵ھ/۱۳۶۱-۱۴۵۱ء)۔ **عمدة القاري شرح على صحيح البخاري**۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء۔

۶۳۔ غزالی، حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد الغزالی (م ۵۰۵ھ)۔ **إحياء علوم الدين**۔ مصر: مطبعہ عثمانیہ، ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء۔

۶۴۔ فاروقی، شاہ ابو الحسن زید۔ مقاماتِ خیر۔ دہلی، انڈیا: شاہ ابو الخیر اکاڈمی، ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء

۶۵۔ ابن قیم، ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر ایوب الزرعی (۶۹۱-۷۵۱ھ)۔ **زاد المعاد في هدي خير العباد**۔ کویت: مکتبۃ المنار الاسلامیہ، ۱۹۸۶ء۔

۶۶۔ ابن کثیر، ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر بن زرع بصروی

(۷۰۱-۷۷۴ھ/۱۳۰۱-۱۳۷۳ء)۔ البداية والنهاية۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء۔

۶۷۔ کلاعی، ابو الربیع سلیمان بن موسیٰ الکلاعی الأندلسی (۵۶۵-۶۳۴ھ)۔ الاكتفاء في مغازي رسول الله ﷺ والثلاثة الخلفاء۔ بیروت، لبنان، مکتبۃ الھلال، ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۸ء۔

۶۸۔ گوکانی، نور الدین محمد جہانگیر۔ جهانگیرنام/توزک جهانگیری۔ تہران، ایران: انتشارات بنیاد فرہنگ، ۱۳۵۹ھ۔

۶۹۔ ابو اللیث سمرقندی، نصر بن محمد بن احمد بن ابراہیم (م۳۷۵ھ)۔ بحر العلوم۔ بیروت، لبنان: دار الفکر۔

۷۰۔ ابن ماجہ، ابو عبد اللہ محمد بن یزید قزوینی (۲۰۹-۲۷۳ھ/۸۲۴-۸۸۷ء)۔ السنن۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی، ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء۔

۷۱۔ مالک، ابن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو بن حارث أصبحی (۹۳-۱۷۹ھ/ ۷۱۲-۷۹۵ء)۔ الموطأ۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی، ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۵ء۔

۷۲۔ ابن مبارک، ابو عبد الرحمٰن عبد اللہ بن واضح مروزی (۱۱۸-۱۸۱ھ/ ۷۳۶-۷۹۸ء)۔ كتاب الزهد ويليه كتاب الرقائق۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ۔

۷۳۔ محبّ طبری، ابو جعفر احمد بن عبد اللہ بن محمد بن ابی بکر بن محمد بن ابراہیم (۶۱۵-۶۹۴ھ/ ۱۲۱۸-۱۲۹۵ء)۔ الرياض النضرة في مناقب العشرة۔ بیروت، لبنان: دار الغرب الاسلامی، ۱۹۹۶ء۔

۷۴۔ محمد صادق، القادری الشہابی السعدی۔ تفريح الخاطر فى مناقب تاج الأولياء وبرهان الأصفياء الشيخ عبد القادر الكيلاني۔ قاہرہ، مصر: مکتبۃ المصطفی البابی الحلبی، ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء۔

۷۵۔ مروزی، محمد بن نصر بن الحجاج، ابو عبداللہ (۲۰۲-۲۹۴ھ)۔ **تعظیم قدر الصلاۃ۔** مدینہ منورہ، سعودی عرب: مکتبہ الدار، ۱۴۰۶ھ۔

۷۶۔ مسلم، ابو الحسین ابن الحجاج بن مسلم بن ورد قشیری نیشاپوری (۲۰۶-۲۶۱ھ/ ۸۲۱-۸۷۵ء)۔ **الصحیح۔** بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔

۷۷۔ نسائی، ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار (۲۱۵-۳۰۳ھ/ ۸۳۰-۹۱۵ء)۔ **السنن الکبری۔** بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء۔

۷۸۔ نسائی، احمد بن شعیب، ابو عبدالرحمٰن (۲۱۵-۳۰۳ھ/ ۸۳۰-۹۱۵ء)۔ **السنن۔** بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵ء۔

۷۹۔ ابو نعیم، احمد بن عبداللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن مہران اصبہانی (۳۳۶-۴۳۰ھ/ ۹۴۸-۱۰۳۸ء)۔ **حلیۃ الأولیاء وطبقات الأصفیاء۔** بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء۔

۸۰۔ ابو نعیم، احمد بن عبداللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن مہران اصبہانی (۳۳۶-۴۳۰ھ/ ۹۴۸-۱۰۳۸ء)۔ **حلیۃ الأولیاء وطبقات الأصفیاء۔** بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء۔

۸۱۔ ابو نعیم، احمد بن عبداللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن مہران اصبہانی (۳۳۶-۴۳۰ھ/ ۹۴۸-۱۰۳۸ء)۔ **دلائل النبوۃ۔** حیدر آباد، بھارت: مجلس دائرہ معارف عثمانیہ، ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۵۰ء۔

۸۲۔ ہاشم کشمی، خواجہ محمد۔ **زبدۃ المقامات** (ترجمہ اردو= ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر صغیر الدین)۔ سیالکوٹ، پاکستان: مکتبہ نعمانیہ

۸۳۔ ابن ہشام، ابو محمد عبد الملک حمیری (۲۱۳ھ/ ۸۲۸ء)۔ **السیرۃ النبویۃ۔** بیروت، لبنان: دار الجیل، ۱۴۱۱ھ۔

۸۴۔ ابن ابو یعلی حنبلی، محمد بن حسین بن محمد بن خلف بن احمد بن الفراء (م۴۵۸ھ/ ۱۰٦٦ء)۔ **طبقات الحنابلة**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ۔

۸۵۔ ابو یعلی، احمد بن علی بن مثنی بن یحییٰ بن عیسیٰ بن ہلال موصلی تمیمی (۲۱۰-۳۰۷ھ/ ۸۲۵-۹۱۹ء)۔ **المسند**۔ دمشق، شام: دار المأمون للتراث، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء۔